زیرِ ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم - اے -

جلد ۴ - نمبر ۱ | بابت ماہ جولائی سنہ ۴۵ء | سالانہ چندہ صہ - فی پرچہ ۸

فہرست مضامین

پبلشر محمد حبیب صاحب بی اے (آنرز) محبوب المطابع برقی پریس دہلی

جنگ کے بعد قیمتوں اور شرح مبادلہ کو کس سطح پر قائم کیا جائے؟

ہندوستان میں قیمتوں کی عام سطح، جنگ سے پہلے کے مقابلے میں، بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اگر ۱۹۳۹ء کی قیمتوں کے اوسط کو سو مانا جائے تو اس کے مقابلے میں انجمن اقوام کے اعداد کے مطابق، ۱۹۴۳ء میں قیمتیں ۳۱۱ ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد سے اعداد اشاریہ برابر کمی کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اگست ۱۹۴۳ء میں عدد اشاریہ ۳۰۲ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد غالباً اور زیادہ کمی ہوئی ہے اور اب اسے تقریباً تین سو سمجھنا چاہیے۔ لیکن اب بھی اکثر دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہماری قیمتیں بہت زیادہ بڑھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ امریکہ کے مقابلے میں ہمارا عدد اشاریہ ۱۶۰ کے بقدر زیادہ ہے اور انگلستان کے مقابلے میں ۱۳۰ کے بقدر۔ کیونکہ امریکہ کا عدد اشاریہ ۱۹۴۳ء کے لئے ۱۴۰ تھا اور انگلستان کا ۱۷۰۔

قیمتوں کی اتنی بڑی تبدیلی نے جماعت کے اندر سخت ابتری پیدا کر دی ہے اور اس کی وجہ سے دولت کی تقسیم کی نوعیت بہت بدل گئی ہے۔ کچھ لوگوں نے خوب روپیہ کمایا ہے اور کچھ نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے ہیں۔ پچھلے دو سالوں میں تاجروں اور ٹھیکیداروں نے خوب منافع کمایا ہے۔ مزدوروں کو بھی زیادہ اُجرتیں ملی ہیں اور ان کی مانگ بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ کاشتکار کو بھی اپنی پیداوار کی قیمت زیادہ ملی ہے لیکن دوسری طرف ہزاروں آدمی فاقے سے مر رہے ہیں۔ اور اس سے زیادہ تعداد فاقہ کی سرحد تک پہنچ گئی ہے۔ مختلف طبقوں کی حالت پہلے کے مقابلے میں کتنی بہتر یا خراب ہو گئی ہے اس سوال کے جواب کی تفصیلات میں گئے بغیر یہ بات بالکل صاف ہے کہ ۱۹۴۳ء کے بعد سے جب کہ قیمتیں اپنی انتہائی حدِ عروج تک پہنچ گئی تھیں دولت

کی تقسیم کی نوعیت بہت تبدیل ہو گئی ہے

بہر حال اب سوال یہ ہے کہ جنگ کے بعد کے سالوں میں ہندوستان میں قیمتوں کو کس سطح پر قائم کیا جائے؟ کیا موجودہ ۴۰۰ کی سطح پر قائم کر دیا جائے یا انھیں خاصکم کیا جائے یا انھیں جنگ سے قبل جیسا کر دیا جائے۔

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے زمانے میں قیمتوں کے بڑھنے کے جو اسباب ہیں ان کا تجزیہ کر لیا جائے۔

قیمتوں کے بڑھنے کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ متحدہ اقوام کی افواج کو رسد فراہم کرنے کا کام خصوصاً جاپان کے جنگ میں شامل ہونے کے بعد سے بہت کچھ ہندوستان ہی کو کرنا پڑا۔ یہاں سے اشیاء اور خدمات کی بڑی مقدار خریدی جاتی رہی اور اس کے دام روپے کی صورت میں ادا کئے جاتے رہے۔ ملک معظم کی حکومت نے سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء تا سنہ ۴۶-۱۹۴۵ء میں تقریباً تیرہ ارب ۵۰ کروڑ روپیہ ہندوستان میں خرچ کیا اور اس خرچ کے لئے جتنے روپے کی ضرورت تھی وہ اس نے رزرو بنک کے ہاتھ اپنے اسٹرلنگ تمسکات فروخت کر کے نوٹوں کی صورت میں حاصل کیا۔ اور اس سے یہاں کے لوگوں کو اُن کے مال اور خدمتوں کی قیمت ادا کی۔ پھر اس کے علاوہ جنگ کے زمانے میں خود حکومت ہند کا خرچ بھی مدافعت اور دوسرے کاموں کے سلسلے میں بہت بڑھ گیا اس خرچ کو کچھ تو زائد ٹیکس لگا کر پورا کیا گیا اور کچھ روپے قرض لے کر۔ حکومت ہند نے جو زائد خرچ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء تا سنہ ۴۶-۱۹۴۵ء میں جنگ کے غیر معمولی حالات کی وجہ سے کیا، وہ آٹھ ارب ۹۹ کروڑ روپیہ ہوتا ہے۔ گویا ان سالوں میں ہمارے ملک میں ۲۲ ارب ۴۹ کروڑ روپے کے خرچ کا اضافہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس کا بہت زیادہ اثر ہماری قیمتوں پر پڑا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں روپیہ کے اس خرچ کے اضافہ کے ساتھ

چیزوں کی تیاری میں اضافہ نہیں ہو سکا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مال کی تیاری میں کچھ اضافہ ضرور ہوا۔ لیکن یہ اضافہ غیر استعمالی چیزوں میں ہوا جس سے صارف کو کوئی سہارا نہیں ملا اور اس سے قیمتوں کے اس اضافہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی جو ترقی یافتہ آمدنیوں کی زائد طلب کی وجہ سے رونما ہو رہا تھا۔ پھر جو استعمالی چیزیں ملک میں تیار کی جارہی تھیں وہ بھی شہری آبادی کا حق چھین کر دفاعی کاموں میں استعمال کی جانے لگیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو زائد آمدنیاں لوگوں کو مل رہی تھیں جب ان سے بازار میں مال خریدنے کی کوشش کی جاتی تھی تو خریداروں کے باہمی مقابلے کی وجہ سے ان کی قیمتیں بڑھ جاتی تھیں۔ اور پہلے کے مقابلے میں کم اشیاء لوگوں کو میسر آسکتی تھیں۔ اس کے علاوہ جنگ سے پہلے ہندوستان میں خاصی بڑی تعداد میں مصنوعہ چیزوں کو دوسرے ملکوں سے منگایا جاتا تھا۔ لیکن جنگ کے زمانے میں درآمد بہت کم ہوگئی بلکہ اس کی جگہ خود ہندوستان سے مصنوعہ چیزیں باہر جانے لگیں جس سے استعمالی چیزوں کا ذخیرہ شہری آبادی کے لئے اور بھی کم ہوگیا۔ ان تمام اسباب کی وجہ سے زندگی کے تمام مصارف بڑھ گئے۔ لوگوں نے مہنگائی کے بھتہ کے لئے کوشش کی۔ یہ مطالبہ منظور کیا گیا۔ لیکن یہ زائد آمدنی زندگی کے مصارف کو اور زیادہ بڑھانے کا موجب بن گئی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ نقل وحمل کی دشواریوں نے بھی قیمتوں کے اضافہ کی رفتار کو تیز کیا۔ کیونکہ مال کے نہ پہنچنے کی وجہ سے مقامی قلت رسد اور اعتبار میں کمی رونما ہوتی رہی جن کی وجہ سے مقامی قیمتیں چڑھ جاتی تھیں اور پھر ناگزیر طور پر سارے ملک کی قیمتوں کی سطح بلند ہو جاتی تھی۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک کے لئے ریل، سڑک اور ساحل کے نقل وحمل کو معاشی نظام کا خون زندگی سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن چونکہ ملک کے اندر ریل گاڑیوں موٹروں اور ساحلی جہازوں میں اضافہ کرنا ممکن نہیں تھا اور نہ ہی معدنی تیل کی رسد فراہم ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف فوج کے سامان اور فوجی آدمیوں کی منتقلی بہت بڑھ گئی تھی۔

اس لئے لازمی طور پر مقامی قلت رسد اور قیمتوں کی سطح میں طبیعی رونما ہوئی۔

زر کے اصول کا مطالعہ کرنے والوں نے اب اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ قیمتوں کے تغیرات میں اعتبار و اعتماد کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایسے بہت سے ناموافق حالات جمع ہو گئے تھے۔ مثلاً جاپان کا جنگ میں شامل ہونا۔ ملک کو حملے کا خطرہ لاحق ہونا۔ جنگ کے شروع زمانے میں اتحادیوں کی ناکامیاں۔ مقامی طور پر اشیاء کی قلت۔ حکومت کے بڑھتے ہوئے مصارف کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ کی توقع وغیرہ۔ جنھوں نے لوگوں کے اعتماد کو زائل کر دیا تھا اور تاجر اور خریدار دونوں بڑے پیمانے پر چیزوں کا ذخیرہ کرنا چاہتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چور بازار وجود میں آگئے اور ان سب نے قیمتوں کے اضافہ کی رفتار کو بہت تیز کر دیا۔

آخری وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں معاشی کنٹرول اور افراطِ زر کی روک تھام کے لئے وہ طریقے اختیار نہیں کئے گئے جو دوسرے شریک جنگ ملکوں میں کئے گئے تھے ایسا کیوں نہیں کیا گیا، اس بحث میں پڑنا فضول ہے۔ اس کا کچھ سبب تو بلاشبہ یہ تھا کہ اس ملک میں جاپان کے جنگ میں شریک ہونے تک قیمتوں میں تیزی کے ساتھ اور بڑے پیمانے پر بڑھنے کا رجحان شروع نہیں ہوا تھا اور اس کا کچھ سبب یقیناً یہ بھی تھا کہ ملک کا رقبہ بہت وسیع ہے۔ کھیتی کا انتظام چھوٹے پیمانے پر اور ذاتی گذارے کے لئے کیا جاتا ہے اور کچھ یہ تھا کہ حکومت اور رعایا میں اشتراک عمل کی کمی پائی جاتی تھی۔ بہرحال تازہ ترین تجربات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ رکاوٹیں ایسی نہیں تھیں جن پر قابو نہ پایا جا سکتا ہو۔ اس لئے کچھ الزام تو حکومت پر عائد کرنا ہی ہوگا کہ اس نے افراطِ زر کے خلاف معاشی کنٹرول کی وہ پالیسی اختیار نہیں کی جو اس نے بعد میں مئی ۱۹۴۳ء میں اختیار کی اور جس کے نتیجے کے طور پر بعد میں ہندوستانی قیمتوں میں اضافہ کا رجحان رک گیا ہے۔

غرض اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں قیمتیں دوسرے ملکوں کے مقابلے

میں بہت زیادہ ہیں اور یہ بات محض صنعتی اشیا پر ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اناج کے لئے بھی صادق آتی ہے۔

موجودہ صورتِ حال کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) ہندوستان کی سطح قیمت سنہ ۱۹۳۹ء کے مقابلے میں دوسو فی صد زیادہ ہے۔

(۲) زندگی کے مصارف میں اضافہ کا تخمینہ ۲۲۹ فی صد تک کیا گیا ہے۔

(۳) ہندوستان کے رزروبنک میں شعبہ اجرائے نوٹ کے ذخیرے محفوظ ہیں۔ ۵ ارب ۲۵ کروڑ روپیہ کے اسٹرلنگ تمسکات موجود ہیں۔ اور شعبہ ساہوکارہ کے ذخیرے محفوظ ہیں، ۳ ارب ۳ کروڑ کے گویا جنگ سے قبل کے مقابلے میں بصورت مجموعی دس ارب ۴۵ کروڑ روپے کے زاید اسٹرلنگ تمسکات ہندوستان کے رزروبنک میں موجود ہیں۔

قیمتوں کے اضافہ کے اسباب کا تجزیہ کرنے کے بعد اب ہم اس سوال پر غور کریں گے جسے ہم نے مضمون کے شروع میں اُٹھایا تھا یعنی کیا قیمتوں کو ان کی موجودہ سطح پر قائم کردیا جائے یا انھیں تیزی کے ساتھ گراکر کم کردیا جائے۔

قیمتوں کو موجودہ سطح پر قائم کرنے کا جہاں تک تعلق ہے اس کی حمایت کرنا سخت غلطی اور ناانصافی ہوگی۔ اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔ اول وجہ یہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں ہندوستان کی قیمتوں میں جو اضافہ ہوا ہے وہ غیر معمولی اسباب کا نتیجہ ہے۔ اناج کی قیمت، جنگ سے قبل کے مقابلے میں آج تین گنا زیادہ ہے اور سنہ ۱۹۲۵ء تا سنہ ۱۹۲۹ء کے مقابلے میں بھی جو کسانوں کے لئے بہت اچھے سال تھے یہ قیمت بہت زیادہ ہے۔ زرعی مفاد کے نہایت سرگرم حامیوں کی طرف سے اس کی تائید میں صرف ایک دلیل پیش کی جاتی ہے کہ زراعت کی لاگتوں میں اور ان چیزوں کی قیمت میں جنھیں کسان بازار سے خریدتا ہے چونکہ بہت اضافہ ہوگیا ہے اس لئے زراعتی پیداوار کی قیمت بھی زیادہ رہنا چاہیے۔

لیکن جنگ کے ختم ہونے اور تجارت کے معمولی حالات میں واپس آجانے کے بعد استعمالی چیزوں کی قیمت لازمی طور پر کم ہو جائے گی اور ایک حد تک زراعت کی لاگتیں بھی ضرور کم ہو جائیں گی اس لئے اس دلیل کی اہمیت زائل ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ قیمتوں کو موجودہ سطح پر قائم رکھنے کی وجہ سے اصلاح و مرمت کے مصارف کس قدر بڑھ جائیں گے اور معاشی ترقی کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا مالی اعتبار سے کس درجہ مشکل ہو جائے گی تو اس کی خرابی پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔ پھر قیمتوں میں موجودہ اضافہ چونکہ زیادہ تر افراطِ زر کی وجہ سے رونما ہوا ہے اس لئے آبادی کے مختلف طبقوں کی آمدنیوں اور مصارف میں مطابقت پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ بعض طبقوں نے غیر معمولی فائدے حاصل کئے ہیں اور دوسرے طبقوں نے خصوصاً جن کی آمدنی مقررہ ہے غیر معمولی نقصانات اور تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ افراطِ زر کی وجہ سے قومی آمدنی کا جس طرح از سر نو تقسیم ہوئی ہے اسے ہرگز انصاف پر مبنی نہیں سمجھا جا سکتا اور اسے ارادتاً دائمی بنانا اور بھی ناانصافی ہوگی۔ آخر میں اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے جنگ کے زمانے میں قیمتوں کا جو اضافہ ہوا ہے اور جس کے اسباب تفصیل کے ساتھ اوپر بیان کئے گئے ہیں وہ اس وقت بھی قائم رہے گا۔ جب جنگ کے ختم ہونے بعد یہ اسباب غایب ہو جائیں گے۔ خصوصاً جب متحدہ اقوام کے وہ فوجی مصارف جو وہ اس وقت ہندوستان میں کر رہی ہیں ختم ہو جائیں گے اور باہر کا مال آزادی سے ہندوستان میں آسکے گا، اور اعتبار و اعتماد کو عام طور پر ترقی ہو جائے گی تو اس وقت خود قیمتوں کی سطح کم ہو جائے گی۔ اگر ہم ان سب متوقع اسباب کو نظر انداز کر کے موجودہ حالات کو دائمی سمجھ لیں گے تو ہم بڑی سخت غلطی کا ارتکاب کریں گے۔ دوسرے ملکوں میں جہاں قیمتوں میں جنگ کے زمانے میں ہندوستان کے مقابلے میں کم اضافہ ہوا ہے۔ چاہے قیمتوں کا رجحان بڑھنے یا قائم رہنے کی طرف ہو لیکن ہندوستان میں

مزید زوال کی طرف مائل ہوگا۔ اس لئے ہمیں اپنی قیمتوں کو دائمی طور پر موجودہ سطح پر قائم رکھنے کی ہرگز کوئی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔

اس کے بعد اب دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا انھیں تیزی کے ساتھ گرنے دیا جائے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی قیمتوں میں بہت فرق پایا جاتا ہے لیکن اگر اس فرق کو دور کرنے کے لئے ہندوستان کی قیمتوں کو تیزی سے گرنے دیا گیا تو جنگ کے زمانے میں جو صنعتیں شروع کی گئی ہیں اُن کا دیوالہ نکل جائے گا اور ملک میں بے روزگاری اور مزدوروں کے جھگڑے اور کساد بازاری شروع ہو جائے گی اور اس کا نقصان صرف صنعت تک ہی محدود نہیں رہے گا بلکہ زراعت بھی متاثر ہوگی اور بالواسطہ در واسطہ ملک کی ساری آبادی پریشانی میں مبتلا ہو جائے گی۔

اس لئے بہترین مشورہ یہ ہے کہ کوئی کام جلد بازی اور قطعی فیصلے کے ساتھ نہ کیا جائے بلکہ ملکی اور غیر ملکی حالات کا صبر اور سکون کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور انھیں از خود مستحکم بنیاد پر قائم ہونے کا موقع دیا جائے۔ اور جب وہ طلب و رسد کی قوتوں کے ماتحت کسی دیرپا سطح پر قائم ہو جائیں تب قیمتوں کے استحکام کی پالیسی کو شروع کیا جائے۔

اس سلسلے میں ہندوستان کی شرح مبادلہ کا معاملہ بھی توجہ طلب ہے۔ جنگ کے زمانے میں ہماری شرح مبادلہ کو برابر ایک شلنگ چھ پنس پر قائم رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے ہماری داخلی قیمتوں سے اس کا کوئی تعلق قائم نہیں رہ سکا ہے۔ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہماری بڑھی ہوئی قیمتوں اور ہمارے زر کی قوت خرید کی کمی کا یہ تقاضا تھا کہ ہماری شرح مبادلہ کو ایک شلنگ چھ پنس سے گھٹا کر بہت کم کر دیا جاتا۔ دوسری طرف ہندوستان کے زرِ ذخیرہ میں اسٹرلنگ تمسکات کا جو ذخیرہ تیزی کے ساتھ اکٹھا ہوتا جا رہا ہے اس نے بین الاقوامی منڈی میں ہمارے زر کی حیثیت کو بہت مضبوط بنا دیا

۴۔ اسٹرلنگ تمسکات کا۔ یہ ذخیرہ اب اتنا ہوگیا ہے کہ گزشتہ پچاس سال میں ہمارا توازن تجارت جس قدر ناموافق رہا ہی اس سے بھی کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ بات ایسی ہی جو ہماری شرح مبادلہ کو ایک شلنگ چھ پنس سے کہیں زیادہ بلند سطح پر قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس وقت اپنی شرح مبادلہ کو نہ بڑھانا مناسب ہوگا نہ کم کرنا۔ کم کرنا تو اس لئے مناسب نہ ہوگا کہ ہماری داخلی قیمتوں کا عروج دائمی معلوم نہیں ہوتا۔ دوسرے ہمارے پاس اسٹرلنگ تمسکات کا بڑا زبردست ذخیرہ موجود ہے جس کی قوت خرید کو خود کم کرنا حماقت ہوگی۔ شرح مبادلہ کو بڑھانا اس لئے مناسب نہیں ہے کہ ہمیں ابھی تک اس بات کا ٹھیک اندازہ نہیں ہے کہ جنگ کے بعد تعمیر نو اور منصوبہ بندی کے سلسلے میں ہمیں کس قدر مال باہر سے منگانا ہی۔ دوسرے ملکوں میں قیمتوں کے اضافہ کی مقدار کیا ہوگی اور ہمارے اسٹرلنگ تمسکات ہمیں کس طرح اور کتنی مدت کے دوران میں ادا کئے جائیں گے۔ اسی لئے جب تک ان تمام عوامل کا جو اس سلسلے میں اثر انداز ہوسکتے ہیں پوری طرح پتہ نہ چل جائے۔ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ شرح مبادلہ کو نہ بدلا جائے۔ جب حالات دوسرے ملکوں اور خود اپنے ملک میں یک گونہ معمولی حالت پر آجائیں گے، تب اس کے بارے میں بھی آخری فیصلہ کرنا مناسب ہوگا۔

ہندوستان کی موجودہ تعلیمی حالت اور سارجنٹ اسکیم

سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری رپورٹ میں دکھلایا گیا تھا کہ ہندوستان کی ۳۹ کروڑ آبادی میں سے صرف پونے پانچ کروڑ ایک سادہ اور آسان خط لکھ پڑھ سکتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں یہ تعداد اس سے بھی کم یعنی صرف سوا دو کروڑ تھی۔ گویا دس سال کے عرصے میں خواندہ لوگوں میں سو فی صدی سے زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود خواندہ لوگوں کی موجودہ تعداد کے معنی یہ تھے کہ پانچ سال سے اونچی عمر کے لوگوں میں صرف ساڑھے چودہ فی صدی خواندہ تھے۔

جب ان اعداد کو عورتوں اور مردوں پر تقسیم کرکے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ پانچ سال سے زیادہ عمر کے مردوں میں تعلیم کا اوسط ۲۲ ½ فی صدی اور عورتوں میں ۸ء۵ فی صدی تھا۔

عورتوں اور مردوں کی خواندگی میں فرق کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ ابتدائی مدرسوں کے لئے پڑھانے والی عورتیں کافی تعداد میں نہ ملتی تھیں۔ دوسرے معاشرتی اور معاشی اسباب کی بنا پر بھی عورتوں کی تعلیمی ترقی سست تھی۔ لیکن ان سے بڑھ کر رکاوٹیں یہ تھیں کہ ایک تو آبادی کی اکثریت (یعنی ۸۰ فی صدی سے زیادہ) ایسے گاؤں میں رہتی تھی جن کی آبادی پانچ سو یا اس سے کم تھی۔ اس کے علاوہ کسانوں کا افلاس اور سرکاری آمدنی کی قلت بھی ترقی کی راہ میں حائل تھیں۔ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود گذشتہ دس سالوں میں جو ترقی ہوئی وہ بہت حوصلہ افزا ہے لیکن اگر آئندہ کے لئے ہندوستان کی تمام بالغ آبادی کو خواندہ بنانا ہے تو لازمًا اس رفتار کو بہت زیادہ تیز کرنا پڑے گا۔

ہندوستان کے وسیع نظام تعلیم میں حسب ذیل درسگاہیں شامل ہیں۔ پندرہ

یونیورسٹیاں اپنے ۳۲۵ آرٹ اور سائنس کے کالجوں کے ساتھ۔ ۵۰۴ پیشہ ورانہ کالج، ۲ لاکھ ۳۴ ہزار ۳۷۶ فوقانیہ، وسطانیہ اور تحتانیہ اور ہر قسم کے مخصوص مدرسے ۱۹۴۲ء میں ان ۲ لاکھ ۳۲ ہزار ۸۹ مجموعی تعلیمی اداروں میں ایک کروڑ، ۵ لاکھ ۶۹ ہزار ۹۰۸ طلبہ (لڑکے اور لڑکیاں) تعلیم پارہے تھے۔

یہ نظام تعلیم بہت زیادہ عظیم الشان ہے۔ لیکن ملک کی ضرورتیں اس سے بھی زیادہ بڑی ہیں۔ ہندوستان میں ۷ لاکھ ۰۰ ۵ ہزار سے زیادہ گاؤں پائے جاتے ہیں اور آبادی میں اضافہ ۵۰ لاکھ سالانہ کی رفتار سے ہو رہا ہے۔ ان حالات میں لازمی تعلیم کے جاری کرنے کا اختیار مجبوراً مقامی اداروں یعنی میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو جو سب منتخب کی ہوئی جماعتیں ہیں سپرد کرنا پڑا ہے۔ یہی اپنی موجودہ مالی حالت اور سہولتوں کو دیکھنے کے بعد اس کا فیصلہ کرتی ہیں کہ لازمی تعلیم مناسب رہے گی یا نہیں۔ ۱۹۴۱ء میں چھ اور گیارہ سال کی درمیانی عمر کے بچوں کے لئے ۱۹۴ شہروں اور ۱۴ ہزار ۱۰۵ گاؤں میں جبریہ تعلیم رائج کی گئی تھی۔ ان علاقوں میں بھی جبریہ تعلیم صرف لڑکوں کے لئے رکھی گئی تھی۔ اگرچہ ملک کے بعض حصوں مثلاً احاطہ مدراس میں یہ اصول لڑکیوں پر بھی عائد کیا گیا تھا۔

۱۹۲۱ء سے یعنی جب سے ۱۹۱۹ء کے دستوری قانون کا نفاذ ہوا تعلیم پورے طور پر صوبائی حکومتوں کی نگرانی میں دے دی گئی ہے۔ برطانوی ہندوستان میں مرکزی اور صوبائی اختیارات کو صراحت کے ساتھ تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۳۷ء سے منتخب شدہ ہندوستانی وزرا، جو صوبائی مقننہ کو جواب دہ ہوتے ہیں تعلیم کی دیہاتی مدرسوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک نگرانی کر رہے ہیں۔ مرکزی حکومت کو تعلیم پر کوئی اختیار نہیں رہا ہے۔ وائسرائے کی عاملہ کے وزیر تعلیم کو صرف بعض چھوٹے وفاقی علاقوں (مثلاً دہلی کے دارالسلطنت) کی تعلیم پر جو مرکزی حکومت کی راست نگرانی میں ہے، اختیار حاصل ہے اس کے علاوہ باقی تمام ہندوستان کی تعلیم کے بارے میں وزیر تعلیم اور اس کے ماہران تعلیم

کا کام صرف مشورہ دینا ہے ۔ ایک مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ کے ذریعے صوبوں نیز ریاستوں کے وزرائے تعلیم کے کام میں مشورہ دیا جاتا ہے اور اس میں یک جہتی پیدا کی جاتی ہے ۔
ہر صوبے میں عوام کی منتخب کردہ کابینہ کا ایک رکن وزیر تعلیم ہوتا ہے اور تعلیمی انتظامات کے صدر مستقل کو جس کا کام وزیر تعلیم کو مشورہ دینا ہوتا ہے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ ہندوستان کی ۹۰ فی صدی تعلیم گاہوں کی صوبائی حکومت نگرانی کرتی ہے ۔ جو تعلیم گاہیں حکومت سے اپنی اسناد تسلیم کرانا یا مالی امداد لینا چاہتی ہیں ، انھیں حکومت کی نگرانی کو قبول کرنا پڑتا ہے اور ان کا سرکاری انسپکٹر وقتاً فوقتاً معائنہ کرتے رہتے ہیں ۔ اعلیٰ تعلیم کے معاملے میں ذمہ داری کچھ تو صوبائی حکومتوں کی ہوتی ہے اور کچھ خود یونیورسٹیوں کے حوالے کردی جاتی ہے ۔ ادنیٰ تعلیم کے معاملے میں صوبائی حکومتیں ، میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ساتھ یا تو ذمہ داری میں شرکت کرتی ہیں یا اپنے اختیارات انھیں منتقل کردیتی ہیں ۔

مدرسے کا نظام | تحتانیہ یا ابتدائی مدرسوں میں چھ سے دس سال تک کی عمر کے بچے تعلیم پاتے ہیں اور ان کا عام مقصد "خواندگی" کے معیار تک پہنچنا اور کام چلانے کے لائق حساب سیکھنا ہوتا ہے ۔ لیکن پچھلے کچھ سالوں سے ابتدائی تعلیم کی بنیاد کو وسیع کرنے اور اسے طلبا کے ماحول سے براہ راست متعلق کرنے کی مختلف کوششیں کی جارہی ہیں ۔ ۱۹۳۷ء سے صوبائی حکومتیں اس مسئلے پر توجہ کررہی ہیں ۔ ۱۹۳۸ء میں ایک رپورٹ شائع ہوئی جس نے ایک زیادہ عملی اور دلچسپ نصاب کو رائج کرنے کی سفارش کی ۔ یہ بنیادی تعلیم کی اسکیم تھی جس میں کئی ان خیالات کو قبول کیا گیا تھا جنھیں مہاتما گاندھی نے پیش کیا تھا ۔ بنیادی تعلیم کی اس اسکیم پر جنگ کے باوجود دیسی ریاستوں کے علاوہ برطانوی ہند کے چار بڑے صوبوں یعنی بمبئی ، سی پی ، بہار اور یوپی میں تجربہ کیا جارہا ہے ۔
وسطانیہ اسکولوں میں عموماً دس سے ۱۴ سال تک کی عمر کے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے

ان کے دو بڑے نمونے پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ مقامی طور پر ان میں بہت سے اختلافات نظر آتے ہیں۔ اول "ورنا کلر" مڈل اسکول جن میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے لیکن ذریعہ تعلیم نہیں ہے۔ دوسرے "اینگلو ورناکلر" مڈل اسکول جو طالب علم کو پندرہ سال ختم کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلے کے لئے تیار کرتے ہیں، اور جن میں اونچی جماعتوں میں بعض مضامین کی تعلیم کے لئے ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔

مدرسوں کی زیادہ تر تعداد ایسی ہے جس میں باقاعدہ طور پر مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی۔ البتہ جن مدرسوں میں تمام یا اکثر طلباء کا ایک مذہب سے تعلق ہوتا ہے، وہاں کچھ گھنٹے اخلاقی تعلیم کے لئے مخصوص کر دے جاتے ہیں۔ لیکن مذہب کی کوئی جداگانہ تعلیم نہیں دی جاتی۔ دینیات کی تعلیم کے لئے بھی کچھ مدرسے بعض ذاتیں اور فرقے مختلف طریقوں پر چلا رہے ہیں۔ لیکن یہ سرکاری نظام تعلیم سے باہر ہیں۔

تقریباً ۵ لاکھ طلبہ ایسی تعلیم گاہوں میں پڑھ رہے ہیں جنھیں حکومت تسلیم نہیں کرتی۔ یہ عام طور پر وہ مدرسے ہیں جنھیں خاص خاص ذاتوں یا فرقوں نے کھول رکھا ہے اور یہ عموماً مندروں اور مسجدوں سے متعلق ہوتے ہیں۔

ابتدائی اور یونیورسٹی کی درسگاہوں میں مخلوط تعلیم کو قبول کر لیا گیا ہے لیکن ان میں لڑکیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کے علاوہ ایسے مدرسے اور کالج بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن میں صرف لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ان کی میزان سنہ ۱۹۴۰ء میں حسب ذیل تھی:۔

۲۶ ہزار ۲۰۴ ابتدائی مدرسے۔ ایک ہزار ۲۵۷ وسطانیہ مدرسے ۔ ۲۹۷ فوقانیہ مدرسے ۔ ۵۰۰، مخصوص مدرسے ۸ پیشہ ورانہ تعلیم کے اور ۵۴ عام تعلیم کے کالج ۔ کل میزان ۲۸ ہزار ۴۵۵ تھی جس میں ۴۴ لاکھ ۲۲ ہزار طالبات زیر تعلیم تھیں۔

یونیورسٹی کی تعلیم | یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے لڑکوں اور لڑکیوں کے کالجوں کی میزان

۱۰ ہوتی تھی، جس میں آرٹ، اور سائنس اور پیشہ ورانہ تعلیم سب کے کالج شامل تھے۔ ۱۹۵۱ء
میں ان میں ایک لاکھ باون ہزار ۸۶۲ طلبہ پڑھتے تھے۔ اس تعداد میں ۱۲ ہزار ۵۵۰
طالبات بھی شامل تھیں جو یا تو آرٹ یا میڈیسن یا مدرسی یا قانون کی سند کے لئے تیاری
کررہی تھیں۔ ہندوستان کی یونیورسٹیاں۔ اگر ان میں سے بعض ممتاز اقامتی یونیورسٹیوں
کو مستثنےٰ کر دیا جائے، عام طور پر الحاق کرنے والی یونیورسٹیاں ہیں۔ اور ان کو قریب قریب
انگلستان کی لندن یونیورسٹی کے نمونے پر بنایا گیا ہے۔ ان کی اسناد کو، آکسفورڈ،
کیمبرج لندن اور دوسری برطانوی اور یورپین یونیورسٹیاں اپنی اسناد کے برابر تسلیم
کرتی ہیں۔ ان کے امتحانات عام طور پر سخت ہوتے ہیں اور ان کا معیار بھی بلند ہوتا ہے
ہندوستان کی ڈاکٹری اور تحقیقات کی سندوں کو بہت زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا
جاتا ہے۔

استادوں کی حالت | نہایت قدیم زمانے سے ہندوستان میں عالموں کی عزت کا رواج
چلا آرہا ہے اور گرو (استاد) کا درجہ بہت بلند و محترم سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن استاد سے یہ
توقع کی جاتی رہی ہے کہ وہ دلیوں اور مہاتماؤں جیسی سادہ زندگی بسر کرے۔ اس لئے
اُسے معاوضہ بہت کم دیا جاتا ہے۔ یہ روایت اب بھی استادوں خصوصاً ابتدائی مدرسے
کے استادوں کی تنخواہ کی کمی کی صورت میں جاری ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت کم گاؤں
کے استاد ایسے ہیں جو اپنے کام کو ایک ضمنی کام سے زیادہ اہمیت دے سکتے ہیں۔
ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں استادوں کی مجموعی میزان ۵ لاکھ ۱۸ ہزار ۱۸ ہوتی تھی۔ اس
میں سے صرف ۲ لاکھ دس ہزار ۶۹۴ تربیت یافتہ استاد تھے۔ ثانوی مدرسے کے
استادوں کو تربیت دینے کے لئے ۶۴۲ مدرسے تھے۔ جن سے سالانہ صرف ۱۹ ہزار ۳۴۲
استاد تربیت پاکر نکلتے تھے۔ گریجوایٹ استادوں کی تربیت کے لئے ۲۸ ٹریننگ کالج
تھے جن سے سالانہ ایک ہزار ۳۱۴ استاد تربیت پاکر نکلتے تھے۔

تعلیم پر جنگ کے اثرات | خوش قسمتی سے ہندوستان میں جنگ کی وجہ سے تعلیم کا کچھ زیادہ ہرج نہیں ہوا ہے۔ برما کے فتح ہوجانے کے بعد مشرقی ساحل کی کچھ درس گاہوں نے اپنے امتحان کو ملتوی کرنا مناسب سمجھا تھا۔ لیکن اب انھوں نے اپنا کام حسب معمول شروع کر دیا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے کام میں البتہ کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔ کیونکہ اس سے ملحقہ کچھ کالج جاپانی بمباری کے بعد زیادہ محفوظ علاقوں میں منتقل ہو گئے تھے۔

جنگ کے بقیہ تمام اثرات تعلیم کے لئے موافق ثابت ہوئے ہیں جنگی صنعتوں کی طلب نے فنی تعلیم کی بہت حوصلہ افزائی کی ہے۔ سرکار نے اپنی ٹیکنیکل اسکیم کو ۱۹۴۰ء میں بہت مختصر پیمانے پر شروع کیا تھا، لیکن اب اسکیم کے ماتحت چار سو مرکز چل رہے ہیں۔ اور ایک لاکھ فنی ماہر تربیت پا چکے ہیں۔ برطانیہ کے وزیر مزدوران، مسٹر ارنسٹ بیون نے جس اسکیم کو شروع کیا تھا اس کے ماتحت ہندوستان کے ماہر مزدوروں اور امیدواروں کی ٹولیاں معینہ وقفوں کے بعد ہتھیار اور گولہ بارود اور جہاز سازی کے کارخانوں میں تربیت پانے کے لئے جاتی رہتی ہیں۔ سائنس کی تحقیقات کو سر ایم بھٹناگر کی سرکردگی میں کاؤنسل آف انڈسٹریل اینڈ سائنٹفک ریسرچ قائم کر کے بہت ترقی دی گئی ہے۔ یہ کاؤنسل نہ صرف اپنے طور پر تحقیقات کا کام جاری رکھتی ہے بلکہ دوسرے بہت سے مرکزوں کے کام میں بھی یک جہتی پیدا کرتی رہتی ہے۔ اور ہندوستان کے وسائل کو جنگ اور صنعت کے کام میں استعمال کرنے میں اسے بعض نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔

فوج کا تعلیمی اثر | جنگ کے زمانے میں تعلیمی ترقی کو، خود ہندوستانی فوج نے بھی ایک نہایت اہم اور دیرپا امداد پہنچائی ہے۔ ہندوستانی فوج کی تعداد اب بیس لاکھ سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اس فوج میں جس کی بھرتی رضاکارانہ طریقے پر ہوتی ہے زیادہ تر کسانوں کا طبقہ شامل ہے جو بھرتی کے وقت عموماً ناخواندہ ہوتے ہیں۔ فوج میں انھیں باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ انھیں خواندہ بنایا جاتا ہے اور ایک مشترکہ زبان یعنی لاطینی رسم خط

میں لکھی ہوئی اردو سکھائی جاتی ہے (لاطینی خط میں لکھی ہوئی اردو ہندوستانی فوج کا مشترک ذریعہ تعلیم ہے) انھیں معقول بنیادی تعلیم دی جاتی ہے۔ جس کا ابتدائی مقصد اگرچہ سپہ گری کی تعلیم ہوتا ہے لیکن جس میں پھر بھی اس دیہی پس منظر کا خیال رکھنا پڑتا ہے جہاں سے سپاہی بھرتی ہوا ہی اور جہاں جنگ کے بعد اُسے دوبارہ واپس جانا ہوگا۔ بہت سے اہل نظر حضرات کا یہ خیال ہے کہ جنگ کے بعد جب وہ سپاہی جس نے فنی مہارت حاصل کی ہو، جس نے اپنی نگاہ میں وسعت پیدا کی ہو جس نے، ہر قسم کی مشینوں اور حفظان صحت اور صفائی کے اصولوں سے اپنے آپ کو روشناس کیا ہے۔ جس نے جماعتی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی تربیت حاصل کی ہو اور بہت سے مذہبوں اور ذاتوں کے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی عادت ڈالی ہو۔ جب یہ سپاہی جنگ سے لوٹے گا تو ترقی کے کام میں بہت معاون ثابت ہوگا۔

سارجنٹ اسکیم | جنگ کے بعد کی تعلیمی ترقی کے لئے جو منصوبہ ہندوستان میں بنایا گیا ہے وہ اتنا ہمہ گیر اور ایسے بڑے پیمانے پر ہے کہ اس سے پہلے ایسا منصوبہ کبھی نہیں بنایا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں جسے حکومتِ ہند کے مشیر تعلیم مسٹر جان سارجنٹ کے نام پر سارجنٹ اسکیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے چھ اور چودہ سال کے درمیانی عمر کے تمام لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے لازمی ہمہ گیر تعلیم کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس تعلیم کا مقصد محض "خواندگی" کا معیار حاصل کرنا نہیں ہوگا بلکہ طلبہ کو شہری کے فرائض انجام دینے کے لئے کم ترین طریقے پر تیار کرنا ہوگا۔ چھ سال سے کم عمر کے بچوں کے لئے گہوارہ کے مدرسوں کو بھی منصوبہ میں رکھا گیا ہے اور ان سب بچوں کو جن میں اس کی صلاحیت دیکھی جائے گی ثانوی اور فوقانی تعلیم کا بھی موقع دیا جائے گا۔ یونیورسٹی کی تعلیم میں منتخب طلبہ کے لئے خاص زور پوسٹ گریجوایٹ اور ریسرچ کے کام کی سہولتوں پر دیا جائے گا۔ اور کالجوں کی موجودہ گنجائش کو دوگنا کر دیا جائے گا۔ ٹیکنیکل تجارتی اور آرٹ کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے گا۔ بالغوں کی پیشہ ورانہ اور غیر پیشہ ورانہ

تعلیم کا مقصد یہ ہوگا کہ ۲۵ سال کے دوران میں ۴۰ سال سے کم عمر کے تمام لوگوں کو خواندہ بنا دیا جائے۔ اس اسکیم کو چلانے کے لیے ۲۰ لاکھ مزید استادوں کی ضرورت ہوگی، اور ان میں کا ہر استاد معقول طریقے پر تربیت یافتہ ہوگا۔ اسکیم کے خرچ کا اندازہ جب اس پر پوری طرح عمل جاری ہو جائے گا۔ تین ارب بارہ کروڑ روپیہ سالانہ کیا گیا ہے۔ جنگ سے قبل سرکار کی طرف سے تعلیم پر صرف ۱۱½ کروڑ روپیہ سالانہ خرچ کئے جاتے تھے۔

ہندوستان میں اس رپورٹ کو عام طور پر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور اب اس پر حکومت ہند اور صوبے کی حکومتیں غور کر رہی ہیں۔

روس انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

انقلاب روس کی کامیابی کا دنیا کو پہلی بار اس وقت احساس ہوا جب روس نے اپنے پنج سالہ منصوبہ نمبر ا کو وقت سے پہلے مکمل کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب کے ملکوں میں نہایت ہولناک کساد بازاری کا دور دورہ تھا۔ لیکن روس اس عالمگیر وبا سے محفوظ رہا اور اس کی آبادی مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ اپنی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کی تدبیروں میں لگی رہی

اس کے بعد سے روس کی تعریف میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں لیکن ان کے لہجے میں مربیانہ شفقت اور سرپرستی کا انداز پایا جاتا تھا۔ موجودہ جنگ عظیم تک روس کے کارناموں کو سراہا جاتا رہا، لیکن مغرب کے دول عظمے روس کی طاقت کو اپنے سے کم درجے کا سمجھتے رہے جرمنی کے مقابلے میں روس کی ابتدائی پس پائیوں سے لوگوں کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ روس اب نہ پنپ سکے گا اور چین کی طرح اندرونی خانہ جنگیوں اور قحط سالیوں کا شکار ہو جائے گا۔

لیکن اس کے بعد جس حیرت انگیز طریقے پر روس نے اپنے مفتوحہ علاقوں کو واپس لیا اور اپنی جارحانہ پیش قدمیوں کو مسلسل جاری رکھا اس نے روز بروز لوگوں کے دلوں میں روس کا احترام اور اس کے ساتھ عقیدت و احسان مندی کو جاگزیں کرنا شروع کر دیا۔ اب لوگوں نے اس بات کو دل سے مانا کہ انقلاب نے واقعی روس کی زندگی کا نقشہ بدل دیا ہے۔ روس کا نظام مستحکم اور پائدار بنیادوں پر قائم ہو چکا ہے اور روس کے پرگند

اور منتشر ہو جانے کے امکانات مفقود ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ جن کا شمار کل تک ذلیل انقلابیوں اور کم حیثیت مزدوروں اور کسانوں میں کیا جاتا تھا آج دنیا کے ممتاز ترین مدبر، جنرل اور صنعتی رہنما بن گئے ہیں۔ اس اعتراف کے ساتھ ساتھ دول عظمیٰ کے قدامت پسندوں میں روس کی جانب سے خوف و اندیشہ بھی پیدا ہو گیا ہے کیونکہ اب وہ اُسے پرانے نظام کا ایک خطرناک دشمن سمجھنے لگے ہیں۔

ان حالات میں قدرتی طور پر یہ جستجو پیدا ہوتی ہے کہ انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد کی زندگی کے فرق کا اچھی طرح جائزہ لیا جائے اور ان اصلاحوں اور ترقیوں کا پتہ لگایا جائے جنھوں نے روس کے جاہل اور پس ماندہ عوام کو دنیا کی مہذب ترین قوموں کا مدمقابل بنا دیا ہے اور ان کے ملک کو دنیا کے عظیم ترین دول میں شامل کر دیا ہے۔

اس مختصر مضمون میں اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اصلاحِ معاشرت کی چند مخصوص تحریکوں کو منتخب کر کے ان کے بارے میں کچھ سرسری معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن اس کام کو شروع کرنے سے پہلے تبدیلی کا ایک عام خاکہ پیش کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔

روس کے عوام انقلاب سے پہلے جاہل تھے، اوہام پرست تھے۔ غیر معمولی طور پر بیماریوں میں مبتلا تھے اور بعض علاقوں میں واقعی وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کے حکمران ایک غیر ملکی نسل سے تعلق رکھتے تھے لیکن زوال و انحطاط کا شکار ہو چکے تھے اور بداخلاقیوں میں مبتلا تھے۔ اس ملک کا سیاسی دستور نکما اور دقیانوسی ہو چکا تھا۔ انقلاب کے بعد جب سنہ ۱۹۱۷ء میں اس ملک کی رہنمائی لینن نے اپنے ہاتھ میں لی تو اس وقت کی حالت کا نقشہ ایک نہایت واقف کار شخص ڈاکٹر ایس جوزف ڈیلن نے اپنی کتاب "دی اکلپس آف رشیا" (روسی چاند گہن میں آگیا) میں کھینچی ہے۔ مصنف مذکور کی ساری پونجی انقلاب میں برباد ہو گئی تھی اور وہ بالشوزم کو اس زمانے میں حقارت

کی نگاہ سے دیکھتا تھا اس لئے اس پر جانب داری کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ زار کے زمانے کے روس میں نسلوں اور مذہبوں کے جو بے شمار اختلافات پائے جاتے تھے ان کو دکھلانے کے بعد وہ لکھتا ہے :-

"جب روس کی قوموں سے قطع نظر کرکے وہاں کے عوام یعنی زراعت پیشہ آبادی پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو نظر آتا ہے کہ اس کے معاشرتی ادارے عہد وسطیٰ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی کوششیں ایشیا کے باشندوں جیسی تھیں اور زندگی کے بارے میں اس کا تصور زمانہ قبل تاریخ جیسا تھا۔ کسانوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جاپانیوں کو، مانچوریا میں روس کے مقابلے میں جو کامیابی ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ جاپانیوں نے جراثیم کی شکل اختیار کرلی تھی اور روسی سپاہیوں کے بوٹوں میں گھس گئے تھے اور ان کے پاؤں کو کاٹ کر انھیں مار ڈالتے تھے۔ جب کسی ضلع میں کوئی وبا پھیلتی تھی تو وہ سب سے پہلے وہاں کے ڈاکٹر کو مارتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر کنوؤں میں زہر ڈال کر بیماریاں پھیلاتے ہیں۔ وہ جادوگرنیوں کو زندہ جلاکر خوش ہوتے تھے اور بھوت کو دفن کرنے کے لئے مردے کی لاش کو قبر سے نکالتے تھے۔ بے وفا بیویوں کو مادرزاد ننگا کرکے انھیں گاڑی سے باندھ دیتے تھے۔ اور ان پر کوڑے برساتے تھے اس لئے یہ کہنا حق بجانب ہے کہ کسانوں کے تمدن کا معیار جن کا نام ہے کہ روس کو اس وقت تباہ کیا جارہا ہے۔ مغربی یورپ کے مقابلے میں بہت ادنےٰ سطح پر ہے۔ جب کسانوں کے انبوہ کثیر پرسے وہ پابندیاں اٹھالی گئیں جو امن و امان قائم کئے ہوئے تھیں تو جماعت کے لئے اُس کے نتائج لازماً نہایت اندوہناک ثابت ہوئے۔ یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں کی طرح کسانوں میں بھی اس معاشرتی حس کا فقدان ہے جو ایک قوم میں اتفاق، یگانگت اور سیاسی اتحاد کو قائم رکھتی ہے۔ یہاں کے عوام کو جو چیز نراج کا شکار بننے سے بچائے ہوئے تھی وہ خدا کا ایک ابتدائی تصور اور زار روس کا خوف تھا۔ لیکن مانچوریا کی شکست کے بعد

سے ان میں کمزوری پیدا ہونا شروع ہوگئی .... روس کے اکثر کسان ایسے جھونپڑوں میں رہتے ہیں جو سوروں کے رہنے کی جگہ سے بھی زیادہ گندے اور بدبودار ہوتے ہیں۔ وہ سردی کے موسم میں چھ بجے بلکہ پانچ بجے سو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس مٹی کا تیل خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ انھیں نہ گوشت کھانے کو ملتا ہے نہ انڈے نہ مکھن، نہ دودھ اور اکثر کو بھی تک نہیں ملتی۔ وہ زیادہ تر سیاہ روٹی اور آلوؤں پر زندہ رہتے ہیں۔ نہیں یوں کہئے اُن کی ناکافی مقدار پر بھوکے مرتے ہیں۔ آج بھی (یعنی ۱۹۱۸ء میں) بیسرپ میں ایسے بے شمار کسان ہیں جو کافی غذا نہ ملنے کی وجہ سے بھوک سے مر رہے ہیں۔ وائٹ ایشیا میں اس وقت جبکہ فوج کے محفوظ دستے جنگ پر جا چکے ہیں۔ بہت سے ایسے گھر ہیں جن میں خاندان کے گذر کے لئے آدھ سیر جئی بھی نہیں ہے، اور نہ ہی کمانے والا گھر پر موجود ہے۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ ان فاقہ زدہ مردوں، عورتوں اور بچوں نے اپنے کھیتوں پر کافی غلہ پیدا کیا تھا۔ لیکن فصل کٹنے کے بعد سرکاری محصول ادا کرنے کے لئے انھیں اسے فروخت کر دینا پڑا تھا۔ اور اس کی انھیں محض برائے نام قیمت ملی تھی۔ سیاسیات سے انھیں کوئی واسطہ اور مطلب نہیں ہے اور اس کو یہ بالکل نہیں سمجھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ چالاک اور زمین کے لالچی ہیں۔ پہلے ان کی کوئی آواز اور اہمیت نہیں تھی اب باشعور طبقوں، خصوصاً سرکاری طبقوں نے ان کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ یہ صرف زمین کے طلبگار تھے، زمین انھیں کس طرح ملے۔ اس کے بارے میں یہ کچھ سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ ملکیت کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ ان کے ذاتی مقبوضات کو تو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ البتہ زمینداروں کے حقوق بلا تامل اُن سے چھینے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک سادہ لوحانہ اشتراکیت تھی جسے صدیوں کی جہالت، غلامی اور گمراہی نے پیدا کیا تھا یہ بات بالکل صاف تھی کہ اس عنصر کی مکمل آزادی کے معنی لازماً یہ ہوں گے کہ زار شاہی تباہ ہو جائے .... گیارہ سال ہوئے (یعنی ۱۹۰۷ء میں) میں نے لکھا تھا کہ

میں کسانوں کے سوال کو انقلاب کی ابتدا اور انتہا سمجھنا چاہیے۔ یہ وہ تخریبی آلہ ہے جو زار کی فوجی طاقت کے باوجود پرانے نظام کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دے گا۔ البتہ اگر زمین کے اہم مسئلہ کا کوئی تشفی بخش حل نکل آیا تو پھر انقلاب بہت کم زور ہو جائے گا۔ .... کیونکہ اس بات کو ہرگز نہ بھلانا چاہیے کہ اسی فی صدی آبادی ناخواندہ ہے اور لاکھوں ایسی تاریک جہالت اور اوہام پرستی میں مبتلا ہیں جس کا غیر ملکی لوگ کوئی تصور بھی قائم نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لئے انھیں رہنمائی کی بہت سخت ضرورت ہے .... یہ نعرہ "زمین کس کی؟ کسانوں کی" ان پر ایک نشہ طاری کر دیتا ہے اور انھیں بالکل دیوانہ بنا دیتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دوسروں کے جان و مال کے خلاف ہر قسم کے جرم کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔ اس سے ایک ایسی بے اندازہ آتش گیر طاقت وجود میں آتی ہے جس سے موجودہ معاشرتی اور سیاسی نظام کو درہم برہم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں زار کی فوج کی طاقت بالکل حقیر اور ہیچ معلوم ہوتی ہے کیونکہ فوج کا منبع بھی خود یہی طاقت ہے اور وہ اپنی جدوجہد اور میلانات سے فوج کو بھی متاثر کر سکتی ہے .... غرض اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ایک سہل پسند، متحمل، بے تمیز، جاہل، دروغ گو اور ایسا غیر منظم گروہ جس پر غول خواری کے دورے پڑتے ہیں۔ پیدا ہو جاتا ہے۔ ساد اسے پیراگوئی کے جنگلی گاکوس قبیلے سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔"

۱۹۱۸ء میں ڈاکٹر ڈلن نے لینن اور اس کے رفقاء کے بارے میں حسب ذیل رائے قائم کی تھی:-

"بالشویک تحریک میں ذرہ برابر بھی تعمیری اور اجتماعی تصور نہیں ہے، لینن اور ٹراٹسکی کے مغربی مداحوں کو بھی بالشوزم میں یہ چیز کہیں نظر نہیں آسکتی۔ صحیح سوشلزم کے معنی ہیں اجتماعی زندگی کی کلی اور ترکیبی تنظیم لیکن بالشوزم میں اس کے کوئی آثار نہیں بلکہ اس کے برعکس اس میں ایک جزو کو کل قرار دے دیا گیا ہے اور بقیہ حصہ کے ساتھ بالکل

کیا جاتا ہے وہ الگزنڈر اول اور نکولس اول کے زمانے کے بیگاریوں سے بہتر نہیں ہے۔ بالشوزم کو در اصل زارشاہی کی ایک الٹی شکل سمجھنا چاہیئے۔ سرمایہ داروں کے ساتھ اس کا سلوک ایسا ہی خراب ہے جیسا کہ زاروں کا بیگاریوں کے ساتھ تھا۔ بالشوزم اخباروں کا گلا گھونٹتا ہے، آزادی کی مخالفت کرتا ہے۔ قوم کے منتخب کئے ہوئے نمایندوں کو گرفتار یا جلا وطن کرتا ہے۔ اور ان جرائم کی طرف سے چشم پوشی کرتا ہے جو اپنی خونخواری میں بالکل شیطانی معلوم ہوتے ہیں "

لیکن دس سال بعد ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر ڈلن دوبارہ اشتراکی جمہوریت ہائے متحدہ روس میں وارد ہوا تو وہاں کی باتیں دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ وہ اپنی کتاب "رشیا ٹوڈے اینڈ ٹومارو" (روس اب اور آیندہ) میں لکھتا ہے:۔ ہر جگہ لوگ غور کر رہے ہیں، کام کر رہے ہیں، متفق ہو رہے ہیں، علمی انکشاف اور صنعتی ایجادیں کر رہے۔ اگر کسی شخص کے لئے روسی جمہوریتوں پر طائرانہ نگاہ ڈالنا ممکن ہوتا تو وہ اپنے حواس کی شہادت کا مشکل ہی سے یقین کر سکتا دنیا میں آج تک ایسی یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز اپنے مقصد کے تنوع شدت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ انقلابی کوشش پہاڑ جیسی رکاوٹوں کو روئی کی طرح سلنے سے ہٹا رہی ہے اور غیر ہم آہنگ عناصر کو ایک عظیم قوم میں جذب کر رہی ہے اور جب میں قوم کا یہ لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس کے پرانے معنی نہ لئے جائیں بلکہ اس سے میری مراد ایک ایسی مضبوط جماعت ہے جو گویا مذہبی جوش سے سرشار ہو کر متحد ہو گئی ہے ...... بالشویکوں نے جو کچھ ارادہ کیا تھا اس کے بہت بڑے حصے کو مکمل کر لیا ہے اور جو کام انھوں نے کیا ہے اور جن نا موافق حالات کا مقابلہ کر کے کیا ہے وہ کسی دوسری انسانی تنظیم کے لئے قابل حصول نہیں تھا۔ انھوں نے پندرہ کروڑ ایسے آدمیوں کو جو بالکل قالب بے جان نظر آتے تھے، ایک نئی روح سے معمور کر دیا ہے۔ انھوں نے کرۂ زمین کے چھٹے حصے سے پرانی دنیا کے نظام کو نیست و نابود کر دیا ہے اور دنیا کے

باقی سب حصّوں میں بھی اس کے لیے تیاریاں کر رہے ہیں۔ انھوں نے ہنگامی مشکلوں کا مقابلہ کرنے میں اپنی قابلیت اور عزم و ہمت اور اپنے مواقع سے فائدہ اٹھانے کا پورا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ اپنے ملک کی مختلف قوموں کے ساتھ جو برتاؤ انھوں نے کیا ہے اور جو وطنی آزادی انھیں عطا کی ہے اُسے جدت اور سلیقے کا شاہکار مانا جا سکتا ہے۔ اقلیتوں کے مطالبوں کو پورا کرنے کے جو طریقے انھوں نے اختیار کئے ہیں ان کا مقابلہ دنیا کا کوئی موجودہ مدبر نہیں کر سکتا۔ ان تمام معاملوں میں اور دوسرے اقدامات میں جو قوت اُن سے کام کرا رہی ہے وہ ناقابلِ تسخیر بلکہ معجزہ نما معلوم ہوتی ہے .... بالشوزم تاریخ کا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ یہ دنیا کی عظیم الشان مصفّی مسہلوں میں سے ہے جسے بعض وقت ہم مشیّت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور جس کا ظہور طویل مدتوں کے وقفہ کے بعد انسانی زندگی کے فسادات کو دور کرنے کے لئے اور نئے انسانی نظاموں کے واسطے زمین کو ہموار کرنے کے لئے ہوا کرتا ہے عبرانیوں نے حضرت موسیٰ۔ ہنوں نے ایٹلا۔ منگولوں نے چنگیز خاں کی رہنمائی میں جو کام کیا تھا وہی بالشوکوں نے لینن کی رہنمائی میں کیا ہے۔ یہ سب ایک ہی بالائے فہم نقاش کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں۔ بالشوزم کی ابتدا، زندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ہوئی ہے اور اگر ان ناانصافیوں کا ختم کرنا ضروری نہ ہوتا جن میں ہماری فرسودہ تہذیب مبتلا ہے تو یہ کبھی وجود میں نہ آتا۔ بالشوزم، خیر و شر۔ رحم و مروت سے بے تعلق ہے۔ کیونکہ یہ ایک فوق تجربی شے ہے۔ یہ عسائیت کی طرح دنیا میں امن پھیلانے کے لئے نہیں بلکہ جنگ کرنے کے لئے آیا ہے اور اس کے شکار ہوئے ہوئے لوگوں کی تعداد سخت سے سخت خونریز جنگوں سے بھی زیادہ ہے۔ اس کا انجام چاہے خیر ہو چاہے شر لیکن مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ اس وقت دنیا میں ایک نہایت زبردست قوتِ محرکہ ہے۔ بلاشبہ یہ ایک نہایت بے درد حقیقت ہے۔ اس کے افسانوں سے "بوئے خون" آتی ہے۔ لیکن اس کا زمین پر ایک مقصد اور مشن ہے جو یقیناً پورا ہو کر

رہے گا۔"

بالشوکوں کے بارے میں ڈاکٹر ڈلن جیسے واقف کار اور غیر جانب دار شخص کو ان کی دس سال کی کارگزاریوں کو دیکھنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں جس طرح اپنی رائے میں بنیادی تبدیلی کرنا پڑی تھی، اسی طرح اب دوسرے اور بہت سے مصنفوں کو بھی بالشوکوں کے ۲۰ سال کے کارناموں کو دیکھ کر اپنی رائے تبدیل کرنا پڑ رہی ہے۔ اس لئے ان کی رہنمائی میں روس کی زندگی میں جو غیر معمولی اصلاح و ترقی ہوئی ہے وہ کسی ثبوت کی محتاج نہیں رہی ہے لہذا اس پر مزید بحث کئے بغیر اب ہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے کہ انہوں نے اس کام کو انجام دینے کے لئے انھوں نے کون کون سے طریقوں کو اختیار کیا۔ ان طریقوں کو ہم حسب ذیل عنوانوں کے ماتحت تقسیم کرسکتے ہیں :-

۱۔ عورتوں کی اصلاح و ترقی اور شیر خوار بچوں کی نگہداشت۔
۲۔ صحت و صفائی کی اصلاح و ترقی۔
۳۔ معاشی اطمینان و عافیت کی ترقی
۴۔ تعلیم کی ترقی (الف) ابتدائی فنی اور اعلیٰ تعلیم۔
(۵) تعلیم کی ترقی (ب) جسمانی، سیاسی اور جمالی تربیت اور تعطیلات و تفریحات کی تنظیم۔
۶۔ مکانوں کی فراہمی اور شہروں کا منصوبے کے مطابق بسانا۔
۷۔ میونسپل خدمات کی ترقی

(باقی)

ہندوستان کی بنک کاری کا مستقبل

دوران جنگ میں ہندوستانی بنکوں کی حالت میں دو غیر معمولی تغیرات ہوئے ہیں۔

(۱) بنکوں کی امانتوں میں اضافہ ہوا ہے۔

(۲) لیکن بنکوں سے کم مقدار میں قرضے لئے گئے ہیں جس کی وجہ سے امانتوں اور قرضوں کا باہمی تناسب فی صد گر گیا ہے۔

امانتوں میں اضافہ کے اسباب :- امانتوں میں اضافہ کے اسباب متعدد ہیں

(۱) امانتوں میں اضافہ کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حکومتِ ہند و حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان میں بڑے پیمانے پر خریداریاں کی ہیں جس کی وجہ سے صناع، تاجر اور ٹھیکہ داروں کی آمدنیوں میں اضافہ ہوا ہے اور انھوں نے اپنی ان رقومات کو بنکوں میں رکھایا ہے

(۲) جنگ کی وجہ سے بعض ایسے طبقوں کی آمدنیوں میں اضافہ ہو گیا ہے، جو پہلے بنکوں میں امانتیں نہیں رکھاتے تھے۔ اب یہ لوگ بھی بنکوں میں امانتیں رکھانے لگے ہیں۔

(۳) امانتوں میں اضافہ کی ایک وجہ افراطِ زر بھی ہے۔ حکومت ہند نے حکومت برطانیہ کی خریداری کے لئے روپیہ فراہم کرنے کا انتظام اپنے ذمے رکھا ہے۔ حکومت برطانیہ ان خریداروں کی ادائی اسٹرلنگ میں کرتی ہے جو ہندوستان کے نام لندن کے ذخیرہ اسٹرلنگ میں جمع کردئے جاتے ہیں اور ان کے معاوضہ میں روپئے کی اجرائی کے لئے تمسکات اسٹرلنگ ریزرو بنک کے شعبہ بنک کاری سے شعبۂ اجرائی میں منتقل کئے جاتے ہیں، جن کی پشت پناہی پر روپیہ جاری کیا جاتا ہے۔ غرض کہ افراطِ زر کے اس طریقے کی وجہ سے صناع، تاجر، ٹھیکہ داروں اور سٹے بازوں کی آمدنیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اسی لئے ان لوگوں نے بنکوں میں زیادہ امانتیں رکھائی ہیں

قرضوں میں تخفیف کے اسباب:-

قرضوں کی مقدار میں حسب ذیل اسباب کی بنار پر تخفیف ہوئی ہے۔

(۱) حکومت نے خود اپنے طور پر جنگی ٹھیکوں کے لئے رقمی مدد دی۔

(۲) اشیار کی خریداری کے لئے، حکومت نے فوراً اپنے پاس سے رقم ادا کی۔

(۳) صنعتی کاروبار میں اضافہ ہوا اور حرفت کاروں کو منافع بھی اچھا ملا، جس کی وجہ سے ان لوگوں نے بنکوں سے نقد رقم کم مقدار میں قرض لی

(۴) مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں سے محصول وصول کرنے میں دیر کی گئی جس کی وجہ سے انھیں رقم لینے کی ضرورت نہیں پڑی۔

(۵) حکومتوں نے قیمتوں کی نگرانی کی اور فصلوں کو براہِ راست کاشتکاروں سے خریدا۔

(۶) درآمدی اشیار کے تھوک اور جلد فروشندے اپنے ذخیروں کو نہ بڑھا سکے۔ کیونکہ یہ اشیار انھیں دستیاب نہیں ہو رہی تھیں۔ اس عدم دستیابی کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ حکومت نے ان کی کافی مقدار حاصل کرلی تھی اور دوسرے یہ کہ درآمد پر سختی سے نگرانی عائد کردی گئی تھی۔ چونکہ تاجر درآمدی اشیار کے ذخیروں میں اضافہ نہیں کرسکتے تھے اس لئے ان کو زیادہ مقدار میں بنکوں سے رقوبات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی

غرض کہ دورانِ جنگ میں مختلف وجوہات کی بنار پر امانتوں میں اضافہ اور قرضوں میں تخفیف ہوئی۔ دیکھنا یہ ہے کہ دورانِ جنگ میں زر کی مقدار میں جو توسیع کی گئی ہے، وہ اگر بعد جنگ ختم ہو جائے تو بنک کی امانتوں اور قرضوں پر اس کے کیا اثرات پڑیں گے۔ پھر دوسرے یہ کہ جنگ کی وجہ سے جو صنعتی و تجارتی گرم بازاری پیدا ہوگئی ہے، جنگ کے بعد اگر یہ گرم بازاری ختم ہو جائے تو کیا ہوگا؟

ان دو تنقیحات کی روشنی میں ہم بنکوں کی امانتوں اور قرضوں کے مستقبل کا

مطالعہ کریں گے۔

سوال یہ ہے کہ کیا جنگ کے بعد امانتوں کی مقدار میں تخفیف ہو جائے گی؟

جنگ کے بعد امانتوں میں کمی کے اسباب حسب ذیل ہو سکتے ہیں:۔

(۱) جنگ کی وجہ سے تجارتی صنعتی اور کاروباری سرگرمی پیدا ہو گئی ہے، بنکوں نے بھی اس سرگرمی میں حصہ لیا ہے اور قرضے دئے ہیں۔ اگر جنگ کے بعد بنک اپنے ان قرضوں کو واپس طلب کریں اور یہ قرضے ادا کر دئے جائیں تو پھر بنک کی امانتوں میں تخفیف ہو گی۔ —— لیکن یہ پیش قیاسی کی جا سکتی ہے کہ جنگ کے بعد بنک اپنے یہ قرضے واپس طلب نہیں کریں گے، کیونکہ ہندوستان کے پیش نظر اس وقت تعمیر و ترقی کے وسیع معاشی منصوبے ہیں اور ملک کے کاروباری ماہرین ان منصوبوں کو روبہ عمل لانے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس لئے اندازہ یہی ہے کہ جنگ کے بعد تعمیر و ترقی کے ان منصوبوں کو روبہ عمل لانے کے لئے بنکوں سے زیادہ خدمات طلب کی جائیں گی۔ اس لئے موجودہ قرضوں کی واپسی کا امکان کم ہے۔

(۲) حکومت نے دوران جنگ میں کافی مقدار میں قرضے حاصل کئے ہیں۔ اگر جنگ کے بعد حکومت بھاری محاصل کے ذریعے رقومات حاصل کر کے ان قرضوں کو ادا کر دے تو پھر بنکوں کی امانتوں میں تخفیف ہو گی کیوں کہ ان محاصل کی ادائی کے لئے محاصل ادا کنندے اپنی رقومات بنکوں سے نکالیں گے۔

اس سلسلے میں چند امور غور طلب ہیں۔ حکومت محاصل کے ذریعے رقومات حاصل کر کے قرضوں کی ادائی کا اسی وقت بند و بست کر سکتی ہے جب کہ وہ جنگ کے بعد بچت والے موازنے تیار کرے۔ مگر امکانات یہ ہیں کہ حکومت تعمیر و تنظیم مابعد جنگ کی اسکیموں میں عملی طور پر حصہ لے گی، جس کے لئے اس کو کثیر مالی وسائل کی ضرورت لاحق ہو گی۔ اس لئے اس بات کا امکان نہیں ہے کہ حکومت جنگ کے بعد قرضے نہیں لے گی۔

پھر یہ چیز غور طلب ہے کہ اگر حکومت جنگی قرضوں کی ادائی کے لئے محاصل کے ذریعے رقومات حاصل کرے گی۔ تو یہ رقومات ان ہی لوگوں کو دے گی جنھوں نے جنگی قرضوں میں حصہ لیا تھا اور یہ واضح رہے کہ حکومت کے جنگی قرضوں میں حصہ لینے والوں کی اکثریت ان ہی اشخاص کی تھی جن پر حکومت بعد جنگ محاصل لگائے گی۔ گویا جس طبقے سے اُس زمانے میں قرضہ لیا گیا ہے۔ اُسی طبقہ سے محصول کے ذریعے رقم لے کر، اس کا قرضہ بیباق کردیا جائے گا۔ اس طرح ان طبقوں کو اپنے بنک کی امانتوں میں تخفیف کرنے کی بڑی حد تک ضرورت نہ ہوگی۔

(۴) اگر جنگ کے بعد ہندوستان کا توازن تجارت مخالف ہوجائے یعنی ہندوستان کی درآمد اس کی برآمد سے بڑھ جائے تو اس کا امکان ہے کہ بنک کی امانتوں میں تخفیف ہوگی۔ کیونکہ ہندوستانی درآمد کنندے بنکوں سے اپنی رقومات نکال کر ان درآمدات کی ادائی کریں گے۔

لیکن یہاں بھی بعض امور غور طلب ہیں۔

(i) ہمارا توازن تجارت اسی وقت مخالف ہوسکتا ہے جب کہ نگرانی مبادلہ کو برخواست کردیا جائے۔

(ii) مخالف توازن تجارت کے باوجود اگر ہمیں اپنے فاضلات اسٹرلنگ کے آزادانہ استعمال کی اجازت دی جائے تو پھر امانتوں میں تخفیف نہ ہوگی۔ کیونکہ مخالف توازن تجارت کی بھرپائی یا بالفاظ دیگر زائد درآمدات کی قیمتوں کی ادائی فاضلات اسٹرلنگ سے کی جاسکے گی ایسی صورت میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے فاضلات اسٹرلنگ کی مقدار گھٹ جائے گی۔ لیکن بنکوں کی امانتوں میں بہر حال تخفیف نہیں ہوگی۔

(iii) جنگ کے بعد ہم اپنی معاشی تعمیر و ترقی کے لئے کثیر مقدار میں اشیائے اصل حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر محض اشیائے اصل کی زائد درآمد کے باعث توازن تجارت مخالف ہوجائے

تو اس کی وجہ سے امانتوں کی مقدار میں بڑی حد تک غیر معمولی تخفیف نہ ہوگی۔ کیونکہ اشیائے اصل کی درآمد کے باعث ملک کی معاشی وصنعتی سرگرمی میں اضافہ ہوگا اور اس طرح بنکوں سے زیادہ مالی امداد طلب کی جائے گی، اور اس حد تک امانتوں کی تخفیف کو روکا جاسکے گا۔

(۱۷) زیادہ امکان تو اس امر کا بھی ہے کہ توازن تجارت ہمارے مخالف نہیں رہے گا ہندوستان کا توازن تجارت ہمیشہ موافق رہا ہے۔ ہندوستان سے بعض اشیاء مثلاً چائے، سن، تل وغیرہ جتنی مقدار میں پہلے برآمد ہوتی تھیں، امکان یہی ہے کہ جنگ کے بعد بھی ہوتی رہیں گی، کیونکہ یہ چیزیں دوسرے ممالک سے کم داموں پر حاصل نہیں ہوسکتیں لہذا ہندوستان کا موافق توازن تجارت جنگ کے بعد بھی باقی رہے گا۔ اب رہا یہ سوال کہ ہم اشیائے اصل (مشنری وغیرہ) زیادہ مقدار میں درآمد کریں گے۔ اس لئے ممکن ہے کہ توازن تجارت مخالف ہو جائے، تو اس کا امکان یوں کم ہے۔ ہم اپنے فاضلات اسٹرلنگ سے ان درآمد شدہ اشیائے اصل کی قیمت کے ادا کریں گے۔

(۱۸) بیان کیا جاچکا ہے کہ امانتوں میں اضافہ کی ایک وجہ افراط زر بھی ہے۔ اگر جنگ کے بعد اتنے وسیع پیمانے پر تعمیری کاروبار شروع نہ کئے جائیں تو زر کی مقدار میں اضافہ نہیں کیا جاسکے گا اور اس لئے امانتوں میں بھی اضافہ نہ ہوگا۔

اگر جنگ کے بعد خانگی تاجروں اور صناعوں نے ریزروبنک کو روپیہ دے کر اس کے معاوضہ میں اسٹرلنگ حاصل کرلیا تاکہ وہ اپنی درآمد کردہ اشیاء کی قیمت ادا کرسکیں تو اس طریقہ کار کی وجہ سے بنکوں کی امانتوں میں تخفیف ہوگی۔ پھر جب ریزروبنک کو اسٹرلنگ کے معاوضہ میں روپیہ مل جائے گا تو وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ان روپیوں کو، جن کی پشت پناہی پر اسٹرلنگ نہیں ہیں، خارج کردے گا گویا تقلیل زر کی پالیسی اختیار کی جائے گی۔ اگر اس حکمتِ عملی کو اختیار کیا جائے گا تو امانتوں میں یقیناً تخفیف ہوگی۔

اس کے تدارک کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ حکومت اس حکمتِ عملی کو اختیار نہ کرے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بنک عوام میں کفایت شعاری کی مہم کو آگے بڑھائیں۔ ہندوستان میں اس مہم کو جاری کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ یہاں کا طریقہ ابھی ابتدائی منزل میں ہے۔

(ب) قرضے :- آیا جنگ کے بعد قرضوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا یا تخفیف ہوگی؟ جنگ کے بعد دشمن ممالک سے تجارت ہونے لگے گی۔ درآمد برآمد پر سے نگرانی برخواست ہوجائے گی۔ بین صوبجاتی حمل و نقل پر جو امتناع اس وقت عائد کیا گیا ہے، اٹھالیا جائے گا۔ ان حالات میں کاروباری سرگرمی بڑھے گی اور قرضوں کی طلب میں اضافہ ہوگا، لیکن جنگ کے بعد اگر سرد بازاری کا دور دورہ ہوا تو پھر قرضوں کی طلب میں اضافہ نہیں ہوگا۔ بلکہ وہی حالت رہے گی جو اب دورانِ جنگ میں ہے۔

قانون بنک کاری :-

دورانِ جنگ قانون بنک کاری میں بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ بنک کاری سے متعلق ایک جامع قانون کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی۔ نومبر ۱۹۳۹ء میں آنجہانی سر جیمس ٹیلر سابق گورنر ریزرو بنک نے حکومت ہند کے پاس ایک مسودۂ قانون روانہ کیا تھا، اور یہ مسودہ عوام میں گشت بھی کر رہا تھا۔ لیکن جنگ کی وجہ سے اس سلسلے میں مزید قدم نہیں اٹھایا گیا۔ البتہ اس اثناء میں قانون کارخانہ جات کی بعض دفعات میں جن کا تعلق بنک کاری سے تھا، ترمیم کی گئی۔ لیکن گذشتہ تین سال میں بہت سے نئے بنکوں کا افتتاح عمل میں آیا، اور کئی نئی شاخیں کھولی گئیں ہیں، جس کی وجہ سے ملک کا یہ عام مطالبہ تھا کہ بنک کاری کے متعلق ایک جامع قانون بنایا جائے۔ ریزرو بنک نے اپنے پرانے مسودے میں چند تبدیلیاں کرنے کے بعد حکومت کے پاس روانہ کیا تھا۔ اور وزیر مالیہ سر جرمی ریزمن نے اسی کو مسودۂ قانون کی شکل میں ۹ نومبر ۱۹۴۴ء کو مجلس مقننہ

میں پیش کیا ہے۔ اس مسودہ کی پہلی خواندگی ہو چکی ہے اور امید ہے کہ یہ مسودہ بہت جلد قانون بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ مستقبل میں ملک کی بنکاری کی تشکیل بڑی حد تک اسی قانون کے تحت ہوگی، اس لئے یہاں ہم اس مسودہ کے بعض دفعات پر تنقیدی نظر ڈالیں گے۔

(۱) بنک کاری کی تعریف:۔ بنک کاری کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "بنک کاری کے معنے ہیں اامانتوں کو قبول کرنا اور عندالضرورت اُن کو ادا کرنا"۔ یہ تعریف بہت ہی سادہ اور جامع ہے۔ توقع ہے کہ بنک کاری کے کاروبار میں جو قانونی اور کاروباری پیچیدگیاں پیدا ہو جایا کرتی تھیں۔ اب اس تعریف کے بعد رفع ہو جائیں گی۔

(۲) ادا شدہ اصل و ذخیرہ محفوظ:۔ موجودہ نافذہ قانون کی رو سے بنکوں کا ادا شدہ اصل اور ذخیرہ محفوظ کم سے کم پچاس ہزار روپیہ ہونا چاہیئے۔ لیکن موجودہ مسودہ میں اس کی مقدار بڑھا کر ایک لاکھ کر دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں بنک کے اصل و ذخیرہ محفوظ کا تعین اس کے محل وقوع اور آبادی کے لحاظ سے کیا گیا، مثلاً بمبئی، کلکتہ اور رنگون کے بنکوں کے لئے یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ پانچ لاکھ کا اصل رکھیں۔ ان کے علاوہ دیگر شہروں (جن کی آبادی ایک لاکھ ہو) کے بنکوں کے لئے دو لاکھ روپیہ رکھنا لازمی ہے جن بنکوں کی رجسٹری برطانوی حصہ سے باہر (مثلاً دیسی ریاستوں) یا سلطنتِ متحدہ میں ہوئی ہو تو انھیں چاہیئے کہ کم سے کم ۲۰ لاکھ روپیہ نقد ریزرو بنک میں جمع کرائیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ ان قواعد کا اثر بنک کاری کے مستقبل پر کیا پڑے گا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصل کا اتنا اعلیٰ معیار اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ کھاتہ داروں کے مفاد کا تحفظ ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس امر کا لحاظ کئے بغیر کہ کون سا بنک کتنے پیمانے پر کاروبار کرتا ہے، اصل کا اعلیٰ معیار مقرر کر دینے سے کھاتہ داروں کے مفاد کا تحفظ ہو جاتا ہے؟

اداشدہ اصل اور ذخیرۂ محفوظ کو اس قدر بڑھاکر مقرر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اس کے باعث بڑے شہروں میں بنکوں کی شاخوں کو زیادہ بہتر طریقے پر منظم کیا جاسکے گا۔ لیکن ہمارے خیال میں محض اداشدہ اصل کی مقدار بڑھا دینے سے نہ تو شاخوں کی تنظیم ہو سکتی ہے اور نہ ہی کھاتہ داروں کے مفاد کا تحفظ ہو سکتا ہے۔

پھر بڑے شہروں کے بنکوں کے لئے اصل کی جو زائد مقدار مقرر کی گئی ہے اس وجہ سے ان شہروں میں چھوٹے بنک کھلنے نہیں پائیں گے۔ عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ چھوٹے بنکوں کے باعث کاروبار میں افراتفری پھیلتی ہے۔ لیکن حقیقت حال یہ نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے بنک اپنے حلقے کے لوگوں سے شخصی طور پر واقف ہوتے اور ربط رکھتے ہیں اور ان کی وجہ سے چھوٹے تاجروں اور صناعوں کو اعتبار کی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن اب ان قواعد کے نفاذ کی وجہ سے اُن لوگوں کو اعتبار وقرض کے سلسلے میں گوناگوں دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

قانون کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ برطانوی ہند سے باہر جن بنکوں کی رجسٹری ہوئی ہو، وہ اگر کسی صوبے میں اپنی شاخیں کھولیں تو انھیں دو لاکھ روپے ریزرو بنک کے پاس جمع کرانے ہوں گے۔ اس دفعہ کے مضرات یہ ہیں کہ دیسی ریاست کا بنک برطانوی ہند کے کسی صوبے میں اپنی شاخ بمشکل ہی کھول سکے گا۔ بالفاظ دیگر اس دفعہ کے باعث ملک کے اندر بنک کاری کی خاطر خواہ توسیع نہ ہو سکے گی اور چھوٹے چھوٹے تاجروں اور صناعوں کو اعتباری سہولتیں فراہم نہ ہو سکیں گی۔

(۳) مسودۂ قانون کی ایک اہم دفعہ یہ ہے کہ ہر بنک اپنی امانتوں کا ۲۵ فی صد نقد یا تمسکات کی صورت میں رکھے گا۔

یہ قاعدہ بھی کچھ زیادہ دل خوش کن نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے ان چھوٹے چھوٹے بنکوں کے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی جو زیادہ تر زرعی کاروبار کے لئے

اعتباری سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے فنڈ کا اتنا بڑا حصہ محفوظ رکھوانے سے ان کے کاروبار میں دقت اور کمی ہو گی۔ پھر دوسرے یہ کہ زراعت کو رقمی امداد کی ضرورت موسمی ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ یہ رقم چھوٹی مدت کے لئے دی جاتی ہے۔ جو بنک یہ کاروبار کرتے ہیں انھیں موسمی امانتوں کو حاصل کرنے کے لئے مزید تشویق و ترغیب سے کام لینا پڑتا ہے یعنی امانتیں حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ شرح سود دینی پڑتی ہے جب اس دفعہ کے تحت اُن کے کاروبار میں کمی ہوگی تو وہ اعلیٰ شرح سود کس طرح دے سکیں گے؟ بالفاظ دیگر زرعی کاروبار کے لئے جو بنک اعتباری سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں۔ اس دفعہ کے تحت اپنی امانتوں کا ایک بڑا حصہ نقد یا تمسکات کی صورت میں رکھ کر وہ اپنے کاروبار میں کمی کریں گے اور جب اُن کے کاروبار میں کمی ہو گی تو وہ اعلیٰ شرح سود نہ دے سکیں گے۔ جس کے باعث انھیں زیادہ مقدار میں امانتیں حاصل نہ ہو سکیں گی اور اس طرح وہ زرعی کاروبار کے لئے اعتباری سہولتیں بہم نہ پہنچا سکیں گے۔

مناسب یہ ہے کہ امریکہ کی مانند کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ مقدار کا قانوناً تعین کر دیا جائے اور ریزرو بنک کو اختیار دیا جائے کہ ان حدود کے اندر امانتوں کا جو فیصلہ چاہے نقد یا تمسکات کی صورت میں رکھوائے۔

(۳) بنکوں کے نظار کو یا ایسی کمپنیوں کو جن میں یہ نظار حصہ دار ہوں قرضے دینے کے متعلق مختلف بندشیں عائد کی گئی ہیں۔ اس قسم کی بندشیں مناسب، موزوں اور ضروری تھیں۔

(۴) برطانوی ہند سے باہر یا سلطنت متحدہ میں رجسٹری شدہ بنکوں کے لئے ریزرو بنک سے اجازت نامہ لینا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ریزرو بنک اجازت نامہ دینے سے قبل ضروری معلومات حاصل کرے گا۔ یہ دفعہ بھی مناسب ہے۔ اس کی وجہ سے ملکی بنکوں کو ترقی کرنے کا موقع ملے گا۔

(۵) ریزرو بنک کو دوسرے بنکوں پر نگرانی و تنقیح کے وسیع اختیارات دئے گئے

ہیں ـــــــــــ مگر ہمارے خیال میں یہ اختیارات ناکافی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ریزرو بنک کو اس سے زیادہ اختیارات دئے جائیں تاکہ وہ ملک کے تمام بنکوں کو اپنے زیر اثر رکھ سکے۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ ریزرو بنک سے اجازت حاصل کئے بغیر نہ تو کسی بنک کا افتتاح عمل میں آئے اور نہ اس کی کوئی شاخ کھلنے پائے۔ اس طرح ریزرو بنک کو نگرانی کے پورے اختیارات حاصل ہو جاتے۔ مگر اس دفعہ کے تحت مرکزی حکومت نے یہ اختیار اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور ریزرو بنک کے سپرد صرف تنقیح و جانچ کا کام کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے نظام بنک کاری کی موثر تنظیم نہیں ہو سکے گی۔ ضرورت ہے ریزرو بنک کو نگرانی وغیرہ کے سلسلے میں صراحت طور پر ذمے دار قرار دیا جائے۔

(۵) دیسی بنک کاروں کے الحاق کا مسئلہ:۔

پندرہ سال قبل بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی نے اس مسئلے پر زور دیا تھا اور اپنی سفارشات پیش کی تھیں۔ لیکن اس وقت سے اب تک یہ مسئلہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ ہمارے نظام بنک کاری کو زیادہ کارگذار وسیع اور موثر بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ریزرو بنک دیسی بنک کاروں سے تعلق پیدا کرے اور ان کو اپنے زیر اثر لائے تاوقتیکہ ان بنک کاروں کو نظام بنک کاری کے سلسلے کی ایک مضبوط کڑی نہیں بنایا جائے گا۔ ہندوستانی بنکوں کا مستقبل درخشاں نہ ہوگا۔

محمد احمد خاں ایم۔اے عثمانیہ
ایل۔ایل۔بی (علیگ)

دلی کی لاہوری برادری

(گذشتہ سے پیوستہ)

سادہ کاری کی سب سے خاص منزل

اس کا مطلب یہ ہے کہ سادہ کاری کے تمام درجوں میں کھلائی اور جڑائی مرکزی کام ہے۔ اس لئے صرف اسی ایک حصے کا کاری گر سادہ کار ہے۔ لیکن حقیقی بات یہ ہے کہ کاری گر خواہ وہ زیور کے کسی حصے کا ماہر خصوصی ہو، سادہ کار ہے۔ البتہ ایک درجے میں مثلاً میناکاری، چھلائی وغیرہ میں وہ امتیاز رکھتا ہے۔

راقم نے تیاری کے درجوں میں بہت سی نازک تفصیلات قصداً چھوڑ دی ہیں کیونکہ یہ سرسری بیان سادہ کاری کی صنعت کا ایک تصور دینے کے لئے ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ سادہ کاری جیسی پیچیدہ اور اہم صنعت کے تفصیلی ذکر کے لئے ایک بڑی کتاب کی ضرورت ہے۔

سادہ کاری میں دوسروں سے مقابلہ

سادہ کاری کی صنعت کے میدان میں لاہوری کاری گر ایک مدت اکیلے رہے اور کوئی ان کے مقابلے میں نہیں آیا۔ سادہ کاری بجائے خود مشکل صنعت ہے، کتابی رہبری سے سیکھی نہیں جاسکتی۔ طویل عملی مشق اس کے لئے درکار ہوتی ہے۔ لاہوری برادری کے کاری گر کو اس کام کی مہارت نسلاً بعد نسل ورثے میں ملتی ہے۔ فطرت اس کے ہاتھ میں وہ لچک اور آنکھوں میں وہ نظر خود عطا کرتی ہے جو اس کام کے لئے ضروری ہے۔ اس پر بھی بہت بچپن سے وہ استاد کے پاس بٹھا دیا جاتا ہے تب کہیں دس بارہ برس میں جاکر وہ کارآموزی کا نصاب پورا کرتا ہے۔ اس پر اضافہ کیجئے۔ مشرقی استاد فن کی یہ روایتی وضع داری کہ وہ برادری کے شاگرد کو بھی کام

کے نکتے بتانے میں بخل کرتا ہے اس لئے دوسری برادری کے آدمی کو تو کبھی ہمت ہی نہیں پڑی کہ وہ سادہ کاری سیکھنے کی جرأت کرتا۔ لیکن وقت نے جو سب سے بڑا مصلح ہے ایک ایسی دنیا سامنے کردی جس میں زندگی کا سارا نظام بدلا ہوا تھا۔ لاہوریوں سے دوسروں نے یہ صنعت کسی قدر سیکھی۔ لیکن وہ اتنے کم تھے کہ مقابلہ نہ کرسکے بلکہ لاہوریوں میں مل جل گئے۔

ملکی مقابلہ مرہٹہ کاری گر اور زیادہ تر بنگالی کاری گرنے البتہ مقابلہ کیا۔ لیکن مجموعی حیثیت سے لاہوری برادری کے صناع کو بازار میں ترجیح دی گئی

غیر ملکی مقابلہ ملکی مقابلے سے نبٹے تو غیر ملکی مقابلہ پیش آیا۔ جو زیادہ سخت تھا۔ زیکوسلواکیہ کی نقلی اور اصلی زیورات کی دستکاری نے جس کی بنیاد مشین اور سائنس کی ترقی نے مضبوط کی تھی، لاہوری برادری کے دستکار کو بہت پریشان کیا۔ نقلی زیورات Imitation (Ornaments) کی عام مقبولیت نے لاہوری برادری کے معمولی کاری گر کو بے کار کر دیا۔ امرا نے یورپ کی اصلی جوہری کی سرپرستی کو اپنے شایانِ شان سمجھا۔ اس لئے لاہوریوں کا اوسط اور اعلیٰ دستکار کم وزن ہو گیا۔ مشینی طریقے کا استعمال تعلیم اور جرأت کی کمی سے لاہوری کر نہیں سکتے تھے۔ بہت معمولی مشینی استعمال بدرجہ مجبوری انھوں نے شروع کیا۔ ظاہر ہے کہ پھر بھی وہ ولایتی مال کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن فنا ہونے سے بچ گئے۔

سادہ کاری میں بڑے پیمانے پر تیاری بڑے پیمانے پر تیاری (Mass production) خالی چاندی اور نقلی دھاتوں کے زیور میں ممکن ہے۔ لیکن لاہوری کاریگر جو صنعتی ضرورت سے تقسیم عمل کے قدرتی طور پر پابند ہو گئے ہیں۔ تجارتی ضرورت سے تقسیم کار کے اصول سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ جہاں روپے اور تعلیم کی کمی ہے وہاں اُن کو صحیح مشورہ دینے والا بھی کوئی نہیں۔ ورنہ برادری اتنا سرمایہ ضرور جمع کرسکتی ہے جو ایک ایسے صنعتی مرکز کے کھلنے کے لئے کافی ہے۔ جس سے لاہوریوں کا عام سادہ کار طبقہ فائدہ اٹھا سکتا ہے اور بہت ترقی کرسکتا ہے۔ اب جنگ کی وجہ سے باہر کا مال بند ہوا اور دیسی مال کی مانگ بڑھی تو عام

سادہ کار طبقہ ذرا ہوشیار ہوا، لیکن کوئی منظم کوشش نظر نہیں آتی عجیب افرا تفری ہی ہر مہر کاری گر دوسرے چند کاریگروں کو ملا کر کسی قدر تیزی کے ساتھ مال تیار کرتا ہے اور سمجھتا ہی بازار میں اس سے زیادہ مال کی کھپت نہیں۔ اور چاہتا ہی کہ جتنا نفع جلد سے جلد اُسے مل جائے غنیمت ہے۔

سونے کے زیورات بڑے پیمانے پر بننا مشکل ہیں

اصل جویلری یعنی سونے کا زیور، بڑے پیمانے پر بننا بہت محال نظر آتا ہی۔ حالانکہ سونے کے زیور سازی کے اتنے ہی بڑے کارخانے انگلستان میں ہیں جتنے بڑے صابن یا تیل کے کارخانے ہیں اور جہاں زیور کی تیاری کا ہر درجہ مشین سے پورا ہوتا ہی۔ لڑائی کی وجہ سے سونے کا ولایتی مال بازار میں کم ہی۔ اس لئے اعلیٰ درجے کا لاہوری صناع اس وقت تیزی سے کام کر رہا ہی۔ ہم اسے تسلیم کرتے ہیں کہ لاہوری کاریگر کے ہاتھ کا بنا ہوا سونے کا پرزہ ولایت کے سونے کے پرزے سے زیادہ وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہی۔ لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہی دنیا میں قدروں کے سانچے بدل گئے ہیں۔ اعلیٰ درجے کے کمال صنعت کی بقا کے لئے جہاں لاہوری استاد کے فن کا وجود ضروری ہی۔ لاہوریوں کی قومی بقا کے لئے صنعت کی تجارتی ترقی کی تدابیر بھی اتنی ہی ضروری ہیں مستقبل کا مسئلہ لاہوریوں کے سوچنے کی چیز ہے۔ ایک دم سے عظیم الشان کارخانے قائم کرنا نہ ممکن ہی نہ مفید۔ لیکن مشین کی مناسب مدد سے انھیں اپنی عام سادہ کار کی رفتار تیز کرنی ہوگی تاکہ جنگ کے بعد کے بازار میں اُن کا مال اتنا تو کھپ سکے جو اُن کے مزدور کی زندگی کی حفاظت کر سکے۔

لاہوری برادری میں پیشے کی تبدیلی

لاہوری برادری میں بعض لوگ اپنا پیشہ تبدیل بھی کر لیتے ہیں۔ ہنر کی مہارت بیٹے کو باپ سے ورثے میں ملتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں فطری طور پر ذوق کا اختلاف واقع ہوتا ہی۔ مثلاً سادہ کار کے ایک لڑکے کو اپنے باپ کے کام سے کوئی دلچسپی نہیں، وہ ایک لوہے کے کام کے کارخانے میں اکثر جا بیٹھتا، اور بڑے شوق سے کام میں شریک

ہو جاتا۔ باپ کے ڈانٹنے پر اُس نے صاف کہہ دیا کہ میں سادہ کاری نہیں سیکھنا چاہتا۔ مجھے تو
لوہے کا کام اچھا معلوم ہوتا ہے۔ آخر اُسے ایک اچھے مستری کے پاس کام سیکھنے کے لئے بٹھادیا
گیا۔ ایک لڑکے نے اپنے باپ کا لکڑی کی خراد کا کام پسند نہیں کیا اور سادہ کاری سیکھی
کہیں پیشے کی تبدیلی غلط وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً ایک بہت باکمال مصور کے لڑکوں نے
دیکھا کہ باپ کی مذہبی حیثیت برادری میں مشتبہ ہے۔ یہاں تک کہ مسجد میں اس کا چندہ
اس لئے قبول نہیں کیا گیا کہ وہ تصویر بنا کر کمایا گیا ہے۔ اس لئے بڑے لڑکے نے سادہ کاری
سیکھی۔ اور چھوٹے نے لکڑی کی خراد کا کام سیکھا۔ دونوں اپنے کام کے معمولی کاریگر ثابت
ہوئے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ مصوری میں باکمال ہوتے یا معمولی درجہ حاصل کرتے۔
واضح رہے کہ پیشوں کی یہ تبدیلی صرف برادری کے رائج حرفوں میں عمل میں آتی ہے۔ ایسا کبھی
نہیں ہوتا کہ پیشہ تبدیل کرنے میں کسی ایسے حرفے کا انتخاب کیا جائے جو برادری میں
رائج نہ ہو۔ مثلاً یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ کساد بازاری سے تنگ آکر کوئی لاہوری کاریگر
کوئی عاجلانہ منفعت کا کاروبار کرے یا ادنیٰ حرفتی کام کرنے لگے۔ جیسے بٹن سازی قلعی گری وغیرہ

بالکل نئے پیشے | زندگی کے انقلاب نے اب نئی نئی صنعتیں پیدا کیں۔ اس طرح کہ ہر صنعت
ہزار دو ہزار صنعتیں اپنے دامن میں لپیٹے ہوئے ہے۔ بے شک ان نئے کاموں میں سے
چند کاموں پر لاہوریوں کی نظر انتخاب گئی۔ مگر انتخاب میں وہی فن کا نقطۂ نظر سامنے
رہا۔ چنانچہ لوہے کا مشینی کام اور بجلی کا کام جو انجینئرس سی ذہانت چاہتا ہے اور گھڑی سازی
کا کام جس میں سادہ کارانہ دماغ اور نظر درکار ہے۔ لاہوریوں کے کچھ افراد نے اختیار کیا،
اور ان میں بھی امتیازی درجہ حاصل کیا۔

علمی پیشے | علمی پیشوں کی مثالیں بھی مل جائیں گی۔ یعنی لاہوری برادری میں ڈاکٹر، وکیل
طبیب، مدرس وغیرہ بھی کچھ لوگ نکل آئیں گے۔ سرکاری دفتر کے ملازم بھی کچھ نہ کچھ ہیں
صدر بازار کے تاجروں کی صف میں دو ایک ممتاز سوداگر لاہوری برادری کے بھی ملیں گے

قدیم علمی روایات کی جھلک بھی کہیں نظر آئے گی اور لاہوریوں میں ایک آدھا عالم دین، وکیل، مدرس اور شاعر بھی مل سکے گا لیکن آخر کار لاہوری برادری فی الجملہ ایک صناع برادری ہے، اور صنعت کا کمال اس کے امتیاز کے لئے بس کرتا ہے۔

لاہوری برادری اور ساہوکار جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، لاہوری برادری صنعت کی صرف مزدوری لیتی ہے، اس کا تجارتی فائدہ ہندو ساہوکار اور جوہری اٹھاتے ہیں ہندو دوکان دار کی بنیاد صرف لاہوری کاریگر ہے۔ کاریگر ہندو بیوپاری کی مٹھی میں رہتا ہے۔ مزدوری اسے کم ملتی ہے۔ خرچ کی زیادتی اور آمدنی کی کمی سے وہ قرض لینے پر مجبور ہے اور یہ دباؤ کبھی سوچنے بھی نہیں دیتا کہ خود اس کی مزدوری اس کی خوش حالی کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ جب حال یہ ہے تو سونا اور جواہر غریب سادہ کار کہاں سے لائے گا جس سے وہ مال تیار کرے اور آزادی سے کسی دوکان دار کو دے سکے۔ وہ عموماً ایک ہی سیٹھ کا پابند ہوتا ہے۔ بڑے درجے کے سادہ کار جو نسبتاً آسودہ حال ہوتے ہیں، اپنا سونا لگا کر مال تیار کر سکتے ہیں۔ لیکن ہندو سیٹھ کے پرانے تعلق اخلاقی دباؤ انھیں وضع داری کے ساتھ اسی کا پابند رکھتا ہے۔ یہ بڑے سادہ کار کمال فن کے استغنا سے کبھی غور بھی نہیں کرتے کہ زیورات کی اُجرت کے علاوہ اس کا تجارتی منافع بھی کوئی چیز ہے۔

لاہوری اور زیورات کی تجارت کسی صاحب ثروت سادہ کار نے اس طرف توجہ بھی کی تو وہ ہندو بیوپاری کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ جن کا قبضہ بازار پر سینکڑوں برس سے ہے اور وہ تعداد میں بھی لاہوری تاجر زیورات سے ہزار گنا ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تجارت اور صنعت الگ الگ ذہن اور استعداد چاہتی ہیں۔ لاہوری صناع سے تجارت کی توقع ظلم ہوگا۔ لیکن یہ توقع بے جا نہیں ہے کہ لاہوری برادری کے صاحب ثروت لوگ جو سادہ کاری نہ کرتے ہوں، اپنے کام کی تجارت پر دھیان دیں۔ انھیں اپنی قوم کی حمایت مفت میں حاصل ہے۔ لاہوری کاریگر، لاہوری تاجر بیوپاری کو اپنا مال کیوں نہ دے گا۔ اگر اس کو وہی آسانیاں

ملیں جو ہندو سیٹھ سے ملتی ہیں؟ لاہوری برادری کے لوگ اپنے مشترکہ سرمایہ سے زیورات کی تجارت کا ایک مرکز بنا سکیں۔ اور زیادہ سے زیادہ لاہوری کاریگر اس مرکز سے متعلق ہو جائیں تو تجارتی منافع دوسروں کے پاس نہ جائے۔ کاریگر کی شرح اُجرت بھی بڑھ جائے اور قومی خوش حالی میں ترقی ہو۔ لاہوری قوم کو ایسی منظم تجارتی کوشش سے ہندو بازار کی مخالفت کے جو اندیشے ہیں اُن سے ہم بے خبر نہیں ہیں۔ لیکن اگر اچھی طرح زندہ رہنا ہے تو اِن سب اندیشوں اور رکاوٹوں کو مسلسل جد و جہد سے دور کرنا ہی ہوگا۔ صنعت کے محض اجرتی منافع سے لاہوری قوم کبھی خوش حال قوم نہیں بن سکتی، حالانکہ اس عجیب بڑی صنعت کی مالک قوم کا قدرتی حق یہ ہے کہ وہ اچھی طرح زندگی گذارے

لاہوریوں کی توجہ زیورات کی تجارت کی طرف

ہمیں خوشی ہے کہ لاہوری برادری کی طرف سے اُس میدان میں کچھ قدم اُٹھائے گئے ہیں۔ ہندوؤں کی بہت سی کروڑپتی فرموں کے بیچ میں دو ایک دوکانیں زیورات کی تجارت کی ایسی نظر آتی ہیں جن کے مالک لاہوری ہیں۔ کچھ کاریگروں نے انفرادی کوشش بھی شروع کر رکھی ہے۔ وہ مال بنا کر بیوپاری کو دیتے ہیں۔ مگر کبھی طور پر براہِ راست گاہک تک بھی مال پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے گاہک کو کچھ بچت ہوتی ہے اور کاریگر کو وہ نفع بچ رہتا ہے جو درمیانی آدمی لے لیتا تھا۔ یہ تاجر سادہ کار (Manufacturing Jewlers) نیک فالی کی علامت ہے۔ دیانت داری سے کوششیں جاری رہیں تو گاہک اور کاریگر کے بیچ میں وہ روایتی مشکل جس کا نام "بازار پر ہندو قبضہ" ہے۔ رفتہ رفتہ کم ہو جائے گی۔ ہندو جوہری اگر ایک لاکھ روپیہ ماہوار کما سکے گا تو لاہوری تاجرِ زیور یا تاجرِ سادہ کار ایک ہزار تو کما سکے گا۔

ختم کلام

اب ہم لاہوری برادری پر ایک آخری نگاہ ڈالتے ہیں۔ جیسے ایک سیاح

شاہی عمارتوں کے کھنڈرات کو دیکھ کر واپس ہو رہا ہو۔ اور چلتے چلتے مڑ کر ایک بار پھر اُن کھنڈرات کی طرف دیکھے

لاہوریوں کا سب سے اہم مسئلہ تعلیم

اس آخری نگاہ کے ساتھ ہم لاہوری برادری کے متعلق ایک نہایت اہم بات کو کہتے ہیں۔ وہ بات اس برادری کی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ لاہوری برادری کی معلومات کی فراہمی کے سلسلے میں ہم بعض لاہوری بزرگوں اور ذمے دار لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اکثر کو پایا کہ وہ اپنی برادری کی طرف سے مایوس ہیں، اور ایسا محسوس کرتے ہیں کہ لاہوری برادری کی خرابیوں کا علاج ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً چودھری حاجی حبیب احمد صاحب سادہ کار نے فرمایا ——— "لاہوری قوم پر آپ کوئی مضمون لکھنا چاہتے ہیں؟ تو بس لکھ دیجئے گا۔ "یہ دہلی کی ایک قوم ہے جو صبح سے شام تک سونے چاندی سے کھیلتی ہے۔ لیکن سونے سے جاگنا نہیں چاہتی۔ یہ قوم رشک، حسد اور ایک دوسرے کی برائی میں مبتلا ہے اور اب شاید موت کی نیند سونا چاہتی ہے ———"

بے شک وہ برادری جو زبردست تاریخی روایات کی حامل ہو، اب پستی کی حالت میں ہے، یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے۔ حاجی صاحب کی اس بات میں ضرور طنز پوشیدہ ہے لیکن سچ مچ لاہوری بہ حیثیت مجموعی زبوں حال ہیں۔ ان میں وہ سب آثار پائے جاتے ہیں جو ایک فنا پزیر گروہ میں ہوتے ہیں۔ وہی جمود اور بے خبری، وہی بزرگوں کے کارناموں پر فخر اور خود کچھ نہ ہونا، وہی صرف ذاتی فائدے کی ہوس اور دوسرے کے نقصان سے بے پروائی۔ وہی عزیزوں سے بے گانگی کا سلوک، وہی ہزاروں گندریوں میں ایک کے گندھے پ[illegible] اور بہت سی جھونپڑیوں کے بیچ میں ایک اونچی شاندار کوٹھی۔ لیکن لاہوری قوم کی ہر خرابی کا سبب تعلیم سے بے گانگی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ لاہوریوں کو تعلیم کا شوق نہیں یا وہ تعلیم کے فائدوں سے بے خبر ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تعلیم کے بارے میں صحیح رہنمائی کے نہ ہونے سے وہ تعلیم سے خوف زدہ ہیں۔ وہ ہر قدم پر تعلیم کی ضرورت محسوس

کرتے ہیں۔ لیکن اپنے نوجوانوں کی تعلیم کے نتائج غلط دیکھتے ہیں اس لئے وہ تعلیم سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔

لاہوریوں کی تعلیمی دقتیں

لڑکا میٹرک کرکے کام سیکھنے کی عمر کھو دیتا ہے۔ سیکھنے کی گنجائش بھی ہو تو وہ کام کو حقیر جانتا ہے۔ وہ ملازمت کو پسند کرتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے یہ تعلیم کا نہیں، نظام تعلیم کا قصور ہے۔ لاہوریوں کی بڑی تعداد اس لئے بھی بچوں کو تعلیم سے محروم رکھتی ہے کہ اس سے دہرا مالی نقصان ہوتا ہے۔ ایک تعلیم کا خرچ، دوسرے اس آمدنی کا نقصان جو بچہ کام سیکھنے کے دوران میں ماں باپ کو لاکر دیتا ہے۔ خرچ کی یہ تکلیف غریب طبقے کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ لیکن بات تو ذمے دار جاننے والوں کے سوچنے کی ہے کہ وہ تعلیم کا کوئی ایسا ڈھنگ بتائیں جس میں اس صنعت پیشہ قوم کی ضرورتوں کی رعایت رکھی گئی ہو، جس سے لڑکا پڑھ لکھ بھی جائے اور قومی صنعت کو فروغ بھی حاصل ہو اور اس طریقے میں غریب بچوں کے لئے بھی کوئی تدبیر کی گئی ہو۔ یہ سب باتیں اُن کو سوچنے دیجئے، جن کا یہ کام ہے۔ لیکن لاہوریوں کے ذمے یہ فرض رہ جاتا ہے کہ وہ برادری کو تعلیم کے لئے تیار کریں، جو نہ جانتے ہوں انھیں تعلیم کا فائدہ سمجھائیں۔ جواب تو سوال ہی پر ملے گا۔ لاہوریوں میں کچھ صاحب ہمت نوجوان اُٹھیں اور جاننے والوں سے تعلیم کی مشکل کا حل پوچھیں اور پھر اس حل کے مطابق کام کریں۔ یہ کام برادری کے کچھ ایثار پیشہ خادم بھی مانگتا ہے۔ کٹھن کام ہے۔ زندگیاں اس میں ختم ہو جاتی ہیں تب خدمت کہیں پھل لاتی ہے۔ چند زندگیوں کی قربانی ہزاروں زندگیوں پر بہار لے آئے گی۔ قوم پڑھ لکھ جائے تو دوسری سب کمزوریاں اپنے آپ دور ہو جائیں۔ قوم جب تک پڑھی لکھی نہ ہو ساری اصلاحی کوششیں اور ترقی کی تجویزوں کا وعظ بیکار ہے۔ زمین جب تک جھاڑیوں اور پتھروں سے صاف کرکے پانی سے نرم نہ کرلی جائے اس میں بیج بونا بیج کو ضائع کرنا ہے۔

لاہوری قوم کی اصلاحی کوششیں کیوں بےکار گئیں

لاہوری قوم کو جگانے اور ترقی پر مائل کرنے کی اس سے پہلے کئی انفرادی اور اجتماعی کوششیں ہو چکی ہیں۔ لیکن وہ سب بےکار گئیں اور یاد رہے جب تک قوم پڑھ لکھ نہ جائے وہ کوئی بات سن سکتی ہے نہ سمجھ سکتی ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ہم حوالے کے لئے اس جگہ ترقی و اصلاح کی گذشتہ کوششوں کا ذکر کر دیں

اصلاحی کوششوں کا ریکارڈ

۱۹۱۲ء۔ انجمن قوم لاہوریاں قائم ہوئی۔ انجمن کے صدر نیاز الدین صاحب تھے۔ قواعد انجمن حافظ عبدالستار صاحب نے چھاپ کر شائع کئے۔ اس میں اغراض و مقاصد "ترقی ہر قسم" بیان کئے گئے ہیں۔ اور ترقی کے لئے "تدبیر صرف" جلسے اور تقریر اور مضامین" قرار پائے

۱۹۲۱ء۔ نثار احمد صاحب نے دعوتِ قوم کے نام سے ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں قوم سے دردناک اپیل کی کہ تم لوگ خوابِ غفلت میں ہو۔ اور قومی ترقی کے لئے ایک ماہوار رسالہ شائع کرنے کی تجویز پر قوم لاہوریاں سے رائے مانگی۔ شاید قوم نے تائید نہیں کی، کیونکہ رسالہ نہیں نکلا۔ نثار احمد صاحب اب بمبئی میں حکیم اکرامی کے لقب سے طبیب ہیں۔ اور پرجوش کانگرسی کارکن ہیں۔ افسوس ہے وہ اپنی برادری کی تنگ نلئے کو خدمت کے لئے ناکافی سمجھ کر کانگریس کے وسیع تر سمندر میں نکل گئے۔

۱۹۲۶ء۔ انجمن خدام قوم لاہوریاں قائم ہوئی۔ اسے ۱۹۱۲ء کی انجمن قوم لاہوریاں کا نیا چولا سمجھئے۔ اس کے سکریٹری رضی الدین احمد صاحب خلف نیاز الدین صاحب تھے انھوں نے بھی اس نئی انجمن کے قواعد و ضوابط چھاپ کر شائع کر دئے جو ۱۹۱۲ء والی انجمن کے نسخہ سے مشابہ تھے۔

۱۹۲۶ء۔ قوم لاہوریاں کا پہلا عام جلسہ ثناء اللہ خاں صاحب کے کارخانے واقع پہاڑ گنج
میں ہوا۔ اس کا ایجنڈا ہمارے سامنے ہے جس میں ساری کارروائی شادی بیاہ
اور غمی کی خرچیلی رسموں کو روکنے کی تجویزوں پر مشتمل ہے۔

۱۹۳۲ء۔ ۱۹۲۶ء میں جو انجمن نئے سرے سے قائم ہوئی تھی اس کے سکریٹری رضی الدین احمد صاحب
نے ایک سہ ماہی رسالہ خادم قوم نکالا ۔ دے کر تحریر برد تقریری ایک ایک تدبیر انجمن نے
اصلاح و ترقی قوم کے لئے سوچی تھی۔ اس تدبیر کو بروئے کار لانے کے لئے یہ رسالہ
جاری کیا گیا تھا جس کے صرف ۳ نمبر ہماری معلومات کے مطابق نکل سکے تو ۱۹۳۲ء
کی اشاعت میں کچھ کارآمد مضامین ملتے ہیں۔ اس کے ایک [illegible] میں لاہوریوں کے
صنعتی زوال کا سبب تعلیمات قرآنی کے چھوڑ دینے کو ٹھیرایا گیا ہے۔ ایک مضمون
میں یہ دلچسپ بحث ہے کہ سادہ کار بے پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے کس طرح ہندو
بیوپاری سے دھوکا کھاتا ہے۔

ایک مضمون میں تعلیمی مشورہ یوں دیا گیا ہے کہ لڑکا پہلے میٹرک پاس کرے۔ پھر
سادہ کاری سیکھے۔ انجمن کی سالانہ رپورٹ کا خلاصہ سکریٹری کی طرف سے اسی نمبر میں
شائع ہوا ہے جس کا ایک قابل حوالہ نوٹ یہ ہے کہ ایک تجویز منظور کی گئی کہ قوم
لاہوریاں کی تاریخ مرتب کی جائے اور منتظمہ کمیٹی اس تاریخ کے لئے مواد فراہم کرے۔

۱۹۴۲ء۔ پہاڑ گنج کے چند حوصلہ مند روشن خیال نوجوانوں نے ایک ہنگامی جلسہ کرکے قومی
اصلاح و ترقی کی تعمیری تجاویز مرتب کرنی چاہئیں
افسوس ہے بعض وجوہ سے یہ تجاویز بن ہی نہ سکیں۔

مندرجہ بالا سب کارروائیاں لاہوریوں کی اضطراری حرکات ہیں اور کسی اندرونی
خلش کا پتہ دیتی ہیں۔ دلوں میں کام کی اُمنگ، اور ترقی کی تڑپ ضرور موجود ہے لیکن بیماری

کی تشخیص میں اب تک چوک ہوتی رہی، اس لئے تجویزیں بھی وعظ اور ادبی تقریروں پر مشتمل رہیں — ہم پھر دہراتے ہیں:۔
بیماری کا سبب صحیح تعلیم کا نہ ہونا ہے۔ اس کا انتظام کیجیے اور یقین کیجیے کہ لاہوری برادری اپنی پچھلی اونچی سطح پر پہنچ جائے گی۔
تعلیم کے سردست دو طرح کے انتظام ہوں گے ایک بڑی عمر کے بے پڑھے یا کم پڑھے لکھوں کے لئے انتظام۔ دوسرے برادری کے بچوں کے لئے خاص قسم کے اسکول۔ یہ اسکول تعلیم کا کام کرنے والے ماہروں کے بتائے ہوئے طریقوں اور نصاب کے مطابق ہوں گے۔
ہم لاہوریوں کی تعلیم کے انتظام کے لئے، کہ یہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے پر امید نگاہوں سے نوجوانوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ یقین ہے کہ لاہوری نوجوان اب اپنی قوم کے لئے اٹھیں گے —— خدا کرے عزم اور استقلال ان نوجوانوں کا رہبر ہو۔

(باقی)

رجز

رن کو شمشان بنادوں میں بہ فیض شمشیر　　زد میں آئے تو نہ چھوٹے کبھی میرا نخچیر
کس کی طاقت کہ مرے پاؤں میں ڈالے زنجیر　　میرے ہر فعل سے خود بنتی ہے میری تقدیر

میں بہادر ہوں رضامند ہے یزداں مجھ سے!

میری فطرت کو نہیں راس غلامی کی ہوا　　نام آزادی پہ ہوں روز ازل ہی سے فدا
سطوتِ ملکِ سلیماں سے ڈرے میری بلا　　ہو بے مایہ سہی ہمتیں میری ہیں سوا

میں بہادر ہوں در زنداں ہے لرزاں مجھ سے!

میرے اشعار، مرا زخمہ، مرا ساز جواں　　آتشِ قلب سے دہکی ہوئی آواز جواں
میرے رہوار جواں سال کے انداز جواں　　میری تلوار، مری مونس و دمساز جواں

میں بہادر ہوں، جوانی ہے پرافشاں مجھ سے

میں وطن دوست ہوں لیکن نہیں انساں دشمن　　میرا دل شیشۂ نازک، میں سراپا آہن
امن عالم کا میں پیغامبرِ ظلم شکن　　عدل و انصاف کا باقی ہے مرے دم سے چلن

میں بہادر ہوں، یہ دنیا ہے گلستاں مجھ سے

میرے مذہب میں ہے عصمت کی حفاظت داخل　　میرے مسلک میں ہے طفلی سے محبت داخل
میرے مشرب میں ہے پیری کی حفاظت داخل　　ہے مرے کیش میں انسانی اخوت داخل

میں بہادر ہوں، عزازیل ہے نالاں مجھ سے

زیست کو رزم میں ہر بار سجایا میں نے　　موت کو رزم میں ہر بار ہرایا میں نے
زیست کے شوق کو ہر دل میں بڑھایا میں نے　　موت کے خوف کو ہر دل سے مٹایا میں نے

میں بہادر ہوں، اجل خود ہے گریزاں مجھ سے

سلیمان اریب

حالاتِ حاضرہ

شروع مئی میں یورپ کی جنگ ختم ہوئی اور اب آخر میں متحدہ قوموں کی کانفرنس نے اپنا کام سرانجام کیا۔ یہ کارپردازی بہت قابلِ تعریف ہے، خاص طور پر ان قوموں کے لئے جن کے متعلق جنگ سے پہلے تک مشہور تھا کہ وہ کسی معاملے کو طے کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں۔ کانفرنس کی کامیابی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ روس نے مختلف فیہ مسائل سے بحث بہت کم کی۔ اور دوسرا سبب یہ تھا کہ اس نے ان قوموں کی سرداری تسلیم کر لی جن کی قوت اور مستعدی کی بدولت اٹلی اور پھر جرمنی کو شکست دی جا سکی یا جنھوں نے جنگ میں بہت نقصان اُٹھایا تھا چین کو سرداری کا مرتبہ اس استقلال کے حصہ میں ملا ہے جس سے اس نے جاپان کا مقابلہ کیا۔ فرانس کو یہ مرتبہ اصولاً تو نہیں ملنا چاہیے تھا، لیکن مصلحت اسی میں تھی کہ اس کی عزت افزائی کی جائے۔ متحدہ قوموں نے اس بات کو بغیر بحث کے مان لیا کہ متحدہ ریاستیں برطانیہ، روس، فرانس اور چین سیاست کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھیں گے۔ غور اس بات پر کیا گیا کہ ان کے ساتھ کتنی اور ریاستوں کو شریک کیا جائے اور انھیں کتنا اختیار دیا جائے۔ پولینڈ کے مسئلے پر زیادہ اختلاف ہونے لگا تو کانفرنس نے اصرار نہیں کیا کہ اسی کا فیصلہ صحیح مانا جائے، بلکہ جھگڑا چکانے کا کام متحدہ ریاستوں، برطانیہ اور روس کے سپرد کر دیا۔ کانفرنس پولینڈ یا اس قسم کے اور معاملات میں اُلجھ جاتی تو اس کا اصل کام رہ جاتا، اور اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ متحدہ قومیں ایک بنیادی حق سے دست بردار ہو گئیں مگر اس دست برداری کی پشت پر بڑی مصلحتیں تھیں جن کی اہمیت اب ظاہر ہو رہی ہے۔

سین فرنسسکو میں نئے بین اقوامی نظام کا دستور مرتب ہو گیا ہے۔ یہ نظام ایک حفاظتی کاؤنسل، ایک معاشی و معاشرتی کمیٹی، ایک مجلس تولیت۔ ایک بین اقوامی عدالت

اور ایک دفتر پر مشتمل ہوگا۔ مجلس عامہ میں متحدہ قوموں میں سے ہر ایک کو ایک نشست حاصل ہوگی۔ لیکن چونکہ مجلس کا مقصد قوموں کے اتحادِ عمل کو فروغ دینا ہوگا، اس لئے ہر قوم مجلس میں پانچ نمائندے تک بھیج سکے گی۔ اس طرح مجلس کی بحثوں میں شریک ہونے والوں کی تعداد ڈھائی سو تک ہو سکتی ہے۔ مجلس کا طریق کار ویسا ہی ہوگا جیسا کہ قانون ساز جماعتوں کا ہوتا ہے۔ اس کا مقررہ مدت تک سالانہ اجلاس ہوگا اور وہ تمام مسائل پر بحث کر سکے گی۔ اور رائے دے سکے گی سوائے اُن معاملات کے جن پر کہ حفاظتی کاؤنسل، ان حقوق اور اختیارات کے مطابق جو اُسے دستور میں عطا کئے گئے ہیں غور کر رہی ہو۔ بین اقوامی اتحادِ عمل کا ذریعہ اور نمونہ یہی مجلس ہوگی، اور سوائے اِن جھگڑوں کے جس کا نتیجہ جنگ ہو سکتی ہے اور ان معاملات کے کہ جن میں حفاظتی کاؤنسل کے مستقل اراکین میں سے کسی ایک کی بڑی غرض یا مصلحت مانع ہو، وہ ہر مسئلے پر بحث کر سکے گی اور رائے دے سکے گی۔ حفاظتی کاؤنسل کے اصل منصب میں اقوامی امن قائم رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے کوئی خطرہ پیدا ہو تو وہ اس کا تدارک کرے گی۔ جھگڑے چکائے گی اور جنگ چھڑنے کا اندیشہ ہو تو ہر قوم سے مقررہ امداد طلب کرے گی۔ اس کی حیثیت ایک کابینہ کی سی نہ ہوگی جو قانون ساز مجلس کی رہنمائی کرتی ہے، تجاویز پیش کرتی ہے اور مجلس سے انھیں منظور کراتی ہے۔ اس قیام میں بیشتر یہی مدنظر ہے کہ اس کے مستقل اراکین، جو اپنی قوت کے مناسب حقوق رکھتے ہیں، اپنے حقوق کو محفوظ رکھ سکیں، قوت کا موجودہ توازن نہ بدلنے پائے اور سیاست میں کوئی ایسا انقلاب نہ ہونے پائے جو دنیا کو پھر جنگ میں مبتلا کر دے۔ حفاظتی کاؤنسل کے مستقل اراکین بے غرض ہونے کا دعوے نہیں کرتے، ان کی امن پسندی کے ساتھ جو شرطیں لگی ہوئی ہیں ان کا اندازہ اس رویّے سے کیا جا سکتا ہے جو حال میں فرانس نے شام اور لبنان میں اختیار کیا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ فرانس کے سوا باقی سب مطمئن ہیں، یعنی ان کا فائدہ اس میں ہے کہ امن قائم رہے اور انھیں بے فکری کی

اپنے تعمیری کاموں میں لگ جانے کا موقع ملے۔ فرانس کی بے اطمینانی کا سبب یہ ہے کہ اُسے اپنے دوستوں سے اندیشہ ہے کہ وہ اصولی بحث اور اخلاقی تلقین کرتے کرتے ہم کا حق مار لیں گے اور ان مقبوضات کو آزاد کرا دیں گے جنھیں قابو میں رکھنے کی طاقت فرانس اب تک پیدا نہیں کر سکا ہے۔ مگر فرانس کو بھی بہت جلد اطمینان ہو جائے گا اور تب یہ کہا جا سکے گا کہ حفاظتی کاونسل کا کوئی رُکن ایسا نہیں ہے جو طاقت کا بے جا استعمال کرے۔ بہرحال نئے بین اقوامی دستور کے مطابق حفاظتی کاونسل ان اغراض کی نمائندگی کرے گی جو اس وقت دنیا پر حاوی ہیں اور ہمیں یہ یقین کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ ان اغراض کا پورا ہونا حفاظتی کاونسل کے مستقل اراکین کے لئے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے مفید ہوگا۔ اس دعوت کو سین فرین سسکو کانفرنس میں رد کرنے کی کچھ تحریک ہوئی، مگر پھر یہی مناسب سمجھا گیا کہ اسے قبول کیا جائے جب تک کہ اُسے رد کرنے کے لئے کافی دلیلیں پیدا نہ ہو جائیں۔

مجلس تولیت کے متعلق بحث شروع ہوئی تو اس کی کچھ امید تھی کہ سین فرین سسکو کانفرنس قومی آزادی کے اصول کی حمایت کرے گی، اور اس کا مطالبہ کرے گی کہ دنیا کی ہر قوم آزاد کر دی جائے۔ برطانیہ نے پہلے ہی اس کا اعلان کر دیا تھا کہ کانفرنس کو اس کی نوآبادیوں اور مقبوضات کے متعلق بحث کرنے کا اختیار نہ ہوگا اور ہندوستان کی طرف سے تین نمائندے یہ کہنے کے لئے پہنچ گئے کہ ہم جتنی آزادی چاہتے ہیں وہ ہمیں حاصل ہے تو کانفرنس ہندوستان کے سرکاری نمائندوں کے بجائے مسز پنڈت کو جلسوں میں کیسے شریک کر سکتی تھی۔ ہندوستان کا معاملہ اس طرح طے ہو گیا تو برہما، ملایا، جزائر مشرقی ہند وغیرہ کا سوال کون اُٹھاتا۔ اس کے علاوہ متحدہ ریاستوں نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ انھیں بحر الکاہل کے ان تمام جزیروں کا متولی اور حق دار حاکم تسلیم کیا جائے جن پر قبضہ رکھنا دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اس سلسلے میں تولیت کے بارے

میں ریزولیوشن منظور ہوئے اور مجلس تولیت قائم ہوئی جو ایسے علاقوں کی نگرانی کرے گی جن پر متحدہ ریاستوں یا متحدہ قوموں میں سے کسی اور کو قبضہ کرنے کا حق دیا گیا ہے یا دیا جائے گا۔ بظاہر تو وہ ریاستیں جو متولی مقرر ہوئی ہیں اس کی پابند ہیں کہ ماتحت آبادی کی خوش حالی اور ترقی کا ہر طرح سے انتظام کریں اور اس کی کوشش کریں کہ وہ جلد آزاد اور خود مختار ہونے کے قابل بن جائیں۔ لیکن مجلس تولیت شاید کبھی یہ طے نہ کر سکے گی کہ کس متولی نے اپنے فرائض جیسا کہ چاہیئے انجام دئے ہیں اور کس نے ایسا نہیں کیا۔

بین اقوامی نظام کے باقی تین ادارے، معاشی و معاشرتی مسائل کی کمیٹی، بین اقوامی عدالت اور بین اقوامی دفتر، تینوں بہت مفید ثابت ہوں گے، اور غالباً ان کی کارگزاری سب سے زیادہ اہم ہوگی۔ بین اقوامی لیگ نے جو تہذیبی خدمات انجام دیں وہ اس کی کارگزاری کا سب سے روشن پہلو تھیں، اور اس مرتبہ بھی بین الاقوامی اتحاد کے کارناموں کا میدان دنیا کی معاشرت اور تہذیب ہوگی۔

نئے بین الاقوامی دستور میں سیاسی مصلحتوں کا جو لحاظ کیا گیا ہے اس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ اسی کی ایک شکل یہ ہے کہ ایسی ریاستیں جو ایک براعظم میں ہیں یا جن کی معاشی اور سیاسی زندگی اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اپنے خطے کی الگ تنظیم مشترکہ طور پر کر سکتی ہیں۔ البتہ یہ تنظیم بین اقوامی نظام کے ماتحت اور بین اقوامی دستور کے اصولوں کے مطابق ہوگی۔ ایسی تنظیم کے حق کا مطالبہ جنوبی امریکہ کی ریاستوں نے کیا، اور وہی اپنے مطالبے کو حق بجانب ثابت کر سکتی تھیں۔ لیکن اب ایسی تنظیم کا حق عام ہو گیا ہے، اور کوئی تعجب نہ ہوگا اگر برطانیہ اس کی بنا پر اپنی اور نوآبادیوں اور ہندوستان کی تنظیم الگ کرنا چاہے اور روس سلاف ملکوں کی تنظیم الگ، اور اس تنظیم کی پشت پر اتحاد عمل کے فائدے ہی نہ ہوں بلکہ طاقت وروں کی مصلحت۔

جون کے واقعات میں سب سے اہم یہی بات ہو کہ بین الاقوامی نظام کا دستور بن گیا

دلچسپی اور مسائل سے بھی ہو سکتی ہے ۔ امریکیوں نے جزیرہ اوکنیاوا فتح کر لیا ہے ، اگرچہ اس میں اُن کے بہت سے سپاہی اور شاید جہاز بھی ضائع ہوئے ۔ اب جنرل میک آرتھر خاص جاپان کے جزیروں میں کہیں پر فوج اُتارنے کی تدبیریں کر رہے ہوں گے ۔ انگریزوں کا تقریباً پورے برہما پر قبضہ ہو گیا ہے اور کسی دن بھی یہ خبر آ سکتی ہے کہ اُنھوں نے سنگاپور پر حملہ کر دیا ہے ۔ شام اور لبنان کے معاملے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا ہے فرانسیسی ایک طرف انگریزوں پر الزام لگاتے ہیں کہ اُنھوں نے شام اور لبنان کی آبادی کو بغاوت پر آمادہ کیا ، دوسری طرف یہ کہتے ہیں کہ ہم برطانیہ کے ساتھ اتحاد عمل کرنا چاہتے ہیں اور کریں گے ۔ برطانوی سیاست نے شام میں بازی جیتی اور بڑی نیک نامی کے ساتھ جیتی ہے ۔ فرانسیسیوں کی یہ کوشش بھی کہ شام اور لبنان کے عیسائیوں اور مسلمانوں میں فساد ہو جائے بے سود رہی ۔ لیکن کوئی تین ہفتے ہوئے برطانیہ کے اخبار "اکونومسٹ" نے لکھا تھا کہ برطانیہ کو زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے ، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو شیشے کے گھر میں رہتے ہوں ، پتھر پھینکنے کی عادت نہ ڈالنا چاہیے ۔

"مولانا شبلی کا مرتبہ اُردو ادب میں"

مولانا شبلی کے بارے میں اس سے پہلے بھی چند کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں مولانا کی مختلف حیثیتوں کو نمایاں کیا گیا ہے در اصل مولانا جامع حیثیات تھے اور ان کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔

یہ کتاب مولانا شبلی کی اردو خدمات کی محض ایک تاریخ نہیں ہے مولف نے فن تنقید و تبصرہ کے موجودہ رجحانات کو سامنے رکھ کر مولانا کے نظم و نثر پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ مصنف کے قلم میں سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ پختگی اور جان ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور پروفیسر آل احمد صاحب سرور کے دیباچوں نے کتاب کی قدر و قیمت اور اہمیت کو اور نمایاں کر دیا ہے۔

کتاب مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳ روپے غیر مجلد

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ، دہلی قرول باغ

رجسٹرڈ نمبر ایل ۸۹۰۳

مطبوعات جامعہ

مکتبہ جامعہ کی مندرجہ ذیل کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع ہو گئے ہیں

تاجران کتب درسی بابت شرائط طلب فرما سکتے ہیں۔

کتاب	قیمت
پردۂ غفلت	عمر
انشاء کی تعلیم	عہ
انتخاب میر	عہ
ہمارے نبی	ہر
ارکان اسلام	ہر
عقائد اسلام	ہر
نبیوں کے قصے	۱۰ر
ہمارے رسول	۱۰ر
سرکار دو عالم	عمر
خلفاء اربعہ	عمر
رسول پاک	عہ
مقناطیس کی کہانی	۸ر
ننھی مرغابی	۸ر
چنٹو منٹو	۸ر
دو بھائی	۸ر

کتاب	قیمت
شریر لڑکا	۸ر
تانبیل خاں	ہر
دنیا کے بسنے والے	۱۰ر
تاریخ ہند کی کہانیاں اول	۸ر
" " " دوم	۸ر
ہندوستانی کی پہلی کتاب	۸ر

ادارہ تعلیم وترقی کی کتابیں۔

کتاب	قیمت
صحابۂ کرام نمبر ۲	ہر
حالات قرآن مجید	ہر
نصیب خاں حجام	ہر
مہاتما گوتم بدھ	ہر
پہیلیاں	ہر
رام کہانی اول	ہر
" دوم	ہر
گلستاں	ہر
نماز	ہر
ہم بھی پڑھتے	ہر
غزلیں	ہر
تعلیمات قرآن مجید (اخلاق)	ہر
پیارے خاں درزی	ہر
جمن بڑھئی	ہر
عمر فاروق	ہر
عبدالرحمٰن راج	ہر
گل بکاؤلی	ہر
قصہ چار درویش	ہر
خط کتابت	ہر
بدھو حلوائی	ہر
حنیف خانساماں	ہر
میر انشا	ہر
[illegible]	ہر

مکتبہ جامعہ

دہلی - نئی دہلی - لاہور - لکھنؤ - بمبئی

جنگ اور ہندستان کی مالیاتِ عامہ

ایک زمانہ تھا جب معاشی اور معاشرتی معاملات میں حکومت کی کم ترین مداخلت کو بہترین پالیسی سمجھا جاتا تھا، لیکن اب اس کے خلاف ملک و قوم کی مجموعی ترقی، آئندہ نسلوں کی بہبودی اور معاشرتی انصاف کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے حکومت کی [illegible] سے زیادہ مداخلت کو پسندیدہ سمجھا جانے لگا ہے۔ اس لئے اب یہ سوال اہم ہوتا جا رہا ہے کہ ان کثیر ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے جن کی روز بروز حکومت سے زیادہ توقع کی جا رہی ہے روپیہ کہاں سے حاصل کیا جائے۔

لوگ حکومت سے جبریہ تعلیم کا مطالبہ کرتے ہیں اور تعلیم کے کم ترین معیار کو روز بروز بڑھاتے جا رہے ہیں۔ لوگ حکومت سے حفظانِ صحت، علاج و معالجہ، نگہداشت اطفال خدماتِ زچگی کے بہترین حالات فراہم کرنے کی توقع رکھتے ہیں بے روزگاری کے بیمہ اور دیگر بے شمار خدمات کے خواہش مند ہیں۔ لیکن ان سب کو حکومت کیسے فراہم کرے۔ ان کے لیے سامان اور آدمی کیسے اکٹھا کرے۔ ان سب کاموں کے لئے روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ حکومتوں کا ذریعہ آمدنی ان کی رعایا ہوتی ہے۔ لیکن اسے محصول کی ادائی شاق گذرتی ہے۔ غرض ایک طرف خدمات کا زیادہ سے زیادہ مطالبہ اور دوسری طرف محاصل ادا کرنے کی کم سے کم آمادگی ــــ یہ متضاد کشمکش ہے جس میں حکومتوں کو مبتلا رہنا پڑتا ہے۔

لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہی حکومتیں جو امن کے زمانے میں تھوڑی سی [illegible] کو قبول کرنے سے ہچکچاتی تھیں جنگ کے زمانے میں بڑے بڑے معاشی پروگرام [illegible] ہیں اور ان کی طرح رعایا جو امن کے زمانے میں محصول کے تھوڑے سے [illegible] تھی، جنگ کے زمانے میں محصول کے بڑے سے بڑے بوجھ کو کسی [illegible]

وجہ سے ہندوستان کو کرنا پڑا۔
اس زائد خرچ کا سب سے بڑا حصہ مدافعت پر صرف کیا گیا۔ چنانچہ مدافعت کا خرچ جو ۱۹۳۹-۴۰ء میں ۴۶ کروڑ ۱۸ لاکھ تھا ۱۹۴۴-۴۵ء میں تین ارب ۹۷ کروڑ ۲۳ لاکھ ہو گیا تھا یعنی آٹھ گنا بڑھ گیا تھا۔ خرچ کی سال بہ سال تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

جنگ سے قبل :-

۱۹۳۹-۴۰ء .. .. .. ۴۶ کروڑ ۱۸ لاکھ روپے

جنگ کے زمانے میں :-

۱۹۳۹-۴۰ء .. .. .. ۴۹ کروڑ ۵۴ لاکھ روپے
۱۹۴۰-۴۱ء .. .. .. ۷۳ کروڑ ۶۱ لاکھ روپے
۱۹۴۱-۴۲ء .. .. .. ایک ارب ۳ کروڑ ۹۳ لاکھ روپے
۱۹۴۲-۴۳ء .. .. .. دو ارب ۱۴ کروڑ ۶۲ لاکھ روپے
۱۹۴۳-۴۴ء .. .. .. تین ارب ۵۸ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے
۱۹۴۴-۴۵ء .. .. .. تین ارب ۹۷ کروڑ ۲۳ لاکھ روپے

میزان .. .. .. گیارہ ارب ۹۷ کروڑ ۳۳ لاکھ روپے

جو اس حساب سے یورپ کی جنگ کے زمانے کا مجموعی خرچ گیارہ ارب ۹۷ کروڑ ہوتا ہے۔ اگر جنگ سے قبل کی بنیاد پر ان سالوں کے خرچ کا تخمینہ کیا جائے تو اس کی میزان صرف دو ارب ۷۷ کروڑ ہوگی۔

مدافعت کے خرچ کا انتہائی نقطہ عروج ۱۹۴۴-۴۵ء کو سمجھنا چاہئے کیونکہ ۱۹۴۵-۴۶ء کے لئے جو تخمینہ تیار کیا گیا ہے اس میں مدافعت کے مصارف صرف تین ارب ۹۴ کروڑ رکھے گئے ہیں گویا سال ماقبل سے یہ بقدر تین کروڑ کے کم ہیں۔
لیکن ہندوستان کے بہی کھاتوں میں مدافعت کے جو مصارف درج ہیں وہ پیش نظر

ہوجاتے بلکہ اس سے بہت زیادہ ہیں۔ اس زیادتی کا سبب یہ ہے کہ حکومتِ ہند نے مدافعت کے سلسلے میں بہت سے مزید مصارف ایسے کئے ہیں جنھیں بعد میں برطانیہ کی حکومت سے یا دیگر اتحادی حکومتوں سے وصول کیا جاسکے گا۔ چنانچہ ان مصارف کو ہندوستان کے بیزانیہ میں نہیں دکھایا جاتا۔

برطانیہ کی حکومت سے جو رقم واجب الوصول ہے اس کا بیشتر حصہ وہ ہے جس کا حکومتِ ہند ۱۹۳۹ء کے "مالیاتی سمجھوتے" کی بنیاد پر برطانیہ کی حکومت سے مطالبہ کرسکتی ہے۔ مالیاتی سمجھوتے کا خلاصہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ اس کی رو سے حکومتِ ہند نے مدافعت کے صرف ان مصارف کی ذمہ داری قبول کی ہے جو ہندوستان کی مدافعت کے لئے براہِ راست ضروری ہیں۔ لیکن جہاں ہندوستان کی فوج کو ہندوستان سے باہر شہنشاہی مفاد کے تحفظ کے لئے استعمال کیا گیا ہے وہاں جتنے مزید مصارف ہوئے ہیں ان کی ذمہ داری برطانیہ کی حکومت کو اٹھانا پڑے گی۔

آئیے اب اس سمجھوتے کی بنیاد پر ہندوستان کی مدافعت کے خرچ کا تجزیہ کریں۔ اس کی تفصیلات ذیل کے جدول میں درج کی گئی ہیں:۔

سال	مدافعت کا مجموعی خرچ	حکومتِ ہند کا حصہ	حکومتِ برطانیہ کا حصہ
سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء	۵۴ کروڑ روپے	۵۰ کروڑ روپے	۴ کروڑ روپے
سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء	ایک ارب ۲۷ کروڑ روپے	۷۴ کروڑ روپے	۵۳ کروڑ روپے
سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء	دو 〃 ۹۸ 〃 〃	ایک ارب ۴ کروڑ روپے	ایک ارب ۹۴ کروڑ روپے
سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء	۵ 〃 ۷۳ 〃 〃	۲ 〃 ۱۵ 〃 〃 + ۵۰ 〃 〃 [ط]	۳ 〃 [illegible] 〃 〃

ط [illegible]

سال	مدافعت کا مجموعی خرچ	حکومت ہند کا حصہ	حکومت برطانیہ کا حصہ
سنہ ۴۴-۱۹۴۳ء	۷ ارب ۳۷ کروڑ روپے	۳ ارب ۵۰ کروڑ روپے + ۳۰ ″ ″	۳ ارب ۸۰ کروڑ روپے
سنہ ۴۵-۱۹۴۴ء	۸ ″ ۹۶ ″ ″	۳ ″ ۹۷ ″ ″ + ۶۰ ″ ″	۴ ″ ۳۹ ″ ″
میزان	۲۷ ارب ۲۲ کروڑ روپے	۱۱ ارب ۹۸ کروڑ روپے + ۱ ارب ۵۰ ″ ″ = ۱۳ ″ ۴۸ ″ ″	۱۳ ارب ۴۷ کروڑ روپے

اوپر کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں جنگ کی جنگ کے زمانے میں ۲۷ ارب ۲۲ کروڑ روپے مدافعت پر خرچ کئے گئے۔ جس میں سے ہندوستان کا گیارہ ارب ۹۸ کروڑ روپیہ تو اس طرح پر خرچ ہوا کہ اس سے آیندہ کسی معاوضے کے ملنے کی کوئی اُمید نہیں ہے ایک ارب ۵۰ کروڑ روپے کی مالیت کا اثاثہ اس کے پاس ٹھوس صورت میں موجود ہے۔ اور تیرہ ارب ۴۷ کروڑ روپیہ ہندوستان میں برطانیہ کی طرف سے خرچ کیا گیا، اس کا اگرچہ ہندوستان کے میزانیہ میں اندراج نہیں کیا گیا۔ لیکن اس کے بوجھ کے بہت بڑے حصے کو ہندوستان ہی کو برداشت کرنا پڑا۔ یہ بوجھ ہندوستان کو کس طرح اُٹھانا پڑا، اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آگے کیا جائے گا۔ فی الحال ہم اپنی توجہ صرف میزانیہ میں صحے کے ہیے ہے

(بقیہ صفحہ) مات سرمایہ میں تقسیم کیا جانے لگا تھا اور میزانیہ میں صرف مات جاری کے مصارف کو دکھایا جاتا تھا جیسا کہ حالات کے بعد جو اعداد درج کئے گئے ہیں، وہ مدات سرمایہ کو ظاہر کرتے ہیں۔

مصارف کو محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

یورپ کی جنگ کے ۵ سالوں میں حکومتِ ہند کے میزانیوں کے مصارف کی مجموعی رقم جیسا کہ اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ پندرہ ارب ۹۰ کروڑ روپے ہوئی۔ اب سوال یہ ہے کہ حکومتِ ہند نے ان کثیر مصارف کو پورا کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے۔

حکومتِ ہند کی آمدنی کے بڑے ذرائع کو ذیل کے عنوانوں کے ماتحت تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

محاصل

دیگر ذرائع آمدنی

محکمۂ ڈاک اور تار سے خالص آمدنی

ریلوں سے خالص آمدنی

اگر آمدنی کے یہ ذرائع ناکافی ثابت ہوں تو خسارہ کو پورا کرنے کے لئے حکومتِ ہند کو قرض لینا پڑتا ہے۔

آمدنی کے ان مختلف ذرائع سے حکومتِ ہند کو جو سال بہ سال آمدنیاں حاصل ہوتی رہی ہیں انہیں ذیل کے جدول میں دکھلایا گیا ہے۔

جنگ سے قبل کا سال:۔

سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء	۸۴ کروڑ ۱۵ لاکھ

جنگ کے زمانے میں:۔

سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	۹۴ کروڑ، ۵ لاکھ
سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء	۹۹ " " "
سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء	ایک ارب ۴۳ کروڑ، ۵ لاکھ
سنہ ۱۹۴۲-۴۳ء	[illegible]

سنہ ۱۹۴۲-۴۳ء .. .. ۳ ارب ۹۴ کروڑ ۹۵ لاکھ

سنہ ۱۹۴۳-۴۴ء .. .. ۳ " ۵۶ " ۵۸ "

میزان - - گیارہ ارب ۱۲ کروڑ ۷۳ لاکھ

جنگ کے ابتدائی ۶ سال میں حکومتِ ہند کو بصورتِ مجموعی گیارہ ارب ۱۳ کروڑ کی آمدنی حاصل ہوئی۔ اگر آمدنی امن کے زمانے کے اوسط کے مطابق ۹۴ کروڑ ۷۵ لاکھ سالانہ کی رفتار سے ہوتی رہتی تو مجموعی آمدنی کا تخمینہ صرف ۵ ارب ۶۷ کروڑ ہوتا، اس لئے ۵ ارب ۴۶ کروڑ کے فرق کو جو حقیقی آمدنی اور اس مفروضہ تخمینہ میں پایا جاتا ہے۔ محصول کے اس اضافہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جو جنگ کی وجہ سے حکومت نے اپنی رعایا پر عائد کیا۔ ان عدد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ ہند اس زمانے میں اپنے محاصل کے اندر سو فی صدی اضافہ کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی۔

اس اضافہ کا کتنا حصہ محاصل کی قدرتی توسیع کا نتیجہ ہے اور کتنا محاصل کے عائد کرنے کا، اس کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا مشکل ہے جب سے انکم ٹیکس کی وصول یابی میں ایک سسٹم کی پیروی کی جارہی ہے۔ انکم ٹیکس میں برابر اضافہ ہورہا ہے اور کاروبار کی توسیع کی وجہ سے نئے افراد انکم ٹیکس کی زد میں آتے جارہے ہیں۔ اسی طرح صنعتی پیداوار کی ترقی کی وجہ سے اکسائز کے محاصل میں بھی برابر اضافہ ہورہا ہے۔ اس لئے آمدنی کے اضافہ کا ایک حصہ تو بلاشبہ قدرتی توسیع کا نتیجہ ہے اور اگر اوپر درج کی ہوئی مثالوں اور دیگر وجوہ کے پیش نظر محاصل کے ایک تہائی اضافہ کو قدرتی اسباب کا نتیجہ تصور کیا جائے تو یہ بات خلافِ حقیقت نہیں ہوگی اس لئے اس اضافہ کو منہا کرنے کے بعد آمدنی کے کم سے کم دو تہائی اضافہ کو جنگ کے حالات کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

جنگ کے زمانے میں محاصل کے جو نئے قوانین بنائے گئے ان کا مختصر حال ذیل میں درج ہے
سنہ ۱۹۴۰ء کے میزانیہ میں پہلی دفعہ زائد نفع کا ٹیکس جاری کیا گیا اس کی شرح پچاس فیصدی

رکھی گئی۔ اسی سال محاصل کے بڑھانے کی دوسری تدبیریں یہ اختیار کی گئیں کہ شکر پر اکسائز کا محصول اور درآمد کا محصول دو روپیہ فی ہنڈرویٹ سے بڑھا کر تین روپیہ ہنڈرویٹ کر دیا گیا۔ پٹرول ٹیکس کو (یعنی پٹرول پر اکسائز اور کروڑ گیری دونوں کو) دس آنے فی گیلن سے ۱۲ آنے فی گیلن کر دیا گیا۔ نومبر ۱۹۴۰ء میں ضمنی بجٹ پیش کیا گیا جس میں تمام انکم ٹیکس پر (جس میں سوپر ٹیکس اور کارپوریشن ٹیکس بھی شامل تھے) ۲۵ فی صدی کا زائد محصول لگا دیا گیا اور ڈاک اور تار کے محصول اور ٹیلیفون کے کرایہ میں بھی تھوڑا سا اضافہ کر دیا گیا۔

۱۹۴۱-۴۲ء کے بجٹ میں زائد نفع کے ٹیکس کی شرح کو ۵۰ فی صدی سے بڑھا کر ۶۶⅔ فی صدی کر دیا گیا۔ انکم ٹیکس اور سوپر ٹیکس پر جو ۲۵ فی صدی کا زائد محصول لگایا گیا تھا اس کو بڑھا کر ۳۳⅓ فی صدی کر دیا گیا۔ ہوا بھرنے والے ٹائروں اور ٹیوبوں پر ان کی مالیت کے لحاظ سے ۱۰ فی صدی اکسائز کا نیا محصول لگایا گیا۔ مصنوعی ریشم کے تاگے کی درآمد پر محصول کو تین آنے فی پونڈ سے بڑھا کر پانچ آنے فی پونڈ کر دیا گیا۔

۱۹۴۲-۴۳ء میں انکم ٹیکس کی تشخیص کے لئے آمدنی کی آخری حد کو دو ہزار روپے سالانہ سے گھٹا کر ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ کر دیا گیا۔ انکم ٹیکس پر زائد محصول کی شرح کو ۳۳⅓ فی صدی کی جگہ اس طرح بڑھایا گیا کہ ڈیڑھ ہزار سے پانچ ہزار تک کی آمدنیوں پر شرح محصول ۶ پائی فی روپیہ رکھی گئی اور اس کے بعد کی پانچ ہزار آمدنیوں پر ۹ پائی فی روپیہ اور اس کے بعد کے پانچ ہزار پر ایک آنہ دو پائی فی روپیہ اور پندرہ ہزار سے اوپر کی بقیہ آمدنی پر ایک آنہ تین پائی فی روپیہ۔ سوپر ٹیکس پر زائد محصول کی شرح کو پچاس فی صدی بڑھا دیا گیا اور کارپوریشن ٹیکس کی شرح کو ڈیڑھ آنہ فی روپیہ کر دیا گیا۔ زائد نفع کے ٹیکس کی شرح کو ۶۶⅔ فی صدی قائم رکھا گیا۔ لیکن کاروبار کے انتظام میں کفایت شعاری کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے حکومت اس بات پر راضی ہو گئی کہ اگر محصول ادا کنندہ اس کی دوگنی رقم کو حکومت کے پاس بطور امانت جمع کرے گا تو حکومت زائد نفع کے ٹیکس کے بارہ حصے کو ایک ایسے سرمایہ محفوظ

میں اپنی طرف سے جمع کر دے گی جس سے جنگ کے بعد صنعت کے لئے نیا سامان خریدا جاسکے گا۔

تمام محاصل درآمد پر ہنگامی ضرورت کے پیش نظر ۱/۵ زائد محصول عاید کیا گیا اور اس اضافہ سے صرف مندرجہ ذیل تین چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ (۱) خام روئی۔ اس وجہ سے کہ اس پر ایک خاص ضرورت سے محصول سو فی صدی بڑھایا جاچکا تھا (۲) پٹرول کہ اس پر ایکسائز اور کروڑگیری کے محصول ۳ فی گیلن کی شرح سے بڑھائے جاچکے اور (۳) نمک کو۔ چاندی اور مٹی کے تیل پر ایکسائز کے محاصل کو بھی نئے محاصل درآمد کے برابر کر دیا گیا اور ڈاک تار اور ٹیلیفون کے بعض کرایوں کو بھی اور زیادہ بڑھا دیا گیا۔

۴۴-۱۹۴۳ء میں ایسی متعدد تدبیریں اختیار کی گئیں جن کا دوگونہ مقصد تھا ایک طرف تو زیادہ محصول حاصل کرنا اور دوسری طرف افراطِ زر کو روکنا۔ پانچ ہزار سے زیادہ آمدنیوں پر زائد محصول کی شرح کو بڑھایا گیا۔ جس کی وجہ سے انکم ٹیکس کی بنیادی شرح پر زائد محصول کی شرح ۶۶ ۲/۳ فی صدی ہوگئی۔

سوپر ٹیکس میں بھی ۲۵ ہزار اور ۳ ۱/۲ لاکھ کی درمیانی آمدنیوں پر زائد محصول کی شرح کو یکساں طور پر ۶ پائی فی روپیہ کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زائد محصول کو ملا کر سوپر ٹیکس کی شرح ۲ فی روپے کی کمترین شرح سے لے کر ساڑھے دس آنے فی روپے کی انتہائی شرح تک پہنچ گئی۔ کارپوریشن ٹیکس کو بھی نصف آنہ بڑھا کر ۲ فی روپیہ کر دیا گیا۔

دو نئے ایکسائز محاصل لگائے گئے ایک تمباکو پر اور دوسرا بناسپتی گھی پر۔ تمباکو سے اول سال میں ۱۰ ۱/۲ کروڑ روپیہ وصول ہونے کی توقع قائم کی گئی اور بناسپتی گھی پر شرح ۵ روپے فی ہنڈریڈ ویٹ رکھی گئی اور اس سے ایک کروڑ روپے وصول ہونے کی امید کی گئی۔ ڈاک اور ٹیلیفون کے بعض کرایوں میں مزید اضافہ کیا گیا جس سے ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کی توقع کی گئی۔

اسی طرح ۱۹۴۵-۴۶ء کی مالیاتی تدبیروں سے بھی آمدنی میں نہ صرف جنگ اور مابعد جنگ کے زمانے کی ضرورتوں کا خیال کرکے اضافہ کیا گیا بلکہ زائد زر کو جذب کرنے کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ لوگ اپنے انکم ٹیکس کو پیشگی ادا کر سکتے تھے۔ زائد منافع کے ٹیکس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی لیکن لازمی امانت کے تناسب کو کمپنیوں کے لئے ٹیکس کا ۱۹/۶۴ اور دوسروں کے لیے ۱۹/۶۴ کردیا گیا۔ گویا اس کے بعد لوگوں کو تمام ایسے زائد منافع سے فوری فائدہ اٹھانے سے محروم کردیا گیا جو زائد منافع کے محصول کو ادا کرنے اور بقیہ پر انکم ٹیکس اور سوپر ٹیکس ادا کرنے کے بعد باقی بچا کرتا تھا۔

جن لوگوں کی آمدنیاں دو ہزار روپے سے کم تھیں ان کے ساتھ رعایت کی گئی اور محصول کی کم ترین حد کو ڈیڑھ ہزار روپے سے بڑھا کر دو ہزار روپے کر دیا گیا۔ دس ہزار روپے سے پندرہ ہزار روپے تک کی آمدنیوں پر زائد انکم ٹیکس کی شرح کو دو پائی بڑھایا گیا یعنی ۴۴ پائی کی بنیادی شرح پر ۱۶ پائی سے ۱۸ پائی فی روپیہ کردیا گیا اور ۱۵ ہزار روپے سے زائد کی بقیہ آمدنیوں پر شرح کو چار پائی بڑھایا گیا یعنی ۳۰ پائی کی بنیادی شرح پر ۲۰ پائی سے ۲۴ پائی فی روپیہ کر دیا گیا۔ سوپر ٹیکس پر بھی ۳۵ ہزار اور دو لاکھ کی درمیانی آمدنیوں پر زائد محصول میں دو پیسہ کا مزید اضافہ کیا گیا۔ اسی طرح کارپوریشن ٹیکس کو ایک آنے سے بڑھا کر تین آنے کر دیا گیا۔ لیکن کمپنی کی ایسی مجموعی آمدنی پر جو مقررہ شرح منافع کے علاوہ بطور مزید منافع کے حصے داروں کے درمیان تقسیم نہیں کی جاتی تھی۔ ایک آنہ فی روپے کی چھوٹ دی گئی۔

تمباکو پر اکسائز محاصل کو اور زیادہ بڑھایا گیا جس کی وجہ سے دس کروڑ روپے کی مزید آمدنی حاصل ہونے کی امید قائم کی گئی۔ تین نئے اکسائز کے محاصل لگائے گئے یعنی چھالیہ، قہوہ اور چائے پر ۲ آنہ فی پونڈ کی شرح سے۔

ان ذرائع سے مزید آمدنی کی جو توقع قائم کی گئی وہ ۳۰ ½ کروڑ روپے ہوتی تھی اور

افراطِ زر کے تدارک کے سلسلے میں ان نئی تدبیروں سے تقریباً نوے کروڑ روپیہ کی واپسی کی توقع کی گئی۔

۱۹۴۵-۴۶ء میں محاصل میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔ پندرہ ہزار سے زائد کی آمدنیوں پر زائد محصول کو تین پائی کے بقدر بڑھایا گیا جس سے چار کروڑ روپے کے حاصل ہونے کی اُمید قائم کی گئی۔ نہایت اعلیٰ قسم کے تمباکو پر بھی اکسائز کے محاصل اور زیادہ کئے گئے جن سے ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ کی آمدنی حاصل ہونے کی اُمید تھی۔ غیر مصنوعہ تمباکو کی درآمد پر بھی اسی کی مناسبت سے محصول میں اضافہ کیا گیا جس سے ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ وصول ہونے کی امید کی گئی۔ اندرون ملک کے ڈاک کے پارسلوں کے کرایے میں بھی کچھ اضافہ کیا گیا اور ٹرنک ٹیلیفون کال اور تار کے کرایے پر بھی زائد محصول لگایا گیا۔ جس سے ایک کروڑ ۳۵ لاکھ کی آمدنی کی توقع کی گئی۔

ذیل کے جدول کے ذریعے جنگ کے زمانے میں محاصل کی مختلف مدوں میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں انھیں دکھلایا گیا ہے۔

(کروڑ روپیہ)

سال	محاصل کروڑگیری	مرکزی محاصل اکسائز	کارپوریشن ٹیکس	کارپوریشن ٹیکس کے علاوہ دیگر انکم ٹیکس	نمک کا محصول
جنگ سے قبل ۱۹۳۸-۳۹ء	۴۰ کروڑ ۱۵ لاکھ	۸ کروڑ ۶۰ لاکھ	۲ کروڑ ۴ لاکھ	۱۵ کروڑ ۴۴ لاکھ	۸ کروڑ ۱۲ لاکھ
جنگ کے زمانے میں ۱۹۳۹-۴۰ء	۴۵ " ۸۰ "	۶ " ۵۲ "	۲ " ۳۸ "	۱۶ " ۹۹ "	۱۰ " ۸۴ "
۱۹۴۰-۴۱ء	۳۷ " ۳۰ "	۹ " ۴۹ "	۴ " ۱۴ "	۲۱ " ۷۹ "	۷ " ۶۷ "
۱۹۴۱-۴۲ء	۳۷ " ۸۹ "	۱۳ " ۱۵ "	۱۱ " ۶۶ "	۳۲ " ۴۰ "	۹ " ۲۰ "
۱۹۴۲-۴۳ء	۲۵ " ۱۳ "	۱۲ " ۷۵ "	۳۱ " ۴۰ "	۵۴ " ۲۶ "	۱۰ " ۹۱ "
۱۹۴۳-۴۴ء	۲۶ " ۵۷ "	۲۴ " ۹۴ "	۵۱ " ۲۸ "	۴۷ " ۸۴ "	۸ " ۳۹ "
۱۹۴۴-۴۵ء	۴۰ "	۳۹ " ۷ "	ایک ارب ۶ کروڑ ۱۱ لاکھ	ایک ارب ۲ کروڑ ۸۹ لاکھ	۹ " ۳۰ "

اس جدول کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محاصل کروڑ گیری میں اس سال جب کہ ان میں ۲۰ فی صدی کا زاید محصول لگایا گیا۔ جنگ سے قبل کے سال کے مقابلے میں ۴۰ فی صدی کم ہوکر صرف ۲۵ کروڑ رہ گئے۔ ۴۳-۱۹۴۲ء کی تھوڑی سی کمی کو نظر انداز کر دیا جائے تو محاصل اکسائز میں متواتر توسیع نظر آتی ہے۔ انکم ٹیکس میں (جس میں کارپوریشن ٹیکس بھی شامل ہے) غیر معمولی طور پر نمایاں اضافہ نظر آتا ہے یعنی ۱۷ کروڑ سے بڑھ کر یہ دو ارب دس کروڑ تک پہنچ گیا۔ نمک کا محصول کم و بیش قائم حالت پر رہا۔

حکومت کے بعض تجارتی شعبوں کی آمدنی سے بھی مثلاً ڈاک اور تار اور ریل کے محکموں سے سرکار کی عام آمدنی میں بڑا اچھا اضافہ ہوا۔ ذیل کے جدول میں مثال کے طور پر ڈاک اور تار اور ریل کے محکموں کی آمدنیوں کو دکھلایا گیا ہے۔

سال	ڈاک اور تار کے محکمے سے خالص آمدنی	ریلوں سے خالص آمدنی
جنگ سے قبل		
۳۹-۱۹۳۸ء	۱۹ لاکھ روپے	ایک کروڑ ۳۷ لاکھ
جنگ کے زمانے میں		
۴۰-۱۹۳۹ء	۴۹ ″ ″	۴ ″ ۳۳ ″
۴۱-۱۹۴۰ء	ایک کروڑ ۲۵ لاکھ	۱۲ ″ ۱۶ ″
۴۲-۱۹۴۱ء	۳ ″ ۴۱ ″	۲۰ ″ ۱۷ ″
۴۳-۱۹۴۲ء	۴ ″ ۵۲ ″	۲۰ ″ ۱۳ ″
۴۴-۱۹۴۳ء	۹ ″ ۳ ″	۳۷ ″ ۶۴ ″
۴۵-۱۹۴۴ء	۹ ″ ۳۲ ″	۳۲ ″

ذیل کے جدول میں حکومتِ ہند کی آمدنی اور مصارف کے خلاصہ کو درج کیا گیا ہے

	۱۹۳۸-۳۹ء	۱۹۳۹-۴۰ء	۱۹۴۰-۴۱ء	۱۹۴۱-۴۲ء	۱۹۴۲-۴۳ء	۱۹۴۳-۴۴ء	۱۹۴۴-۴۵ء
آمدنی							
آمدنی کی خالص مدیں	۷۶/۱۱	۸۴/۰۹	۸۳/۰۱	۱۰۶/۱۵	۱۳۶/۵۷	۱۹۱/۵۱	۳۰۱/۳۲
آمدنی کی دوسری متفرق مدیں	۸/۳۴	۸/۰۵	۱۶/۳۹	۱۲/۲۳	۲۶/۵۶	۳۰/۲۷	۴۰/۸۰
ڈاک اور تار سے خالص آمدنی	/۱۹	/۸۹	۱/۲۵	۳/۴۱	۵/۵۲	۹/۰۳	۹/۳۲
ریل سے خالص آمدنی	۱/۳۷	۴/۴۳	۱۲/۱۶	۲۰/۱۷	۲۰/۱۳	۳۷/۶۴	۳۲/۰۰
	۸۶/۰۱	۹۷/۳۶	۱۱۱/۸۱	۱۴۱/۹۶	۱۸۷/۷۸	۲۶۹/۴۵	۳۸۳/۴۴
منہا صوبوں کا انکم ٹیکس میں حصہ	۱/۵۰	۲/۷۹	۴/۱۶	۷/۳۹	۱۰/۹۰	۱۹/۵۰	۲۶/۵۶
میزان آمدنی	۸۴/۵۱	۹۴/۵۷	۱۰۷/۶۵	۱۳۴/۵۷	۱۷۶/۸۸	۲۴۹/۹۵	۳۵۶/۸۸
خرچ							
مدافعت پر	۴۶/۱۸	۴۹/۵۴	۷۳/۶۱	۱۰۳/۹۳	۲۱۴/۶۲	۳۵۸/۴۰	۳۹۷/۲۳
شہری مصارف پر	۳۸/۹۷	۴۵/۰۳	۴۰/۵۷	۴۳/۳۳	۷۴/۴۳	۸۱/۴۵	۱۱۵/۴۲
میزان خرچ	۸۵/۱۵	۹۴/۵۷	۱۱۴/۱۸	۱۴۷/۲۶	۲۸۹/۰۵	۴۳۹/۸۵	۵۱۲/۶۵
خسارہ	/۶۴	...	۶/۵۳	۱۲/۶۹	۱۱۲/۱۷	۱۸۹/۹۰	۱۵۵/۷۷

جنگ کے شروع زمانے میں مصارف کو پورا کرنے کے لئے محاصل ہی پر انحصار کیا گیا اور ان کی مقدار میں اضافہ کیا گیا۔ جنگ کے لئے روپیہ بہت کم قرض لیا گیا۔ لیکن بعد کے زمانے میں قرض کی مقدار آمدنی سے کہیں زیادہ ہوگئی اور جیسا کہ سرجریمی رائیس مین نے اپنے آخری دو بجٹوں کی تقریر کے دوران میں کہا کہ ہندوستان کی جنگی مالیات میں اب قرض کی حیثیت سب سے بڑے لنگر یا آخری پناہ اور سہارے کی ہوگئی ہے۔ یہ قرض نہ صرف جنگ کے مصارف کو

پورا کرنے کے لئے لیا گیا بلکہ افراط زر کا تدارک کرنے کے لئے بھی لیا گیا۔

جنگ کے زمانے میں خسارہ کی مجموعی میزان ۸ ارب ۷۷ کروڑ روپیہ ہوتی ہے جس کو حکومت ہند کے زیادہ تر قرض لے کر پورا کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے ——————— جنگ کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے میں قرض سے بہت کم کام لیا گیا۔ جنگ کی ابتدا سے جنوری ۱۹۴۵ء کے آخر تک قرض کی میزان ۸ ارب ۳۴ کروڑ روپے ہوتی ہے جنگ سے قبل کے سالوں میں جس طرح کم شرح سود پر کامیابی کے ساتھ قرض لیا جارہا تھا اس کم شرح کو جنگ کے زمانے میں بھی جاری رکھا گیا۔ چنانچہ جنگ کے زمانے کے تمام قرضے تین فی صدی شرح سود کی بنیاد پر لئے گئے ہیں۔

روپیہ قرض دینے والے لوگوں کی خواہشات کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف قسم کے قرضے طلب کئے گئے۔ کچھ چھوٹی مدت کے تھے، کچھ درمیانی مدت کے۔ کم پونجی رکھنے والے لوگوں کو قرض دینے کے لئے مائل کرنے کی خاص طور پر کوشش کی گئی۔ اس ضمن میں بارہ سال کے نیشنل سیونگ سرٹیفکٹ کا ذکر کرنا ضروری ہے جن کی شرح سود نسبتاً کچھ زیادہ ہی لی رکھی گئی تاکہ کم پونجی والے لوگ بھی ان کے خریدنے کی طرف مائل ہوسکیں۔

چھوٹی رقموں کی بچت کی حوصلہ افزائی کرنے کی جو کوششیں کی گئیں ان میں صوبائی حکومتوں اور غیر سرکاری اداروں کے اشتراک عمل سے اچھی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کا اندازہ ڈاک خانے کے سیونگ بنک کے حسابات اور بارہ سالہ نیشنل سیونگ سرٹیفکٹ کے ذریعے کیا جاسکتا ہے جس سے تین کروڑ روپیہ ماہانہ کی رفتار سے حکومت ہند کو قرض ملتا رہا۔

حکومت ہند کے غیر مستقل قرضے کی مقدار ۱۹۴۳-۴۴ء کے خاتمہ پر ایک ارب ۱۱ کروڑ تھی اور ۱۳ جنوری ۱۹۴۵ء کو ۹۳ کروڑ، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ہند کو اپنی عارضی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے بھی قرض لینے میں کسی دشواری کا

سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

۱۹۴۴-۴۵ء کے خاتمہ پر حکومتِ ہند کے سرکاری قرضے کی (جس پر سود واجب الادا ہی) میزان ۱۷ ارب ۹۹ کروڑ روپیہ ہوتی تھی۔ اس کے بالمقابل جمع کے کھاتے میں سود ادا کرنے والی پونجی کی میزان ۱۰ ارب ۴ کروڑ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ نقدی اور خزانے کے کھاتے کے تمسکات کی مالیات ۳ ارب ۱۲ کروڑ ہوتی تھی۔ اس لئے ایسا قرضہ جس کے اصل اور سود کی ادائی کے لئے کوئی دولت آفریں سرمایہ موجود نہیں تھا۔ صرف ۴ ارب ۸۳ کروڑ تھا۔

اس جنگ سے ایک مہتم بالشان نتیجہ یہ نکلا ہی کہ اب ہندوستان بین الاقوامی منڈی میں ایک مقروض ملک کی جگہ ایک قرض خواہ ملک بن گیا ہی۔ موجودہ جنگ سے پہلے ایک طویل مدت سے ہندوستان کا شمار مقروض ملکوں میں کیا جاتا تھا لیکن جنگ کے زمانے میں ہندوستان کے حساب میں برطانیہ کے اندر جو اسٹرلنگ فاضلات جمع ہوتے رہے ہیں انھوں نے پانسہ پلٹ دیا ہی۔

اسٹرلنگ فاضلات کے ذخیرے کے اجتماع کا تذکرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے نظام زر کے بارے میں چند ابتدائی باتوں کی تشریح کردی جائے۔

ہندوستان میں چاندی کا یا کاغذ کا روپیہ چلتا ہی۔ حکومتِ ہند نے اس کی قیمت ۱ شلنگ ۶ پنس مقرر کی ہی۔ لیکن نہ تو چاندی کے روپے میں اس قیمت کی چاندی ہوتی ہی نہ کاغذ کے روپے کی قدر ذاتی اس کے برابر ہوتی ہے۔ اس لئے ہندوستان کے روپے کو وضعی یا اعتباری زر کہا جاتا ہے۔

وضعی اور اعتباری زر کی قدر و قیمت کو اس کی ذاتی قدر و قیمت کے مقابلے میں اسی وقت بلند رکھا جا سکتا ہے جب کہ اس کی رسد کی فراہمی پر پورا قابو رکھا جائے۔ حکومت ہند

نے روپے کی مقررہ قیمت کو قائم رکھنے کا انتظام رزرو بنک آف انڈیا کو سپرد کر دیا ہے اور اسے
روپے کی رسد کو ہمیشہ اتار رکھنا پڑتا ہے کہ جس سے اس کی قیمت نہ تو ایک شلنگ سے زیادہ
ہو نہ اس سے کم۔ اس کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ ہندوستان کے روپے کے معاوضہ میں انگلستان
کا کاغذی سکہ اسٹرلنگ اور انگلستان کے کاغذی سکہ اسٹرلنگ یا سونے کے معاوضے
میں ہندوستان کا روپیہ ہر اس شخص کو جو اس کا مطالبہ کرے ایک شلنگ ۶ پنس فی روپے
کی شرح سے فوراً ادا کرے۔ اس کے لئے رزرو بنک کو ایک طرف تو اپنے ذخیرہ محفوظ
میں قانوناً اپنے جاری شدہ مجموعی نوٹوں کے بالمقابل کم سے کم پچاس فی صدی سونا یا
اسٹرلنگ جمع رکھنے ہوتے ہیں تاکہ روپے کے بدلے میں فوراً اسٹرلنگ کی ادائی کا بندوبست
کر سکے اور دوسری طرف اس پابندی کو پورا کرتے ہوئے اُسے نوٹوں کے اجراء کا پورا اختیار
ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ اسٹرلنگ کے بدلے میں فوراً روپے کی ادائی کا انتظام کر سکتا ہے۔

ملکی معاملات اور لین دین میں تو عموماً کسی شخص کو روپے کے معاوضے میں اسٹرلنگ حاصل کرنے کی
ضرورت پیش نہیں آتی اور لوگوں کو رزرو بنک آف انڈیا کی ان کوششوں کا جو وہ روپے کی قیمت کو ایک شلنگ
چھ پنس کی برابر رکھنے کے لئے کرتا رہتا ہے کبھی احساس بھی نہیں ہوتا لیکن جو لوگ دوسرے ملکوں میں لین دین کرتے
ہیں انھیں البتہ یا تو باہر کے ملکوں کے سکوں کی جو انھیں اپنے برآمد کردہ مال کے معاوضہ میں دوسرے ملکوں میں
ملتے ہیں اور جو ہندوستان میں نہیں چل سکتے، ہندوستانی روپے میں تبدیل کرانا ہوتا ہے یا درآمد کردہ مال
کی قیمت غیر ملکوں کو ادا کرنے کے لئے ہندوستانی روپے کو جو باہر کے ملکوں میں نہیں چل سکتا باہر کے سکوں
میں تبدیل کرانا ہوتا ہے اور اس لئے ان کے لئے روپے کی یہ قیمت اور شرح مبادلہ غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔

اب اگر یہ صورت ہوتی کہ حکومت ہند نے روپے کی قیمت ایک شلنگ چھ پنس انگلستان
کے سونے کے سکے یعنی ساورن کی شکل میں مقرر کی ہوتی تو ہندوستان مبادلاتِ خارجہ میں
انگلستان کے کاغذی سکہ کا بالکل محتاج نہ ہوتا کیونکہ ہندوستان کا تاجر لندن کے بنک میں
روپیہ [illegible] کرتا اور اس کے معاوضے میں ساورن یعنی سونا ایک شلنگ چھ پنس

کی شرح سے بنک سے حاصل کرکے اپنے غیر ملکی قرض خواہوں کے حوالے کردیتا اور انگلستان کی درمیانی کڑی اس کے لئے لازمی اور ناگزیر نہ رہتا۔ لیکن دراصل صورت یہ نہیں ہے ہندوستان کے روپئے کی قیمت انگلستان کے کاغذ کے سکّے یعنی اسٹرلنگ کی صورت میں مقرر کی گئی ہے۔ اس لئے مبادلے کے ہر موقع پر اس درمیانی کڑی کا اشتراک عمل اس کے لئے لازمی ہوگیا ہے۔ دوسرے ملکوں کا جب وہ قرض ادا کرتا ہے تو اُسے انگلستان کے کاغذی سکّے اسٹرلنگ کو ضرور درمیان میں لانا پڑتا ہے اور اسی طرح جب اسے دوسرے ملکوں سے قرض وصول کرنا ہوتا ہے تب بھی یہ درمیانی کڑی موجود رہتی ہے۔ قرض ادا کرتے وقت وہ ہندوستان کا روپیہ رزرو بنک آف انڈیا میں داخل کرتا ہے اور یہ بنک اپنے ذخیرہ اسٹرلنگ میں سے اسے اسٹرلنگ ادا کردیتا ہے جس سے وہ اپنے قرض خواہوں کا مطالبہ بیباق کرسکتا ہے۔ اس ادائی کے بعد رزرو بنک کے ذخیرہ محفوظ میں اسٹرلنگ کی جتنی کمی ہوتی ہے۔ اسی کے مطابق وہ اپنے اعتباری روپیوں کو مسترد کرکے ان کی رسد کو کم کردیتا ہے۔ جب معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے یعنی ہندوستان کو باہر کے ملکوں سے قرض وصول کرنا ہوتا ہے تو اس صورت میں رزرو بنک آف انڈیا کے ذخیرہ محفوظ میں اسٹرلنگ زیادہ ہونا شروع ہوجاتے ہیں اور ان کی ضمانت پر وہ ہندوستان میں اعتباری اور وضعی روپیوں کی رسد کو بڑھا دیتا ہے اور ہندوستان کے ان لوگوں کو جن کا مطالبہ واجب الوصول ہے روپیہ ادا کردیتا ہے۔

مالیاتِ ہند کے بارے میں جو بحث جاری تھی اس کے سلسلے میں ہندوستان کے نظام کا یہ آخری پہلو خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہندوستان میں افراطِ زر کے مسئلے نے بالکل ایک نئی صورت اختیار کرلی جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ حکومت ہند نے موجودہ جنگ میں اپنے بجٹ کے خساروں کو تو بلاشبہ کثیر مقدار میں نوٹ چھاپ کر پورا نہیں کیا اور اس لحاظ سے ذاتی طور پر اُس نے افراطِ زر سے کبھی کام نہیں لیا۔ لیکن حکومت برطانیہ کی طرف سے

جنگی مصارف ہندوستان میں کرنا پڑے اور جن کی ادائگی برطانیہ کی طرف سے اسٹرلنگ کی صورت میں کی گئی اور جو رزرو بنک کے ذخیرہ اسٹرلنگ کے بڑھانے کا موجب ہوئے ان کی ضمانت پر رزرو بنک آف انڈیا نے البتہ بہت کثرت سے روپے کے نوٹوں کو چھاپ کر برطانیہ کے قرضوں کو ہندوستان میں بے باق کیا۔ قانونی اور نظری اعتبار سے ممکن ہو رزرو بنک آف انڈیا کی اس ساری کارروائی میں کوئی سقم یا مالیاتی نقص نہ ہو۔ کیونکہ روپے کی مقررہ قیمت میں اس کی وجہ سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ وہ حسب سابق ایک شلنگ چھ پنس پر قائم رہی۔ بلکہ حالات اتنے موافق ہو گئے تھے کہ اگر رزرو بنک سے کہا جاتا تو وہ اس کی قیمت کو اور بہت زیادہ بڑھا سکتا تھا۔ لیکن ان نظری اور قانونی موشگافیوں سے عملی حقائق کو زیادہ عرصے تک جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ روپے کی خارجی قیمت ضرور مستحکم بنیاد پر قائم تھی لیکن مبادلاتِ خارجہ تجارتِ خارجہ اور ذرائع نقل و حمل کی راشن بندی اور کنٹرول کی وجہ سے ہندوستانی خریدار اس کے فائدے سے محروم تھا۔ ملک کے اندر روپے کی حقیقی قیمت روز بروز گرتی چلی جا رہی تھی۔ قیمتوں میں تیزی سے اضافہ کا سلسلہ جاری تھا۔ مصارفِ زندگی بہت بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اور ان کی ذمہ داری بہت بڑی حد تک ان نئے نوٹوں پر عائد کی جا سکتی تھی۔ جو رزرو بنک آف انڈیا، اسٹرلنگ کے اضافہ [illegible] ذخیرے کی ضمانت پر چھاپ چھاپ کر جاری کر رہا تھا۔ شروع شروع میں وزیر مالیات اور حکومت کے دوسرے ہوا خواہوں نے لوگوں کو اس فریب میں مبتلا کرنا چاہا کہ ہندوستان میں افراطِ زر نہیں ہے۔ لیکن بعد میں ناقابلِ انکار شہادتوں کی موجودگی میں ان کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ہندوستان میں افراطِ زر کا خلا (INFLATIONARY GAP) موجود ہے یعنی جتنے نوٹ رزرو بنک کی طرف سے قرضوں کو بیباق کرنے کے لئے جاری کئے جاتے ہیں وہ تمام کے تمام جلد رزرو بنک میں واپس آ کر مسترد نہیں ہو جاتے بلکہ [illegible] خریداری کا کام لیا جا سکتا ہے اور اس طرح بازار [illegible]

قیمتوں کو بڑھاتے رہتے ہیں۔ اس افراطِ زر کے ... کو روکنے کے لئے وزیر مالیات نے
ایک طرف تو وہ کارروائیاں اختیار کیں جن کا تذکرہ نئے محاصل کے عائد کرنے کے سلسلے میں
اوپر کیا جا چکا ہے اور دوسری طرف بڑے پیمانے پر ہندوستانیوں سے قرض لینے کا
کام شروع کیا گیا تاکہ نئے جاری شدہ نوٹوں کو قیمتوں کے بڑھانے کا موقع نہ مل سکے
لیکن یہ کارروائیاں بعد میں اختیار کی گئیں اور داخلی قیمتوں کی موجودہ گرانی سے یہ ظاہر
ہوتا ہے کہ ان میں حکومتِ ہند کو جیسا چاہئے تھا ویسی کامیابی ابھی تک نہیں ہو سکی۔

بہرحال یہ موضوع ایک جداگانہ بحث چاہتا ہے۔ ہم نے دراصل اسٹرلنگ کے ذخیروں
میں جو غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے اس کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کے نظامِ زر کے پیشگی
مطالعے کو ضروری سمجھا تھا۔ اس لئے اس تمہیدی گفتگو کے بعد دوبارہ ہم اس کی طرف
رجوع کرتے ہیں۔

موجودہ جنگ کے زمانے میں ایک طرف تو ہندوستان کا توازنِ تجارت بہت موافق ہو گیا
یعنی ہندوستان نے برطانیہ اور دوسرے ملکوں کو اپنا مال برآمد زیادہ کیا اور ان کا مال درآمد کم کیا
اس زاید برآمد کی قیمت انھوں نے ریزرو بنک میں اسٹرلنگ جمع کرکے اور اس کی ضمانت پر روپے کے
نوٹ چھپوا کر ہندوستانی تاجروں کو ادا کرائی۔ دوسرے سلطنت برطانیہ اور دوسری متحدہ حکومتوں
کی طرف سے جو فوجی مصارف ہندوستان میں کئے گئے ان کی ادائی بھی اس طرح ہوئی کہ ریزرو بنک
میں اسٹرلنگ جمع کئے گئے اور ان کی ضمانت پر روپے کے نوٹ ہندوستان میں چھپوا کر ہندوستانی
صناعوں، ٹھیکیداروں، تاجروں اور مزدوروں کے مطالبوں کا بھگتان کیا گیا۔ تیسرے
حکومتِ ہند نے حکومتِ برطانیہ کی طرف سے کچھ اور بھی ایسے متفرق اخراجات ہندوستان
میں کئے جن کی ادائی حکومتِ برطانیہ کی طرف سے اسٹرلنگ میں کی گئی جو ریزرو بنک کے
ذخیرہ محفوظ میں جمع ہوئے اور ان کی بنیاد پر روپے کے نوٹ چھاپ کر ہندوستانیوں کے
مطالبے بیباق کئے گئے۔ غرض ان مختلف طریقوں سے ریزرو بنک آف انڈیا کے ذخیرہ محفوظ

ہیں اسٹرلنگ تیزی کے ساتھ جمع ہوتے رہے۔

جب اسٹرلنگ بہت زیادہ جمع ہوگئے تو ان کے ذخیرے سے فائدہ اُٹھانے کی ایک صورت یہ نکالی گئی کہ حکومت ہند کے ذمے جو قرض اسٹرلنگ کی صورت میں واجب الادا تھا اس کو بیباق کرنے کی کارروائی اختیار کی گئی۔ یہ قرض ۱۹۳۹-۴۰ء میں یعنی جنگ سے پہلے تین ارب ۹۶ کروڑ ۵۰ لاکھ تھا۔ اب اس کے بیشتر حصے کو بیباق کر دیا گیا ہے اور صرف ۱۸ کروڑ باقی رہ گیا ہے جو اس لئے ادا نہیں ہو سکا ہے کہ اس کا ادا کرنا حکومت ہند اور حکومت برطانیہ کے اختیار سے باہر تھا۔ اس کے قرض کے بیباق ہو جانے کی وجہ سے ہندوستان کی مالی حالت بہت مضبوط ہوگئی ہے اور بین الاقوامی منڈی میں اس کا اعتبار بہت بڑھ گیا ہے۔ خارجی مقروضیت کی وجہ سے اس کی سیاسی ترقی میں جو ایک رکاوٹ حائل تھی وہ دور ہوگئی ہے۔ لیکن اس قرض کے ادا کرنے کے بعد بھی رزرو بنک کے ذخیرۂ اسٹرلنگ میں کوئی معتدبہ تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اس کے اجتماع اور اضافے کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ ۳۰ مارچ ۱۹۴۵ء کو تیرہ ارب ۴۲ کروڑ کے اسٹرلنگ فاضلات رزرو بنک میں موجود تھے۔ ہندوستان کی حیثیت مقروض ملک کی بجائے اب قرض خواہ ملک کی ہوگئی ہے۔ برطانیہ نے بیسیوں سال کے دوران میں جو رقم ہندوستان کو آہستہ آہستہ قرض دی تھی۔ ہندوستان نے تین چار سال کی مختصر مدت میں نہ صرف اسے ادا کر دیا ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ قرض کا بوجھ خود برطانیہ پر لاد دیا ہے۔

اس تبدیلی کا خلاصہ ذیل کے جدول میں اسٹرلنگ کی رسد کے ذرائع اور ان کے استعمال کے طریقوں کو درج کر کے پیش کیا گیا ہے:-

رسد کے ذرائع:-

۱۔ اگست ۱۹۳۹ء میں رزرو بنک کے پاس اسٹرلنگ کا ذخیرہ	۶۴ کروڑ روپے
۲۔ جنوری ۱۹۴۰ء سے رزرو بنک کی طرف سے اسٹرلنگ کی خریداری	۱۰۰۰ [illegible] کروڑ روپے

۳۔ حکومت برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کو اسٹرلنگ کی ادائی ۱۲ ارب ۵۰ کروڑ روپے

میزان ۱۹ " ۲۲ " "

استعمال کے طریقے:۔

۱۔ اسٹرلنگ قرضے کی ہندوستان کی طرف سے ادائی ۴ ارب روپے

۲۔ دیگر مصارف اسٹرلنگ ۲ " ۳۰ کروڑ روپے

۳۔ جنوری ۱۹۴۸ء کے آخر میں ریزرو بنک میں اسٹرلنگ کا ذخیرہ محفوظ ۱۳ " ۴ " "

میزان ۱۹ " ۲۲ " "

اسٹرلنگ کے قرضے کی ادائی کے علاوہ ہندوستان نے دوسرے حسب ذیل اسٹرلنگ کے مطالبوں سے اپنے آپ کو بری الذمہ کر لیا ہے:۔

۱۔ ریلوے کے سالانہ سود کو یکبارگی ادا کر دیا اور ان کے قرضے کے تمسکات کو بیباق کر دیا ۱۴ ملین پونڈ

۲۔ کمپنی کے انتظام میں جو ریلیں تھیں انھیں خرید لیا ۲۸ " "

۳۔ چیٹ فیلڈ کمیٹی کے سلسلے کے قرض کو ادا کر دیا ۸ ½ " "

۴۔ غیر موثر مطالبوں کی ادائی کو حکومت برطانیہ کے سپرد کر دیا۔ ۱۵ " "

ان سب کاموں کے کرنے کے باوجود ہندوستان کے پاس کثیر مقدار میں اسٹرلنگ ذخیرہ موجود ہے۔ اس مسئلے نے کہ اسے جنگ کے بعد کس طرح استعمال میں لایا جائے بہت اہمیت اختیار کی ہے۔ گذشتہ سال جب ہندوستان کے وزیر [illegible]

انگلستان گئے تھے تو انہوں نے برطانیہ کے محکمۂ مال کے عہدہ داروں سے اس کے بارے میں کچھ گفتگو کی تھی اور آیندہ کے فیصلوں کے لئے زمین کو ہموار کیا تھا۔

جولائی ۱۹۴۴ء میں امریکہ کے شہر بریٹن ووڈز میں جو بین الاقوامی زر کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں ہندوستان کی طرف سے ۵ اشخاص کا ایک وفد بھیجا گیا تھا جس میں ہندوستان کے وزیر مالیات سر جیرمی رائسمن۔ ریزرو بنک آف انڈیا کے گورنر سر سی۔ ڈی۔ دیش مکھ اور حکومت ہند کے معاشی مشیر ڈاکٹر سر تھیوڈور گریگری کے علاوہ سر شنمکھم چیٹی اور مسٹر اے۔ ڈی۔ شراف شامل تھے۔ اس کانفرنس میں بین الاقوامی ذخیرہ زر اور بین الاقوامی بنک کے قیام کے مسئلوں پر متحدہ اقوام کے مندوبین نے غور و خوض کیا تھا

ہندوستانی وفد نے اس موقع پر اسٹرلنگ فاضلات کے مسئلے کو وہاں اٹھایا تھا اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ بین الاقوامی ذخیرۂ زر کی معرفت ہندوستان کے اسٹرلنگ فاضلات بھی ادا کر دیے جائیں تاکہ ہندوستان اپنی معاشی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے دنیا میں جہاں چاہے مشینیں اور ضروری سامان خرید سکے۔ لیکن کانفرنس نے اس تجویز کو اس بنیاد پر نامنظور کر دیا تھا کہ بین الاقوامی ذخیرہ زر اپنے وسائل کے محدود ہونے کی وجہ سے اس ذمے داری کو پورا نہ کر سکے گا۔

اس لئے اب اسٹرلنگ فاضلات کی ادائی کا معاملہ براہ راست برطانیہ ہی سے طے کرنا ہوگا۔

حکومت ہند کا محکمہ مالیات تعمیر مابعد جنگ کے لئے روپے کی فراہمی کے مسئلے پر بھی غور کر رہا ہے۔ ۱۹۴۴ء کا بجٹ پیش کرتے وقت وزیر سر جیرمی رائسمن نے بیان کیا تھا کہ اگر حالات موافق ہوئے تو جنگ کے بعد چھٹے یا پانچویں سال میں ایک ارب سالانہ کی تعمیر مابعد جنگ کے کاموں کو پورا کرنے کے لئے نکالا جا سکے گی۔ موافق حالات سے ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر اقوام متحدہ بین الاقوامی کوشش سے روزگار ...

پیداوار دولت کو مکمل طور پر جاری رکھا گیا۔ (۲) فوج کی بڑھتی کی رفتار معقول حد تک تیز نہیں اور (۳) ملک کی اہلیت ادائی محصول سے حکومت نے مستقل مزاجی کے ساتھ پورا پورا فائدہ اٹھانا جاری رکھا تو ابتدائی ایک دو سال کے خسارہ کے بعد اس توقیر کو حاصل کرنا ممکن ہوگا

اس کے علاوہ اگر رعایا سے قرض لینے کے ان طریقوں کو جنہیں جنگ کے زمانے میں دریافت کیا گیا ہے جاری رکھا گیا تو یہ توقع ہرگز بے جا نہیں ہے کہ تعمیر مابعد جنگ کے منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے جنگ کی اولین پنج سالہ مدت گذرنے کے بعد دس ارب روپیوں کو فراہم کیا جاسکے گا۔ اس رقم میں نجی افراد کی سرمایہ کاری شامل نہیں ہے جس کے بارے میں عاملہ حکومت ہند کی منصوبہ ساز کمیٹی کا اندازہ تھا کہ اس ذریعے سے بھی پانچ ارب روپیہ فراہم ہوسکے گا۔ صوبوں اور ریاستوں کی حکومتوں کے وسائل بھی اس رقم میں شامل نہیں کئے گئے ہیں۔

سر جرمی رائسمین کی یہ رائے تھی کہ اولین پنج سالہ مدت کے بعد کی پنج سالہ مدتوں میں مالی وسائل کی ترقی دونی اور چوگنی رفتار یعنی ہندسی تناسب سے ہوتی رہے گی۔ لیکن انھوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ اس نتیجے کو حاصل کرنے کے لئے منصوبہ سازی کو معقول مالی بنیاد پر قائم کرنا ہوگا۔ انفرادی منصوبوں کو اس طرح تیار کرنا ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوں اور ایسی اسکیموں کو ترجیح دینا ہوگی جو بلا واسطہ طریقے پر دولت اور خوشحالی کی ترقی کا موجب ہوں گی اور اپنی ترقی سے سرکاری آمدنی کو بڑھانے میں معاون ثابت ہوں گی۔

اپنی آخری بجٹ کی تقریر میں سر جرمی رائسمین نے مابعد جنگ کی مالیات کے بارے میں اپنے خیالات کو اور واضح صورت میں پیش کیا۔ انھوں نے بتلایا کہ جنگ کے بعد مالی محاصل کو بڑھانے کے لئے مندرجہ ذیل ذرائع کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ زراعتی جائداد کے علاوہ باقی جائداد پر محصول جائداد لگاکر

۲۔ زراعتی آمدنی پر انکم ٹیکس لگاکر۔

۳۔ محصول کروڑ گیری سے جنگ کے فوراً بعد تو بے مثال آمدنی بڑھائی جاسکے گی لیکن اس کے بعد آمدنی گھٹ جائے گی۔ لیکن پھر بہت سے سالوں تک آمدنی اضافہ کی طرف مائل رہے گی۔ لیکن جب صنعتوں کو ترقی ہونا شروع ہوگی تو آمدنی کے اس ذریعے میں توسیع نہیں ہوسکے گی بلکہ مستقل زوال شروع ہوجائے گا۔

۴۔ مرکزی محاصل اکسائز پر پہلے سے زیادہ بھروسہ کرنا پڑے گا۔

۵۔ محاصل فروخت یا مقررہ مدت کی بکری کے محاصل کی توسیع کرنا ہوگی۔

اس کے علاوہ سرجرمی رالیس مین نے یہ کہا کہ حکومت اپنی آمدنی کے ذرائع میں اضافہ کرنے کے لئے بعض صنعتوں کو بھی اپنی ملکیت اور انتظام میں لے سکتی ہے۔

غرض جنگ کا اثر ہندوستان کی مالیات عامہ پر اور اعتبارات سے چاہے کتنا ہی مضرت رساں کیوں نہ رہا ہو لیکن اس لحاظ سے بہت خوش گوار پڑا ہے کہ اس کی وجہ سے تعمیری کاموں کے لئے روپے کی فراہمی کے امکانات بہت بڑھ گئے ہیں اور حکومت کے لئے کسی تعمیری کام کو یہ عذر کرکے ٹالنا آسان نہیں رہا ہے کہ اس کے لئے وسائل فراہم نہ ہوسکیں گے۔ لارڈ ویول ہندوستان کے موجودہ وائسرائے نے اپنے عہدے کا چارج لینے سے پہلے انگلستان میں ایک تقریر کی تھی جس کا یہ اقتباس اس ضمن میں دلچسپی سے خالی نہیں۔

"مجھے یہ بات ہمیشہ بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ جنگ کے لئے کتنا ہی روپیہ کیوں نہ طلب کیا جائے اس کی فراہمی میں کبھی دقت نہیں ہوتی۔ لیکن کسی قوم نے آج تک امن کے زمانے کی خرابیوں یعنی افلاس، جہالت بے روزگاری اور بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے اس پیمانے پر روپیہ

فراہم نہیں کیا ہے جس پر جنگ کے لئے کیا جاتا ہے۔ جب ہم اپنا روپیہ اور کوشش اسی آزادی اور اسی جذبے کے ماتحت جو ہم ہٹلر کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ ان خرابیوں کے دور کرنے کے لئے بھی استعمال کرنے لگیں گے تب حقیقت میں ترقی کا کام شروع ہوگا۔ جس ملک میں میں جا رہا ہوں (یعنی ہندوستان) وہاں افلاس، جہالت اور بیماری کا مقابلہ اتنے بڑے پیمانے پر کرتا ہے جتنا شاید دنیا میں کسی دوسری جگہ نہیں کرتا ہے۔"

وائسرائے ہند کی یہ تقریر ہمارے مستقبل کے وزرار مالیات کے لئے ایک چیلنج ہے کیا وہ اس چیلنج کو قبول کریں گے؟

روس میں عورتوں کی اصلاح و ترقی اور بچوں کی نگہداشت

بالشوکوں نے روسی قوم کی اصلاح و ترقی کا کام مردوں سے نہیں بلکہ عورتوں سے شروع کیا۔ یورپ اور امریکہ میں عورتوں کی آزادی کی تحریکیں یوں تو متفرق طور پر تقریباً ایک صدی سے چل رہی تھیں اور آہستہ آہستہ عورتوں کے لئے مردوں کے برابر حقوق حاصل کئے جا رہے تھے لیکن روس میں یہ کام نہایت تھوڑے عرصے میں ایک ہمہ گیر منصوبے کے ماتحت کیا گیا۔ کسانوں اور مزدوروں کی عورتوں کو نہ صرف زمیندار اور سرمایہ دار کے استحصال ناجائز سے آزاد کیا گیا۔ بلکہ باپ اور شوہر کے بے جا اقتدار کی بندشوں کو بھی ختم کیا گیا اور ان کی حیثیت اور ان کے مرتبہ کو ہر لحاظ سے مردوں کے برابر قرار دے دیا گیا۔ چاہے معاملہ شہری حقوق کا ہو، چاہے آمدنی کے حصول اور اس کے صرف کا۔ چاہے رہنماؤں کی جگہوں پر تقرر کا، ہر معاملے میں عورت کو مختار بالذات بنا دیا گیا اور انسانی تعلقات کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا اور ایک نئے نظام کے تحت دیا گیا۔

روس کی عورتوں کی حالت انقلاب سے پہلے بہت خستہ اور ابتر تھی۔ روس کی آبادی کا دسواں حصہ مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اسلام نے اپنی ترقی کے ابتدائی روشن دور میں عورتوں کی حیثیت میں ایک انقلابی بلندی پیدا کی تھی لیکن اس کے شاندار کارنامے کو روس اور دیگر اسلامی ملکوں کے مسلمان ایک زمانہ ہوا بھلا چکے تھے۔ ہندوستان کی طرح، روس کے مسلمانوں میں بھی پردے کا رواج عام تھا اور عورتیں تمام حقوق سے محروم تھیں۔ دس گیارہ برس کی عمر میں اپنے شوہر کے ہاتھ فروخت کر دی جاتی تھیں اور ان سے لونڈیوں اور باندیوں کی طرح کام لیا جاتا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ قانونی طور پر اس کے قریب ترین عزیز کی ملکیت بن جاتی تھیں اور [illegible] کے ترکے میں بانٹ [illegible] مسلمانوں کے ساتھ [illegible]

اور عملاً ان ہی چیزوں کی طرح انھیں بھی کسی اچھے گاہک کے ہاتھ فروخت کیا جا سکتا تھا۔

جن عورتوں کا تعلق عیسائی مذہب سے تھا ان کی حالت بھی اس سے بہتر نہیں تھی۔ انھیں اپنے شوہر کے مقابلے میں کسی قسم کا کوئی قانونی حق حاصل نہ تھا۔ زار روس کے شہری قانون میں یہ بات صراحت کے ساتھ بیان کر دی گئی تھی کہ "عورت کو ہر معاملے میں شوہر کی اطاعت کرنا چاہیے اور کبھی بھی اس کی نافرمانی نہیں کرنا چاہیے" (دفعہ ۱۰۷ جلد دہم) وہ اجرت پر کوئی کام اس کی اجازت کے بغیر نہیں کرسکتی تھی۔ (دفعہ ۲۲۰۲ جلد دہم) اگر کوئی عورت معلم، نرس یا ٹیلیگراف آپریٹر بن جاتی تھی تو شادی ہو جانے پر فوراً برطرف کردی جاتی تھی۔ شادی شدہ عورت کو عام طور پر پاسپورٹ نہیں مل سکتا تھا بلکہ شوہر کے پاسپورٹ پر بیوی کا نام درج کیا جاتا تھا۔ اس لئے وہ شوہر کے بغیر اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ اگر کوئی عورت اپنے شوہر سے اجازت حاصل کئے بغیر کہیں چلی جاتی تھی تو پولیس والے ایک مفرور قیدی کی طرح پکڑ کر گھر واپس پہنچا دیتے تھے۔ نہایت ظالم اور غیر موزوں شوہر سے بھی عورت کسی صورت سے علیحدہ نہیں ہو سکتی تھی۔ شوہر اگر طلاق کے لئے رضامند بھی ہوجاتا تھا تب بھی یہ صورت ممکن نہیں تھی۔ تقریباً تمام کسان عورتیں اور شہر کی تین چوتھائی عورتیں ناخواندہ تھیں۔ ٹالسٹائی نے اپنے ڈرامے "تاریکی کی طاقت" میں روس کی دیہاتی عورت کی حالت کا نقشہ، کسان میٹریش کی زبانی ان الفاظ میں کھینچا ہے "کسان کی عورت کیا ہے محض ایک نکمی اور ردی چیز۔ یہ نپٹ اندھی اور بہری ہے۔ یہ بالکل کچھ نہیں جانتی۔ اس نے کبھی کچھ دیکھا ہے نہ سنا ہے۔ ایک مرد تو کسی شراب خانہ یا جیل خانہ یا فوج میں جہاں اسے دوسرے آدمیوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے کچھ سیکھ بھی لیتا ہے لیکن ایک عورت سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ کیا اسے کوئی پڑھاتا ہے؟ اس کو سکھانے والا تو بس ایک ہی ہوتا ہے یعنی وہ شراب میں مدہوش مزیک (کسان)، جو اس پہ اپنے کوڑے برساتا ہے اور یہی تعلیم کا وہ کھاتا ہے جو اسے میسر آئی ہے"

غرض روس کی نصف بالغ آبادی کی حالت ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے وقت کچھ اس قسم کی تھی۔

انقلاب کے ایک ہی سال بعد نومبر ۱۹۱۸ء میں سارے روس کی مزدور اور کسان عورتوں کی کانفرنس ماسکو میں منعقد کی گئی جس میں ۱۲۰۰ مندوبین شریک ہوئیں۔ یہ سوویٹ روس کی دس لاکھ مزدور عورتوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ عورتوں کے اندر انقلاب نے ایک حرکت پیدا کر دی تھی اور ان کی یہ تحریک آپ ہی آپ چل رہی تھی۔ روس میں عورتوں کی آزادی کی تحریک کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ عورتوں کی قانونی یا انتخابی نا اہلیتوں کو دور کیا جائے بلکہ ان کی معاشی اور خانگی ماتحتی کو دور کرنا بھی مساوی اہمیت رکھتا تھا۔ لینن نے ایک موقع پر کہا تھا "سوشلزم کی فتح اس وقت تک ناممکن ہوگی جب تک کہ انسانیت کا پورا نصف حصہ یعنی محنت کش عورتیں، مردوں کے برابر حقوق حاصل کرنے سے معذور رہیں گی اور وہ گھر اور خاندان کے اندر غلاموں جیسی زندگی بسر کرتی رہیں گی"۔ یہی وجہ تھی کہ روس کے تمام قوانین اور عاملہ کے احکامات میں جنسی مساوات کو ایک بنیادی اصول قرار دیا گیا۔ چاہے عورت شادی شدہ ہو چاہے تنہا۔ ہر صورت میں رائے دہندگی کے معاملے میں اس کی اہلیت مرد کے مساوی تسلیم کی گئی۔ سرکاری عہدوں پر تقرری کے لئے اُسے مردوں کے مساوی موزوں سمجھا جانے لگا۔ وہ پوری آزادی کے ساتھ ٹریڈ یونین، کوآپریٹو سوسائٹی اور دیگر تمام انجمنوں کی رکن بننے لگی ایک ہی طرح کے کاموں کے لئے اُسے وہی معیاری اُجرت دی جانے لگی جو مردوں کو دی جاتی تھی اور اُسے ہر قسم اور ہر درجے کی ملازمت اور روزگار کے لئے مردوں کے برابر موزوں سمجھا جانے لگا۔ شادی سے پہلے جن چیزوں پر اس کی ملکیت قائم ہوتی تھی، شادی کے بعد ان چیزوں پر اس کی ملکیت جاری رہتی تھی۔ شادی کے زمانے میں رشتۂ ازدواج کے دونوں فریق جو چیزیں حاصل کرتے تھے اس میں دونوں برابر کے شریک ہوتے تھے۔ شادی کو طلاق کے ذریعے ختم کرنے کے سلسلے میں عورت کو بھی وہی حقوق دئے گئے جو مردوں کو حاصل تھے۔ شادی کے

زمانے میں جو اولاد پیدا ہوتی تھی طلاق کے بعد اس کی کفالت اور رشتہ ازدواج کے دونوں فریق میں سے جو بھی حاجت مند ہو اس کے نان نفقہ کی ذمے داری مساوی طور پر قبول کرنا پڑتی تھی۔ ان تمام حقوق ہی کی بنیاد پر لینن نے ۱۹۲۰ء میں اس بات کا دعوےٰ کیا تھا کہ دنیا میں روس کے علاوہ کسی دوسرے ملک میں عورت کو ان محرومیوں اور نا قابلیتوں سے جن کا وہ رسم ورواج یا قانون کی بنا پر شکار تھی اتنے مکمل اور غیر مشروط طریقے پر آزاد نہیں کیا گیا جیسا کہ دول ہائے متحدہ اشتراکی روس میں کیا گیا ہے" قانونی طور پر مرد اور عورت میں مکمل مساوات قائم کر دی گئی ہے اور ہر جگہ اس کو خلوص کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ عورتوں کو معاشری تنظیم قانون اور حکومت کے کام میں پوری طرح شریک کیا جا رہا ہے۔ تمام درسگاہیں ان کے لئے کھلی ہوئی ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی جماعتی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو ترقی دے سکتی ہیں۔ مشترک مطبخ، پبلک طعام خانے، دھوبی گھر مرمت کی دکانیں شیر خوار بچوں کی پناہ گاہیں، کنڈر گارٹن، بچوں کے گھر اور ہر قسم کی دوسری درس گاہیں، قائم کی جا رہی ہیں۔ روس اپنے پروگرام کی اس شق کو کہ ہر گھر کے جدا جدا معاشی اور تعلیمی فرائض جماعت کے مشترکہ انتظام میں لے آئے جائیں سرگرمی کے ساتھ پورا کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ عورت گھر کی غلامانہ مشقت اور مرد کی ماتحتی سے آزاد ہو جائے گی اور وہ اپنی قدرتی صلاحیتوں اور میلانوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے گی۔ بچوں کی پرورش بھی گھر کے مقابلے میں بہتر ماحول میں کی جانے لگی ہے۔ ہمارے ملک میں مزدور عورتوں کی حفاظت کے لئے جیسے قوانین ہیں دنیا میں ایسے کہیں نہیں ہیں۔ ٹریڈ یونین کے عہدہ دار قوانین کی تعمیل کراتے رہتے ہیں۔ زچگی کے ہسپتال، ماؤں اور بچوں کے لئے گھر۔ امومت کی تعلیم گاہیں (جہاں یعنی مشاہدہ عورت ماں بننے کی تعلیم دی جاتی ہے) بچوں کی نگہداشت کے لئے کورسوں کا کورس ماؤں کو یہ سکھلانے کے لئے کہ اپنے بچوں کی اور خود اپنی خبر گیری کس طرح کرنی چاہیے نمائشیں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں قائم کی جا رہی ہیں۔ جو عورتیں بے روزگار ہیں یا بیمار ہیں ان کے

گزر بسر کرنے کے انتظامات کے لئے بھی سنجیدگی کے ساتھ کوشش کی جا رہی ہے۔[1]

یہ بیان تحریک کے آغاز کے وقت کا ہے لیکن اب تقریباً بیس پچیس برس گزرنے کے بعد جب ترقی کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ آزادی کے نتائج نہ صرف عورتوں کی عملی آزادی کی صورت میں بہت شاندار برآمد ہوئے ہیں بلکہ اس کا اثر عورتوں کی دماغی اور جسمانی نشو و نما پر بہت پسندیدہ ثابت ہوا ہے۔ اس دوران میں نہ صرف ان کی تندرستی اور طوالت عمر میں اضافہ ہوا ہے بلکہ ان کے ذہنی کارنامے اور ہر شعبۂ زندگی میں ان کی کامیابیاں نہایت نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہیں ۱۹۱۷ء میں عورتوں میں ناخواندوں کا تناسب مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا لیکن اب بالغوں میں بہت کم ایسے لوگ رہ گئے ہیں جو کم از کم پڑھنا یا لکھنا نہیں جانتے۔ مدرسوں میں لڑکیوں کا تناسب تقریباً اتنا ہی ہے جتنا کہ لڑکوں کا ہے۔ روس میں مزدوروں کی جو کمی نہ صرف صنعتوں اور ہلکی صنعتوں میں بلکہ زراعت اور وزنی صنعتوں میں پائی جاتی تھی عورتوں کے آزاد ہو جانے کی وجہ سے اس میں بہت کمی واقع ہو گئی ہے۔

روس میں معلموں اور ڈاکٹروں کی فہرست میں عورتوں کی تعداد دو تہائی کے قریب ہے اور مخصوص طور پر تربیت یافتہ ماہرانِ زراعت میں ان کا تناسب بہت زیادہ ہے سائنس کی تحقیقات کے ہر شعبے میں ان کی اکثریت ہے۔ ان سند یافتہ صنعتی ماہروں میں جو پنج سالہ یونیورسٹی نصاب پورا کرتے ہیں۔ اور جنھیں سالانہ روز افزوں تعداد میں مشین سازی، مرمت مشین، کیمیاوی اور بجلی کے کارخانوں میں بھرتی کیا جاتا ہے، عورتوں کا تناسب تقریباً ایک تہائی ہے ریل چلانے والوں اور ریل کے انتظامی عملہ میں بھی اُن کی تعداد بہت خاصی ہے واقعہ یہ ہے کہ عورتیں ہر پیشے میں کام کرتی ہوئی ملتی ہیں حتیٰ کہ فوج، بحری بیڑہ اور ہوائی جہاز میں بھی عورتیں کام کرتی ہیں۔ صنعت کے کام پر بھی مامور کی جا چکی ہیں سفیر بالیات بھی رہ چکی ہیں اور

[1] سوویٹ [illegible] از [illegible] (۱۹۴۳ء) صفحہ ۵۵

سیکڑوں عورتوں کو غیر معمولی خدمات کے صلے میں لینن کے تمغے اور سُرخ پرچم کے تمغے عطا کئے گئے ہیں۔

روس کی عورتیں اور مادریت کی ذمّے داری | لیکن عورت کی اصلاح و ترقی کا کام صرف اسی سے ختم نہیں ہو جاتا کہ اُسے قانونی اور سیاسی بندشوں سے آزاد کر دیا جائے یا معاشی محرومیوں سے اُسے نجات دلا دی جائے۔ عورت کے ذمے ایک مخصوص فریضہ عائد کیا گیا ہے جس کو نہایت زبردست پبلک اہمیت حاصل ہے اور اس کی انجام دہی میں اُسے نہ صرف اپنی تندرستی کو سخت خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے بلکہ سرمایہ دارانہ ملکوں میں اس کے مالی بوجھ سے بھی والدین کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ ان ملکوں میں محض زچگی اور شیر خوار بچّے کی نگہداشت کے خرچ بعض وقت اتنے ہو جاتے ہیں کہ اُجرت پیشہ طبقہ ان کے بوجھ سے عمر بھر چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا اور مزمن افلاس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ صدیوں تک ایسے موقعوں پر نجی خیر و خیرات کے ذریعے امداد کی جاتی رہی۔ کہیں کہیں (مثلاً انگلستان میں) غربا کی امداد کے لئے جو سرکاری انتظامات تھے اور جن کے قبول کرنے کی وجہ سے آدمی اپنے ہم چشموں میں ذلیل اور کم حیثیت سمجھا جانے لگتا تھا ان میں اس امداد کو بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ موجودہ صدی میں بعض ملکوں نے اپنے معاشری بیمے کے قومی انتظامات میں زچگی کے زمانے کی ایک مختصر اور ناکافی امداد کو بھی شامل کر لیا ہے۔ لیکن بالشوکوں کے یہاں ابتدا ہی سے حاملہ عورت کو سرکار کی طرف سے جملہ سہولتیں اور رعایتیں فراہم کرنا نہایت ضروری سمجھا گیا تاکہ وہ اپنے فرائض کو جو اس پر ماں، دولت آفریں کارکن اور شہری کی مختلف حیثیتوں سے عاید ہوتے ہیں حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکے۔ جس طرح ایک فرد کو وہ تمام مصارف سرکار کی طرف سے ادا کر دئے جاتے ہیں جو وہ اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے دوران میں اپنی طرف سے کرتا ہے۔ اسی طرح عورت کو بھی اپنے مخصوص فرائض منصبی یعنی بچّہ دادری کے ذیل میں جو غیر معمولی مصارف اُٹھانا پڑتے ہیں ان کی ادائی کی ذمے داری سرکار پر ہوتی ہے

ہے جو سوویٹ سرکار کی طرف سے عورت کے اس درد اور اذیت کے ساتھ جو اس سلسلے میں لازمی طور پر اُسے برداشت کرنا پڑتی ہے انتہائی ہمدردی کی جاتی ہے۔ روس میں بچہ داری کے جو مصارف کو جہاں تک ممکن ہے مفروضہ فرائض منصبی کی انجام دہی کے مصارف میں شامل سمجھا جاتا ہے۔

اگر کوئی عورت شہر یا دیہات میں اجرت یا تنخواہ پر یا تو خود ملازم ہوتی ہے یا اس کا شوہر ملازم ہوتا ہے اور وہ ماں بننے والی ہوتی ہے تو سوویٹ سرکار سب سے پہلے تو حمل کے زمانے میں اس کی طبی نگہداشت کا بلا معاوضہ انتظام کرتی ہے۔ پھر زچگی کے ہسپتالوں میں اس کا داخلہ کراتی ہے ۱۲ سے ۱۶ ہفتے تک کی رخصت با تنخواہ دیتی ہے (یعنی ۶ سے ۸ ہفتے کی رخصت وضع حمل سے پہلے اور اتنی ہی مدت کی رخصت وضع حمل کے بعد) اس دوران میں طبی نگہداشت اور امداد کا مسلسل انتظام رکھتی ہے جب وہ طبی طور پر تندرست قرار دے دی جاتی ہے تو اپنی پرانی جگہ پر دوبارہ مقرر کئے جانے کی مستحق ہوتی ہے اور ہر ساڑھے تین گھنٹے کے بعد اُسے بچہ کو دودھ پلانے کی مہلت دی جاتی ہے بچے کے کپڑوں کے لئے بھی اُسے روپیہ دیا جاتا ہے اور پہلے سال کے دوران میں بچے کی غذا کے لئے بھی ایک ماہانہ عطیہ دیا جاتا ہے اور بچوں کی سرکاری پرورش گاہ میں بچے کے لئے جب تک اس کی عمر دو مہینے اور ۵ سال کے درمیان رہتی ہے ایک نشست محفوظ کر دی جاتی ہے جہاں جب ماں کام کر رہی ہو تو سرکاری دایہ اس کے بچے کی نگرانی کرتی ہے۔ سوویٹ سرکار کی طرف سے ان تمام رعایتوں کا منشا یہ ہے کہ عورت ماں بننا ایک لعنت، مصیبت یا حقیر اور تکلیف دہ چیز نہ سمجھے بلکہ جتنا طبی طور پر ممکن ہے ماں بننے کے بعد بھی ہر پیشے میں لگے رہنے کی اتنی ہی آزادی حاصل رہے۔ اپنے کام میں اس کی دولت آفرینی کی اہلیت اتنی ہی رہے اور اس کی آمدنی اتنی ہی اچھی رہے جتنی کہ ماں بننے سے پہلے تھی۔

[illegible]

کے بچوں کی نگہداشت کا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا گیا ہے۔ یہ انتظام ابھی تک سارے ملک میں نہیں پھیل سکا ہے، لیکن تیزی کے ساتھ شہروں سے شروع ہو کر دیہاتوں میں پہنچتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں جو ادارے کام کر رہے ہیں۔ ان کے ذمے بچوں کی پوری دیکھ بھال پھیر کی گئی ہے۔ وہ انھیں غذا بھی کھلاتے ہیں، کپڑے بھی پہناتے ہیں۔ نہلاتے دھلاتے بھی ہیں۔ پڑھاتے بھی ہیں۔ تربیت بھی دیتے ہیں اور ان کی تفریح و دلبستگی کا بھی انتظام کرتے ہیں۔

ان اداروں میں سب سے اول تو "مرکز مشاورت" کا نمبر آتا ہے۔ جس کے فرائض میں ہر بچے والی ماں کو مشورہ دینا داخل ہوتا ہے۔ زچگی کے زمانے سے ان کے مشوروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر، نرسیں اور مشیر قانونی مستقل طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ دودھ کے مطبخ بھی ہوتے ہیں جہاں سے بچوں کو روزانہ دودھ کا راشن تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان کا ایک کام یہ بھی ہوتا ہے کہ ماؤں کو اپنے بچوں کو چھوڑنے سے باز رکھیں اور اگر اس میں وہ کامیاب نہ ہوں تو ان کے بچوں کے پالنے کا مناسب انتظام کریں۔ اس کام کے لئے سب سے پہلے تو وہ حاملہ عورتوں پر نگرانی رکھتے ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتے اور ہمت بڑھاتے ہیں اور انھیں ضروری قانونی مشورے دیتے ہیں۔ اگر اس میں وہ ناکام رہتے ہیں تو پہلے یہ کوشش کرتے ہیں کہ ایسے بچوں کو دوسرے لوگ گود لے لیں۔ جب یہ بھی ممکن نہیں ہوتا تو وہ ان مخصوص اقامت خانوں میں جو اسی کام کے لئے ان کی زیر نگرانی رکھے گئے ہیں۔ بچوں کو داخل کر لیتے ہیں۔

مرکز مشاورت کے بعد بچوں کی نگہداشت کے کام میں دوسری منزل یہ ہے کہ بچوں کی نگہداشت گاہوں (کریشز) کا انتظام کیا جائے جس میں دو مہینے کی عمر سے بچوں کی نگہداشت کی جاتی ہے۔ اس نگہداشت کی مختلف موقعوں پر ضرورت ہوتی ہے مثلاً جب ان کی ماں اپنے کام پر جاتی ہے یا شام کے وقت کلب میں جاتی ہے یا تفریح کے لئے نکلتی ہے ...

ریل کے ڈبوں میں بھی ان پرورش گاہوں کا انتظام رکھا جاتا ہے تاکہ سفر کرنے والی ماؤں کو اپنی اولاد کی وجہ سے کسی مخصوص زحمت اور دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس قسم کی پرورش گاہیں روس میں بہت زیادہ ہیں، اور ان کی تعداد میں روز بروز تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ ماں کو جہاں تک ہو سکے بچوں کی مسلسل نگہداشت کے حق اور جاذب توجہ کام سے آزاد کیا جا سکے۔ چنانچہ جہاں کہیں اس قسم کی پرورش گاہیں موجود ہیں وہاں دن کے کم از کم ایک تہائی حصے کے لئے ماں اپنے بچے کی ذاتی نگہداشت سے آزاد ہو جاتی ہے۔ اور ان پرورش گاہوں کا خرچ اسے خود برداشت نہیں کرنا پڑتا بلکہ سرکار ان کا انتظام کرتی ہے

مشاورت کے مرکزوں، دودھ کے مطبخوں اور پرورش گاہوں کے علاوہ ملک کے اندر آیہ خانوں، گہوارے کے مدرسوں اور کنڈرگارٹنوں کا بھی ایک جال بچھا ہوا ہے جو روز بروز زیادہ پھیلتا جا رہا ہے۔ ان سب انتظامات کا نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کے کھلانے پلانے کی ذمے داری سے بڑی حد تک کپڑے کی ذمے داری سے ایک جزئی حد تک اور طبی نگہداشت کی ذمے داری سے مکمل طور پر والدین بچے کی پیدائش سے لے کر سات آٹھ برس کی عمر تک بڑی حد تک بری ہو گئے ہیں اور یہ کام سرکار نے خود اپنے ذمے لے لیا ہے۔ لیکن یہ ذمے داری اس طرح لی گئی ہے کہ بچوں کو اپنے گھر اور اپنی ماں کی ذاتی نگرانی سے علیحدہ نہیں کیا گیا ہے۔ لوگوں میں امداد اور خیرات کا کوئی باعث ذلت احساس پیدا نہیں ہونے دیا گیا ہے اور نہ لوگوں میں والدین کی ذمے داری کو کسی طرح کم کیا گیا ہے۔ خانگی زندگی کی یک جہتی اور آزادی میں اگر اس کی وجہ سے کوئی خرابی یا ابتری پیدا ہوئی ہے تو وہ بلاشبہ اس سے کم ہے جتنی کہ سرمایہ دار ملکوں میں طبقہ متوسط یا طبقہ اعلیٰ کے بچوں کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔

انضباط تناسل | روس کی شرح پیدائش اور شرح اضافہ آبادی کو دیکھتے ہوئے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہاں مانع حمل طریقوں کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہوگی۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے روس میں انضباط تناسل کی اختیاری کوششیں ہالینڈ، آسٹریلیا، فرانس، جرمنی، انگلستان

...مریکے بھی کم کی جاتی ہیں۔ وہاں ماں بننا اور بچے رکھنا ایسی معیبت نہیں ہے جیسا کہ دوسرے ملکوں میں ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہاں مانع حمل طریقوں کو استعمال کرنا یا ان کے بارے میں گفتگو کرنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ بلکہ صورت اس کے برعکس ہے۔ شہروں میں اس موضوع پر نوجوان اور بوڑھے آزادی سے بحث کرتے ہیں۔ تعلیمی پوسٹروں اور طبی مشوروں میں بھی اس کو خاصی اہمیت دی جاتی ہے "مشورہ کی چوکیوں" سفری ہسپتالوں اور کلینک میں اس کے بارے میں ہدایت اور تعلیم کا باقاعدہ انتظام رکھا جاتا ہے اور لوگ اس سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ اور اس معاملے میں جو بے تکلفی اور آزادی پائی جاتی ہے اسے بالکل معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

غرض عورتوں اور بچوں کے لئے روس میں بہتر حالت پیدا کرنے کی یہ کوششیں ہیں جو کی جا رہی ہیں۔

دلی کی لاہوری برادری

(گذشتہ سے پیوستہ)

ضمیمہ

(ضمیمہ)

لاہوری برادری کے ممتاز لوگوں کا تعارف | لاہوری برادری صناع برادری ہے۔ صنعت میں جو لوگ نامور ہیں وہی برادری کے ممتاز آدمی ہیں اس سے قطع نظر کہ ان کا شمار اہل ثروت میں ہے یا نہیں۔ اس لئے یہاں پر ہم صنعت کے صرف ان ماہروں کا ذکر کرتے ہیں جو اپنے کمال ہنرمندی میں ساری برادری میں ممتاز ہیں۔ علمی پیشوں اور ملازمت کے پیشے کے ماتحت چند نام خانہ پری کی دلچسپی قائم رکھنے کے لئے دئے گئے ہیں۔ اسی طرح مرحوم صناعوں کے نام محض حوالے کے لئے لکھے گئے ہیں۔

ڈزائنر عبدالرؤف صاحب، پہاڑ گنج۔ زیورات کے نمونوں کا نقشہ بنانے میں مشہور ہونہار کاری گر ہیں اور تمام ہندوستان کے جوہری ان سے رجوع کرتے ہیں۔

انگریور | منشی ممتاز الدین صاحب، پہاڑ گنج۔ انگریونگ (چھپائی) میں انگریزی وضع کے کام کے استاد ہیں۔

سادہ کار، متعلقہ صنعتوں کے ساتھ | (۱) چودھری محمد یوسف صاحب، کوچہ رائے مان۔ اُن کے بزرگ قلعہ دہلی میں کام کرتے رہے۔ یہ شاہی صناع کہلاتے ہیں۔

۲۔ محمد اصغر صاحب، کوچہ استا حامد۔ مشہور سادہ کار اور جوہری ہیں متمول اور برادری میں با اثر ہیں۔

۳۔ حاجی حبیب احمد صاحب، پہاڑ گنج۔ اعلیٰ درجے کے سادہ کار ہیں۔ ضمنی خصوصیات شکار کھیلنے کا شوق جانتے ہے جو باپ دادا سے ورثے میں چلی آتی ہے۔ یہ برادری کے ممتاز چودھری ہیں۔

(۴) عنایت الرحمٰن صاحب، پہاڑ گنج۔ نامور اور اعلیٰ درجے کے استاد ہیں۔ ان کے والد مرحوم کو اُن کے صنعتی کمال کے اعتراف میں امیر حبیب اللہ والیٔ کابل نے ۲۰۰ روپیہ تحفہ دیا اور افغانستان سے کچھ کاری گر اُن سے سادہ کاری سیکھنے کے لئے بھیجے تھے۔

(۵) سعادت اللہ، باڑہ ہندو راؤ۔ بڑھیا سادہ کاروں میں ان کا شمار ہے۔ نیز فن آتش بازی میں ان کو کمال مہارت ہے۔ شاہی زمانے کی صنعت آتش بازی میں بے نظیر ہیں۔

(۶) نیاز احمد عرف نیازی۔ صدر بازار۔ گلٹ اور چاندی کے کام کے ملنے ہوئے کاری گر۔ فن بیراکی کے زبردست استاد ہیں۔ ہندوستان کے سینکڑوں نامی پیراک ان کے شاگرد ہیں۔

مذکورہ بالا ماہرین صنعت کے علاوہ مندرجہ ذیل سادہ کار بہت مشہور کاری گر ہیں:۔ الطاف احمد، سادہ کار، پہاڑ گنج۔ حافظ عبدالعلیم سادہ کار، پہاڑ گنج۔ محمد احمد عرف محمد سادہ کار۔ جمیل الرحمٰن، امین الرحمٰن سادہ کاران۔ اخلاق احمد، سادہ کار۔ فخرالدین، سادہ کار۔

مصور استاد عبدالکریم مرحوم۔ عبدالحمید مرحوم (پہاڑ گنج) اور محمد حسین مرحوم (کوچہ چیلان) پچھلے برسوں میں مشہور سند استاد مصور رہے ہیں۔ ہاتھی دانت کی پلیٹ پر تصویر بنانے کے کام میں یہ دہلی کے سب سے بڑے استاد تھے۔ ریاستیں ان کی سرپرستی اور قدر افزائی کرتی تھیں۔ ان کے کام کے بعض نمونے آگرہ اور دہلی کے قلعہ کی آرٹ گیلری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان اساتذۂ فن کے انتقال کو کچھ ہی سال گذرے ہیں۔ موجودہ نسل کے نامی مصور مندرجہ ذیل ہیں اور خاص شہرت رکھتے ہیں:۔

(۱) محمد ظفر صاحب نبیرہ مشہور استاد محمد فضل مصور۔ حسن خان صاحب مصور۔

نقاش عبداللہ نقاش اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن نقاش مشہور طلاکار نقاش رہے ہیں دونوں کا انتقال ہو گیا ہے۔ حبیب الرحمٰن نقاش برادری کے نہایت ممتاز اور مشہور شخص

تعارف نمبر۔ افسوس ہے چند برس پہلے وہ جوان موت مرگئے۔ ان کی اعلیٰ صنعت کے کئی کارنامے اور طلاکاری کے نمونے دہلی کے لال قلعے۔ سلطان نظام الدین کے آستانے کی دیواروں اور وائسرائے ہاؤس دہلی کے ایوان میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ صنعت لاہوریوں کی خصوصیت تھی لیکن اس صنعت کے کمال کا مالک کوئی لاہوری کاری گر اب نظر نہیں آتا۔ بظاہر یہ صنعت لاہوریوں سے اب ختم ہوتی معلوم ہوتی ہے۔

پیتل کی صنعت، ظروف سازی | خلیفہ نثار احمد صاحب، پہاڑ گنج۔ برنجی ظروف سازی میں تمام دہلی میں ممتاز ہیں۔ سینکڑوں اس صنعت میں ان کے شاگرد ہیں۔ یہ برادری کے چودھری ہیں۔

استاد سراج الدین، محلہ گڑھیا، ظروف سازی میں باکمال استاد ہیں۔ مذکورہ بالا استادوں کے علاوہ پیتل اور چاندی کی صنعت ظروف سازی اور چاندی کے بڑے کام میں مندرجہ ذیل کاری گر ممتاز ہیں:۔

محبوب بخش صاحب۔ نور احمد صاحب۔ بشیر الدین صاحب، حفیظ احمد صاحب عمر فاروق صاحب۔ شیخ نیاز الدین صاحب۔ آخر الذکر کیمسٹری اور سائنس کے نازک اور پیچیدہ آلات بنانے میں مشہور کاری گر ہیں۔

گھڑی ساز | عبد الحی صاحب، کوچہ رائے مان۔ دہلی کے تمام گھڑی سازوں میں سب سے بڑے استاد ہیں۔

لوہے اور مشین اور موٹر وغیرہ کے مستری | محمد صدیق۔ محمد ابراہیم کا کرن۔ محمد یامین، حمزہ برہان۔ عبد المجید، عبد اللطیف (انبالہ) مستری محمد ہاشم، محمد قاسم، محمد اعظم نامور لوگوں میں ہیں۔ آخر الذکر اعلیٰ درجے کے الیکٹریشن اور مشینی کاموں کے بہت مشہور ماہر ہیں۔ پیتل اور [illegible] کی صنعتوں کے مذکورہ استاد جو در حقیقت استادِ کامل وادی [illegible] میں بکھرے ہوئے ملتے ہوئے لاہور آگئے ہیں۔ چنانچہ برادری کے

کاری گروں نے بلولیپ، اسپرٹ اسٹوو، سیفٹی ریزر، سائیکل کے پرزے بڑی مشینوں اور آلات کی مدد کے بغیر تیار کئے ہیں اور بازار میں بہت مقبول ہیں۔

مہرکن | چودھری ظہیر الدین صاحب نبیرہ استاد بدر الدین مہرکن کے علاوہ مندرجہ ذیل مہرکن اپنے کام کے اچھے کاری گر ہیں۔

عبدالرحمٰن صاحب، ضمیر الحق صاحب، محمد بشیر صاحب۔

لکڑی کے خرادی | محمد سلطان صاحب، خراد کے کام کے مشہور کاری گر ہیں۔

نعل بند | معل صاحب (کشمیری دروازہ) استاد نعل بند ہیں۔

شمشیر ساز، بندوق ساز | بشیر احمد صاحب جاگیر دار اور مشہور ماہر شمشیر سازی ہیں محمد عثمان صاحب (سبزی منڈی) بندوق سازی اور متعلقہ کاموں کے ماہر ہیں۔

ٹھپے ساز | لاہوریوں کی یہ نہایت اہم مگر گمنام صنعت ہے۔ الٰہی بخش قلب ساز اس فن میں دور دور جواب نہیں رکھتے تھے۔ اب اُن کے بیٹے محمد فاروق صاحب (بھاٹی گیٹ) اس کام کے اچھے کاری گر ہیں۔

زیور فروش، سادہ کار MANUFACTURING JEWELLERS | محمد احمد صاحب، دریبہ کلاں۔ فیض محمد صاحب، محمد سلطان صاحب سعید الرحمٰن صاحب۔ عنایت الرحمٰن صاحب۔

تاجر | سعید الحسن، نور الحسن۔ صدر بازار۔ فیاض الدین، سلیم الدین۔ حاجی عبدالغفار عبدالستار صدر بازار۔ محمد اسحٰق، امپورٹ اکسپورٹ ایجنٹ

دفتر کے ملازم | محمد ظفر صاحب، عبدالعلی صاحب، محمد ادریس صاحب۔ حافظ محمد ابراہیم صاحب بی اے۔ عنایت احمد صاحب بی اے۔ حافظ ضمیر الدین صاحب بی اے

ڈاکٹر | رفیق الدین صاحب۔ ایم، بی، بی ایس (کوچہ استاد حامد) کلینک انچارج ... ہسپتال ...

وکیل | رشید احمد صاحب بی اے، ایل ایل بی، ایڈووکیٹ (کوچہ ...)

شاعر: احمد حسن صاحب صوفی، کوچہ تریان۔ انھوں نے درویشی اختیار کر لی ہے۔ کلام میں پختگی، سادگی اور سوز و گداز کی کیفیت ہے۔

حوالہ: مضمون میں ہم نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس کی سند ہم کسی ذمے دار شخص یا کتاب سے نہ دے سکیں۔ مضمون کے دوران میں البتہ گنجلک سے بچنے کے لئے حوالے نہیں لکھے گئے۔ اس لئے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

راقم نے معلومات فراہم کرنے میں اپنے برسوں کے مشاہدے کے علاوہ لاہوری برادری کے بزرگوں سے مدد لی ہے۔

غیر ملکی کتابوں میں اس برادری کا حال تو کیا ملتا، زیور سازی کی صنعت کے ذکر میں بھی ہماری تلاش فی الحال بے نتیجہ رہی۔ لی بان کی کتاب تمدن ہند مترجمہ سید علی میں اس عظیم صنعت پر چند سطریں لکھی ہیں۔ اس میں زیور سازی کے کمال کا سہرا ہندو صناعوں کے سر رکھا ہے اور مسلمانوں کا نام تک نہیں لیا۔ سائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۱۱ء) میں البتہ ([illegible]) کے ذیل میں سادہ کاروں کی صنعت کے کمال کا اعتراف کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ انگلستان میں زیور سازی کے عظیم الشان مشینی کارخانوں کی صنعت کا ماخذ ہندوستانی صناع ہے جو اب بھی باوجود بے سروسامانی ولایتی پرزے کے جواب میں اپنی مہارت کا کمال پیش کرتا ہے۔

اردو کتابوں میں صرف دو کتابیں ہیں جن میں برادری کا ذکر ضمناً چند سطروں میں اور اس کی صنعت کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ پہلی کتابوں میں سید یوسف بخاری دہلوی کا مجموعہ مضامین یادگشت ہے جس میں دلی کی سادہ کاری اور جھکو پر مضامین ہیں۔ یوسف صاحب کے مضمون کا ذکر ہم اپنے مضمون میں لفظ سادہ کاری کی بحث میں کر چکے ہیں۔ انھوں نے خلوص اور محنت سے مضمون لکھا ہے۔ بنانے کو بھی انھوں نے اچھی طرح بیان کیا ہے، جو بہت عجیب ہے۔ لاہوری برادری والے کر بنایا بھی سمجھا ایسا ہی ہے جیسے

ہم کسی ماہر سے حق کو خیال کریں کہ یہ اچھا بکر قصاب بھی ہو سکتا ہے نیارا سادہ کاری کارخانوں
سے اس کوڑے کو کہتے ہیں جس میں چاندی سونے کے ذرات ملے ہوتے ہیں۔ نیاریا دہ کاریگر
ہے جو اس کوڑے کو کئی دن ناند میں بھگو کر اور بیسیوں بار چھان نتھار کر جو مرکب دھات
نکلے اسے کٹھالی میں آگ پر رکھ کر کیمیادی مسالوں سے سونا چاندی الگ کر لیتا ہے۔ نیاریا
یہ کوڑا کبھی تخمینی قیمت ادا کر کے خود خرید لیتا ہے کہ جتنا سونا چاندی اس میں نکلے اس کی قیمت
بھی سادہ کار اُسے مزدوری اور برآمد سونے کی کوئی کسر بطور انعام دیتا ہے۔ نیار کے
کی آمدنی سے کارخانے میں لازماً مٹھائی بانٹی جاتی ہے، کچھ حصہ کاریگر ۔ کو نقد ملتا
ہے اور بڑا حصہ مالک سادہ کار خود رکھ لیتا ہے ــــ یہ نیاریا ہرگز لاہوری برادری
کا نہیں ہوتا۔ دلی کے ادنیٰ طبقوں مثلاً برف والوں میں سے ہوتا ہے اور اکثر ہندو ہوتا
ہے ــــ سادہ کار جو سونے چاندی کی کھوٹ تیزابی اعمال سے الگ کرتا ہے وہ
ایک مختصر کام اور سادہ کاری کا ضمنی عمل ہے۔ اسے تصفیہ کہئے اور سادی اصطلاح میں
سودھنا کہئے ۔ بہرحال یہ سودھنا کئی من کوڑے میں سے نہیں ہوتا بلکہ کھوٹے
سونے یا کھوٹی چاندی کی ڈلی میں سے ہوتا ہے! بحیثیت مجموعی یوسف صاحب کا
مضمون داد کا مستحق ہے۔

دوسری کتاب انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ کتاب فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں
ہے جو ظفر الرحمٰن صاحب کی تالیف ہے۔ اس کی چوتھی جلد میں زیور سازی کی اصطلاحات
اور اوزاروں کے نام لکھے ہیں۔ یہ بہت مفید اور خاصی مکمل فہرست ہے۔ سادہ کاری سے
متعلق فنی اصطلاحات اور اوزاروں کے نام ہم اپنے مضمون میں دینا چاہتے تھے۔ لیکن
فرہنگ اصطلاحات کے ہوتے ہوئے یہ طول عمل ہے۔ البتہ فرہنگ میں اصلاح و ترمیم
کی گنجائش ہے۔ بہت سے اوزاروں کے نام انھوں نے نہیں لکھے۔ بہت سے
معاملوں میں خود کام کے سلسلے کی ترتیب نہیں لکھیں۔ بہت سی چیزیں غلط لکھی ہیں [illegible]

کے بارے میں انھوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ پرداز کو پر تاج لکھا ہے اور لفظ یہ کہ اُسے پر اور تاج سے مرکب بتایا ہے۔ حالانکہ دلی کا مسلمان سادہ کار کبھی پر تاج نہیں کہتا۔ سب پرداز کہتے ہیں۔ پھر یہ لفظ فارسی اردو تمام قدیم و جدید لغتوں میں نہایت مرصتکر اپنے اصطلاحی معنوں کے ساتھ لکھا ہوا موجود ہے۔ اس کا مصدر پرداختن ہے۔ جس کے معنی مکنا، لینا، سنوارنا، نقش بنانا وغیرہ ہیں۔ سادہ کار کے ٹھیے یعنی کونڈے میں لکڑی کا جو پایہ (کلا) لگا ہوتا ہے۔ اس کے اوپر ایک چھوٹی سی لکڑی ہوتی ہے جس پر پرزہ رکھ کر سادہ کار کام کرتا ہے۔ اس لکڑی کو کوئی سادہ کار پارٹ نہیں کہتا۔ اس کا نام بینی ہے۔

مندرجہ بالا دو کتابوں کے علاوہ بہت سی ضمنی معلومات کے لئے ہم نے مندرجہ ذیل کتابوں کو سامنے رکھا ہے۔

۱۔ آثار الصنادید — سر سید — سنہ ۱۸۴۹ء — لاہوری صناعوں کا ذکر
۲۔ مرأت الاشیاء — حکیم احسن اللہ خاں محمد مرتضیٰ خاں — سنہ ۱۸۵۰ء / ۱۸۶۳ — "
۳۔ دریائے لطافت — انشاء اللہ خاں — دلی میں لاہوری برادری کے محلے کا ذکر
۴۔ مسلمانوں کی صنعت و حرفت — فان کریمر ترجمہ مولوی جمیل الرحمٰن — سنہ ۱۹۳۲ء — عراق میں سونے چاندی کی صنعت کا عروج
۵۔ بادشاہ نامہ — ملا عبد الحمید لاہوری — سنہ ۱۶۳۸ء — سادہ کار کا ذکر
۶۔ عمل صالح (بحوالہ معین الآثار) — محمد صالح — سنہ ۱۶۴۲ء — لاہوری مینا سازوں کا ذکر
۷۔ معمار تاج (مضمون) (بحوالہ معین الآثار) — عبد اللہ چغتائی — سنہ ۱۹۳۴ء — " "
۸۔ لاہور کا ایک مہندس خاندان (رسالہ کارواں لاہور) — مولانا سید سلیمان ندوی — " " "
۹۔ لاہوری برادری کا شائع کردہ متفرق لٹریچر (حسب اطلاع مضمون معارف) اور رسالوں کے فائل۔

پہاڑ گنج، دہلی

عمار احمد جامعی

حالاتِ حاضرہ[۱]

مابعد جنگ

جنگ کے بارے میں بہت گفتگو ہو رہی تھی، منصوبے بنائے جا رہے تھے، تیاریاں کی جا رہی تھیں، لیکن کسی کو یہ امید نہیں تھی کہ "مابعد جنگ" اس قدر جلد آجائے گا۔ یہ ایک بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو گیا ہے اور اس کے مسئلے جتنا خیال تھا اس سے زیادہ پیچیدہ نظر آرہے ہیں۔

جن ملکوں میں جنگ لڑی گئی ہے یا جو مختلف قسم کے بموں کا شکار رہ چکے ہیں وہاں تباہی پھیلی ہے اور ان کے بہت سے شہروں، صنعتوں، بندرگاہوں، ریلوں، پلوں، نہروں، پشتوں، بند، جہازوں اور رہنے کے مکانوں اور گھر کے ساز و سامان وغیرہ وغیرہ کو از سرِ نو تعمیر کرنا ہے۔ ایک ماہر نے صرف یورپ کی جنگ میں ملکیت کا جس قدر نقصان ہوا ہے اس کا تخمینہ ایک کھرب دس ارب ڈالر کیا ہے۔ اگر محض یورپ کو جنگ سے قبل کی حالت پر دوبارہ واپس لانا ہے تو اس نقصان کی تلافی ضروری ہے پھر یورپ کے علاوہ ملکیت کا جو نقصان چین، جاپان، جنوب مشرقی ایشیا، برہما وغیرہ میں ہوا ہے اس کی تلافی بھی ضروری ہے۔

مرمت، تجدید یا قائم مقامی کے اس کام کی تین مختلف شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کام فاتح اقوام کو خود اپنے ملکوں اور اپنے مقبوضات میں کرنا ہے، دوسرے ان ملکوں میں جو دشمن کی غلامی میں آگئے تھے اور جنہیں اب آزاد کر دیا گیا ہے اور تیسرے مفتوح اقوام کے ملکوں میں۔ ظاہر ہے پہلا کام سب سے مقدم ہے۔ اس کے بعد دوسرے کا نمبر ہے اور سب سے آخر میں تیسرے کام کی طرف توجہ کی جائے گی۔ پہلی نظر میں اس آخری کام کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن تھوڑے سے غور و تامل سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب تک فاتح اقوام اس کام کو بھی انجام نہیں دیں گی وہ نہ تو مفتوح [illegible]

---

[۱] اس مضمون کے علاوہ اس رسالے کے باقی تمام مضامین آج سے دو مہینے پہلے مرتب کئے جا چکے تھے۔ یہ مضمون [illegible] کو لکھا جا رہا ہے۔ (مدیر)

سے کوئی فائدہ وصول کر سکیں گی نہ اپنی اور تمام دنیا کی صنعت و تجارت کو پوری طرح ترقی دے سکیں گی اور نہ چین و آرام سے بیٹھ سکیں گی۔

روس کے علاوہ یورپ کے جتنے ملک جنگ میں شریک رہے ہیں۔ ان سب کی معیشت میں ملکی اور خارجی تجارت کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور ان کی زندگی کا تمام تر دارومدار نقل و حمل، درآمد و برآمد، خرید و فروخت اور اعتبار و بنک کاری کے اوپر تھا۔ یہ سب کچے مالوں اور غذا کے سامانوں کی ایک بہت بڑی مقدار باہر سے درآمد کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء سے پہلے فاتح اور مفتوح ملکوں کو چھوڑ کر محض یورپ کے آزاد کردہ ملکوں کی درآمد کا تخمینہ چودہ کروڑ دس لاکھ ٹن سالانہ کیا گیا ہے اس کے مقابلے میں امریکہ کی درآمد اسی زمانے میں صرف ڈیڑھ کروڑ سالانہ کے درمیان رہتی تھی یہی حال ان ملکوں کی برآمد کی تجارت کا تھا۔ درآمد کی ادائی بڑی حد تک برآمد کے ذریعے ہو جاتی تھی اور جو تھوڑی کسر رہ جاتی تھی وہ سیاحوں کے خرچ۔ جہازوں کے کرایہ اور غیر ملکوں میں لگے ہوئے سرمایہ کے سود سے پوری ہو جاتی تھی۔

جب ان ملکوں پر جرمنوں نے قبضہ کیا تو یہ اپنی سابقہ درآمد سے محروم ہو گئے۔ لیکن جرمنوں کے "نئے نظام" نے ایک حد تک اُن کے اس نقصان کی تلافی کی اور یورپ بڑی حد تک اپنی ضرورتوں کی تکمیل خود اپنے وسائل سے کرنے لگا۔ اس سے ان ملکوں کی زندگی کا معیار پست ضرور ہو گیا لیکن اس پست سطح پر اس کے اندر خاص استحکام اور ثبات پیدا ہو گیا۔

لیکن اتحادیوں کی فتح کے بعد ان ملکوں کی زندگی میں دوبارہ ابتری پیدا ہوئی اور اس دفعہ کی ابتری نہایت سخت اور جاں گسل ہے۔ ان ملکوں کی حالت کا نقشہ حسب ذیل طریقے پر کھینچا جا سکتا ہے۔

(۱) نئے نظام کی تباہی جس کی وجہ سے جرمنی سے درآمد کا سلسلہ بند ہو گیا ہے اور دنیا کے دوسرے ملکوں سے کچے مال درآمد کرنے کا کوئی دروازہ نہیں کھلا ہے۔

(۲) ہر قسم کی نقل و حرکت اور رسل و رسائل کی مسدودی کیونکہ ریلوں، سڑکوں اور ریل کی لائنوں کو یا تو اتحادیوں نے تباہ کر دیا ہے یا جرمنوں نے۔

(۳) اس لئے ہر ملک اپنے وسائل پر انحصار کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ہے۔ کارخانے کچے مال کے جمع کئے ذخیروں پر چل رہے ہیں اور جب اس کے کچھ حصے آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے ہیں تو کارخانوں کا چلنا بھی بند ہو جاتا ہے۔ اور تدریجی طور پر بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔

(۴) زر کی مشکلات بھی کسی نہ کسی شکل میں رونما ہو رہی ہیں جن کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ محصول وصول کرنے میں دشواری ہے۔ استعمال کی چیزوں کی رسد کی کمی برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ اتحادی فوجوں کی بڑی تعداد کی موجودگی کی وجہ سے افراط زر کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ کیونکہ یہ فوجیں جنگ کے سلسلے میں بھی غیر محدود قوت خرید سے کام لے رہی ہیں اور ان کے سپاہی انفرادی طور پر بھی بے خرچ زیادہ کر رہے ہیں۔

(۵) ہر قسم کی روشنی، قوت محرکہ اور گرمی پہنچانے والے ذرائع کی قلت رسد۔

(۶) غذا کی قلت، چوربازاروں کی کثرت اور غذا کے سامان کی گرانی۔

(۷) بندرگاہوں میں سامان کو اتارنے، چڑھانے اور رکھنے کی دشواریاں۔

(۸) سمندر پار کے ملکوں سے، سونے یا مبادلات خارجہ کے ذخیرہ محفوظ یا تجارتی قرضوں کے بغیر خریداری کا عدم امکان اور

(۹) ان سب سے زیادہ یہ بات کہ چونکہ اتحادی قبضہ کی ابتدائی منزلوں میں تمام طاقت اتحادی کمانڈر ان چیف کے ہاتھ میں تھی اس لئے وہ حالات موجود نہیں تھے جن میں ملک کی کوئی حکومت چاہے اس کا خیال، رجحان اور سیرت کیسی ہی کیوں نہ ہوتی۔ کسی قسم کا کوئی معاشی منصوبہ بنا سکتی تھی۔

غرض آزاد کئے ہوئے ملکوں میں ہر جگہ ایک غیر زبان بولنے والی فوج کا قبضہ، جنگ کی شدید غارت گری، ناکافی اور گراں غذا، غیر معمولی طور پر سخت سردی، ناکافی کوئلہ، حمل و نقل کے ذرائع کا فقدان، ضروری کچے مالوں کی نایابی اور اضافہ پذیر بے روزگاری کا دور دورہ جاری ہے۔

مفتوحہ ملکوں کا حال اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔ ان کا مستقبل مکمل تاریکی میں ہے اور وہ فاتحوں کے رحم و کرم پر ہیں۔

فاتح ملکوں میں انگلستان میں رہنے کے مکانوں کی سخت قلت ہے۔ بندرگاہوں کی تباہی اور جہازوں کی کمی ترقی کی راہ میں زبردست رکاوٹیں بنے ہوئے ہیں۔ روس اور چین اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں بھی بڑی زبردست تباہی ہوئی ہے۔

ان سب ملکوں کی نظر امریکہ کی امداد پر ہے۔ اگر امریکہ امداد دے سکا تو ان کا کام آسانی سے چل سکے گا۔ ورنہ تجدید و مرمت کے کام میں بڑی دیر اور مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہندوستان میں جنگ کی وجہ سے براہ راست تباہی تو تقریباً بالکل نہیں ہوئی ہے، لیکن ہماری معاشی زندگی پر اس کا بڑا انقلاب انگیز اثر پڑا ہے۔ چار پانچ سال سے برابر ہندوستان کی حیثیت "مشرق کے اسلحہ خانے" کی سی رہی ہے۔ اس کو اپنے پورے وسائل جنگ کے سامان فراہم کرنے میں لگا دینا پڑے ہیں۔ ہندوستان کے لاکھوں آدمی فوج میں براہ راست بھی بھرتی ہوئے اور اس سے بہت زیادہ تعداد میں جنگی کارخانوں، مدافعت کے دوسرے کاموں اور جنگ کے مختلف محکموں اور دفتروں میں کام کرتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں حکومت ہند اور حکومت برطانیہ نے جنگ کے پانچ سالوں میں مدافعت کے کام پر تقریباً ۲۰ ارب روپیہ خرچ کیا ہے اور اس خرچ نے ہماری معاشی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ اب کہ جنگ ختم ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ خرچ جاری نہیں رہ سکے گا اور اس کی کمی کے ساتھ ساتھ ہماری معاشی زندگی میں بھی ابتری کا پیدا ہونا لازم ہے۔

حکومت ہند کو اس بات کا پہلے سے خیال تھا اور اس کی پیش بندی کرنے کے لئے اس نے ۱۹۴۳ء سے مابعد جنگ کی تعمیر نو کے مسائل پر غور و توجہ شروع کر دی تھی۔ اس کام میں برابر ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ اب تعمیر نو اور منصوبہ سازی کا ایک مستقل محکمہ وجود میں آگیا ہے۔ وائسرائے کی کونسل کی تعمیری کمیٹی نے ترقیاتِ مابعد جنگ کے بارے میں نومبر ۱۹۴۴ء میں ایک رپورٹ

شائع کی تھی اس میں تجدید و مرمت کے ان کاموں کو جنہیں جنگ کے ختم ہونے کے بعد فوراً کرنا ہوگا
حسب ذیل عنوانات کے ماتحت تقسیم کیا تھا:۔

(۱) مدافعت کی خدمات سے برطرف کئے ہوئے لوگوں اور جنگی صنعت وغیرہ سے فارغ کئے ہوئے مزدوروں اور ملازموں کو امن کے زمانے کے کاموں میں لگانا اور ان کے رہنے بسنے کا انتظام کرنا۔

(۲) زائد فوجی ذخیروں، سامانوں، زمین اور عمارتوں کو نظم و ترتیب کے ساتھ فروخت کرنا

(۳) صنعت کو جنگ کے کام سے امن کے کام میں منتقل کرنا۔

(۴) نگرانیوں کا امن کے حالات کے تقاضوں کے مطابق ختم کرنا یا ان میں ضروری ترمیم کرنا

لیکن اس رپورٹ کے لکھتے وقت بلکہ آخر وقت تک جنگ کے اس قدر جلد ختم ہونے کی کسی کو اُمید نہیں تھی۔ اس لئے اندیشہ یہ ہے کہ حکومت اپنی تعمیری اسکیموں کو ابھی تک مکمل نہیں کر پائی ہے۔ اس کے علاوہ وہ حالات جو تعمیر و ترقی کی کوششوں کے لئے سازگار ہو سکتے تھے وہ بھی ابھی تک پیدا نہیں کئے گئے ہیں یعنی نہ تو قومی حکومت کی ابھی تک تشکیل ہو سکی ہے اور نہ ہندوستان کے آئینی تعطل کو ابھی تک دور کیا جا سکا ہے۔ اگرچہ شملہ میں رہنماؤں کی کانفرنس منعقد کرکے اور مرکزی اور صوبائی کونسلوں کے انتخابات کا اعلان کرکے وائسرائے نے اس کی جانب صحیح قدم ضرور اُٹھایا ہے لیکن اس کارروائی کی تکمیل میں بہت دیر لگے گی، اور اس اثنا میں لوگوں کی پریشانی اور مصیبت کا جاری رہنا لازمی سا معلوم ہوتا ہے۔

غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور دنیا کو امن کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے ابھی بہت کافی انتظار کرنا پڑے گا۔

اعلان

ہندستانی اکیڈمی یو۔ پی الہ آباد کی مجلس عاملہ نے اردو کی مطبوعہ کتابوں پر پانسو روپے سالانہ انعام دینے کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے کہ

۱۔ ہر سال مندرجہ ذیل مضمونوں میں سے ایک پر سلسلہ وار انعام دیا جایا کرے گا۔

(الف) شعر اور ڈراما۔

(ب) ناول اور مختصر افسانے

(ج) مضامین (عام اور انتقادی)

(د) تاریخ اور حیات گرامی

(ہ) فلسفہ

(و) نیچرل سائنس

۲۔ انعام [illegible] میں شعر اور ڈراما کی کتابوں پر دیا جائے گا۔

۳۔ شعر اور ڈراما کی صرف ان کتابوں پر غور کیا جائے گا جو ۱ مارچ [illegible] کے بعد شائع کی گئی ہیں۔

پبلک اہل علم حضرات اور مصنفین و ناشرین سے درخواست ہے کہ ہندستانی اکیڈمی کو مندرجہ بالا تاریخ کے بعد شائع شدہ شعر اور ڈراما کی کتابوں کے متعلق [illegible] سے مطلع فرمائیں تاکہ ابتدائی انتخاب کے وقت ان پر غور کیا جا سکے، اور [illegible] کتابوں کی نسبت ججوں کی کمیٹی فیصلہ کر سکے۔

منیجر ہندوستانی اکیڈمی۔ الہ آباد

دی مغل لائن لمیٹڈ

عازمین حج کے لئے جہاز میں جگہ حاصل کرنے کے متعلق ضروری ہدایات

عازمین حج کی توجہ حکومت ہند کے اس اعلان کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے جو ۲۰ جولائی کو شائع ہوا اور
کے بعد انگریزی یا ملکی زبانوں کے مؤقر اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ عازمین حج کو اپنے لئے جگہیں فوراً بک کرا لینی
چاہئیں کیونکہ گنجائش کم ہے۔ اور تقسیم کے قاعدے پر عمل کیا جائے گا۔ درخواست دہندگان کو درخواستیں
دیتے وقت ہدایات کی سختی سے پابندی کرنی ہوگی جو دفتر سرکاری اعلامیہ میں درج ہیں۔

اس اعلامیہ میں جن ۹۳ روپے ۱۰ آنے اور ۵ روپے ۱۲ آنے کا ذکر کیا گیا ہے اس میں
مع جدہ کی فیس محکمہ صحت، جہاز سے جدہ کے کنارے تک جانے کا کشتی کا کرایہ اور کامران کے
قرنطینہ کی فیس ہے جو گزشتہ زمانے میں جہاز کے کرایہ کے ساتھ وصول کر لی جاتی ہے جہاز
کا کرایہ ڈیک (تیسرے درجہ) کا ۶۵۰ روپیہ ہے جس میں کھانے کے دام بھی شامل ہیں
اول درجے کا کرایہ جواب تک زیر غور ہے۔ جہاز راں کمپنی روانگی کی بندرگاہ پر وصول کرے
گی۔

معلومات اس پتہ پر حاصل کیجئے

حج بکنگ افسر کامن ویلتھ ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا دہلی

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

بمبئی ۱

سجاد حیدر یلدرم

ہما خانم سجاد حیدر یلدرم کا نام اُردو ادب میں ایک بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ مدتوں اُن کے طرزِ نگارش کی تقلید کی گئی اور ان کی کتاب "خیالستان" کو پڑھا گیا اور سر دُھنا گیا۔

"ہما خانم" میر حجازی کے ایک فارسی ناول کا ترجمہ ہے سجاد حیدر یلدرم کے قلم نے اس میں کچھ خوبیوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ حجازی کے بانکپن اور یلدرم کی شوخی نے ہما خانم کو حیاتِ جاوید بخشی ہے۔ قیمت مجلد عہ

خیالستان	۷؍	جلال الدین خوارزم شاہ	عمہ	حکایات و احتساسات	عہ
ثالث بالخیر	۸؍	لیلیٰ مجنوں	۸؍	جنگ و جدال	۱۲؍
آسیبِ الفت	۱۲؍	پُرانا خواب	۱۰؍	زہرہ	۱۰؍

پُرانا خواب اور دیگر افسانے عہ

ماہِ نو ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے "ششو" کا ترجمہ۔ از جناب حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی ٹیگور فطرتِ انسانی کا باکمال مصور ہے خصوصاً بچوں کے حسیات اور ان کے خیالات کی جیسی سچی تصویریں اس نے کھینچی ہیں وہ اور کہیں نظر نہ آئیں گی۔ عہ

گیتان جلی	عہ	میرا لڑکپن	عہ	خاموشی	عہ
کون کسی کا	عہ	پھول اور کلیاں	عہ	الجھن	عہ
کودنی	عہ	چڑ کھیر والی	عہ		

چند اور کتابیں

وقارِ حیات۔ نواب وقار الملک کی سوانح عمری۔ مصنفہ محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی۔ عہ

کارنامہ پہلوی۔ رضا شاہ پہلوی کے حالاتِ زندگی اور ملکِ ایران کی داستان۔ از سید محمد حسن صاحب بلگرامی۔ عہ

مناجات ۔ خواجہ عبداللہ انصاری صاحب کا فارسی کلام ۔ چھوٹی سائز پر دو رنگ میں نہایت خوش نما چھپا ہے۔ عہ

مکتبہ جامعہ

[illegible]

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۳

انشاء کی تعلیم

یعنی

مضمون نویسی پر ایک کتاب

از سید وقار عظیم صاحب ایم اے بی ٹی - یہ کتاب مکتبہ جامعہ نے شائع کی ہے اور اس عنوان پر بہت مفید کتاب ہے - قیمت عہ

تاریخ الامت مکمل از الحاج مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری - پروفیسر تاریخ اسلام سیرت پاک سے لے کر خلافت عثمانیہ تک سات جلدوں میں - آٹھویں جلد جو اسی سلسلے کی کڑی ہے قرآن اور اسلامی تاریخ کے فلسفہ پر حاوی ہے قیمت مکمل سٹ ۸ سے

پردۂ غفلت (ڈرامہ) ڈاکٹر عابد حسین	عہر	نقش آخر (ڈرامہ) ڈاکٹر اشتیاق قریشی	عہر
انتخاب میر - مولوی نور الرحمن	عہر	باغبانی پروجیکٹ (اسکولوں کے لئے)	۱۲ر
سیاسیات کی پہلی کتاب	۸ر	ہندوستانی کی پہلی کتاب	۸ر
بادشاہ (پرنس کا ترجمہ)	سے	عہد نبوی میں نظام مملکت	عہر

ننھی مرغابی	۵ر	دنیا کے بسنے والے	۱۰ر	سرکار دو عالم	عہر
نانبیل خاں	۵ر	مقناطیس کی کہانی	۵ر	رسول پاک	عہ
چیتو منتو	۵ر	بجلی کی کہانی	۸ر	خلفائے اربعہ	عہر
لال مرغی	۸ر	بجلی اور مقناطیس کی کہانی	۸ر	دس جنتی	۱۰ر
دو بھائی	۸ر	سمندر کا عجائب خانہ	عہ	بنیوں کے قصے	۱۰ر
عقاب	۸ر	عقائد اسلام	۸ر	محاسن اسلام	عہر
ایورسٹ کی داستان	۵ر	ارکان اسلام	۸ر	قومی نظمیں	۸ر
تاریخ ہند کی کہانیاں ع۱	۸ر	ہمارے نبی		بچوں کا کھلونا	۱۲ر
" " " ع۲	۸ر	ہمارے رسول	۱۰ر	محنت (ڈرامہ)	۸ر
دنیا کے بچے	۱۰ر	سرکار کا دربار	عہ	شریر لڑکا	۶ر
قاعدہ	۸ر	دس سبق	۸ر		

ان پڑھ بالغوں کے لئے پوری سو کتابوں کا مکمل کورس ۲۵ سے

ہمارا مکمل پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیرِ ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم۔ اے

جلد ۳۰ ۔ نمبر ۱۲	بابتہ ماہ ستمبر ۵۵ء	سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے، آکسن۔ محبوب المطابع برقی پریس

اگر

آپ اردو کی تازہ ترین مطبوعات کا
مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو **اُردو اکادمی**
کی رکنیت قبول فرمائیے اور قواعد وضوابط
ایک کارڈ لکھ کر طلب کیجئے۔

ناظم اُردو اکادمی
مکتبہ جامعہ، قرول باغ
دہلی

برطانیہ کی مزدور پارٹی

برطانیہ کے گذشتہ انتخابات میں مزدور پارٹی[1] کو بڑی اکثریت کے ساتھ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اسے بہت سے لوگ ایک نہایت انقلابی واقعہ سمجھتے ہیں۔ "سرمایہ داروں کی حکومت کا زمانہ ختم ہوا، اب مزدور حکومت کریں گے" ۱۹۱۷ء میں یہی بات روس میں کہی گئی تھی، اور ۱۹۴۵ء میں یہی بات برطانیہ کے لئے کہی جارہی ہے لیکن دونوں میں کتنا فرق ہے۔

وہاں اس کے معنی تھے قتل و خون، تباہی و غارت گری، انتشار و ابتری، زمینداروں سرمایہ داروں، مذہب کے اجارہ داروں اور زارشاہی کا مکمل استیصال اور مزدور طبقے کی آمریت۔

یہاں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔ ۱۰۔ ڈاؤننگ اسٹریٹ میں مسٹر چرچل نے رہنا چھوڑ دیا ہے ان کی جگہ مسٹر اٹیلی رہنے لگے ہیں۔ ایوان قانون ساز میں حکومت کی نشستوں پر مسٹر چرچل کی قیادت میں تحفظ پسند پارٹی کے نمائندے نہیں بیٹھتے۔ اب ان کی جگہ مزدور پارٹی کے نمائندے مسٹر اٹیلی کی رہنمائی میں بیٹھنے لگے ہیں، اور سرکاری طور پر تسلیم شدہ مخالف پارٹی کی جگہ تحفظ پسند پارٹی نے لی ہے۔

بہرحال ایوانِ عوام میں مسٹر چرچل اور مسٹر اٹیلی اب بھی آمنے سامنے بیٹھتے ہیں۔ دونوں میں پہلے کی طرح اب بھی نوک جھوک ہوتی ہے۔ ملک معظم، ایوانِ امراء، ملک معظم کی حکومت، ملک معظم کی مخالف پارٹی، انگلستان کا تحریری اور غیر تحریری دستور و ضابطہ مزدور پارٹی کے برطرف کئے جانے اور اس کی جگہ تحفظ پسند پارٹی کے دوبارہ برسر اقتدار

---

[1] مزدور پارٹی جیسا کہ آگے تفصیل سے بتلایا جائے گا، برطانیہ میں پہلے بھی دو مرتبہ حکومت کر چکی ہے، لیکن اس وقت اسے وہ اکثریت حاصل نہیں تھی جو اب ہے۔

آجانے کا امکان ـــــــــــ سب بدستور موجود ہیں ۔ تمام کارروائیاں معمول کے مطابق ہوتی ہیں ۔ سابق حکومت کی تمام خارجی اور داخلی پالیسیوں کے تسلسل کو کم از کم فی الحال قائم رکھا گیا ہے۔ ان میں جو تبدیلیاں بھی کی جائیں گی وہ بہت تدریجی طریقے پر سی کی جائیں گی ۔

انگلستان کی پارلیمنٹ کی کارروائیاں، رکاوٹوں اور جوابی رکاوٹوں، شہ اور جوابی شہ کا ایک مجموعہ ہوتی ہیں۔ اس لئے اس کا کوئی کام عجلت سے نہیں ہو سکتا۔ دیر طلبی اور تاخیر، غور اور تامل اس کے خمیر میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ ملک معظم کی حکومت کو ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا پڑتا ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ ملک معظم کی بیدار اور بے درد مخالف پارٹی جسے زندہ رہنے اور اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کرنے اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا ایسا ہی قانونی حق ملا ہوا ہے جیسا کہ خود اُسے اور جسے وہ کسی طرح بہ خیر: فنا اور معدوم کر سکتی ہے اور نہ اس کا منہ بند کر سکتی ہے، برابر اس کی تاک اور گھات میں ہے اور اس کی رائی کو پہاڑ بنا کر پیش کرنے کی فکر میں ہے۔ اس کی ہر لغزش پر وہ اس کی گردن پکڑ سکتی ہے اور اڑنگا مار کر نیچے گرا سکتی ہے اور رائے دہندوں کو اس سے منحرف کر کے اپنا طرفدار بنا سکتی ہے اور اس طرح آئندہ کے انتخابات میں اپنی اکثریت کا دوبارہ انتظام کر سکتی ہے۔ اس لئے اس کو مخالف جماعت کے اعتراضوں، نکتہ چینیوں، ترمیموں اور متبادل تجویزوں کی روشنی میں اپنی ابتدائی تجویزوں اور قانونی مسودوں کو دوبارہ ایسی شکل دینی ہوتی ہے جس سے مخالف پارٹی کے زہریلے ڈنک کا اثر زائل ہو سکے اور رائے دہندوں کو خلاف اور بدظن کرنے کی جو کوششیں اس نے کی تھیں ان کی تلافی ہو سکے ۔ اس کے معنی عموماً یہ ہوتے ہیں کہ حکومت کو میانہ روی، اعتدال، مصالحت، اور مفاہمت کی پالیسی سے کام لینا ہوتا ہے وہ اصلاح و ترقی کے صرف ان کاموں کو ہاتھ میں لیتی ہے جن کی ضرورت لازمی اور ناگزیر معلوم ہوتی ہو اور جن کے لئے پریس اور پلیٹ فارم پر عرصے سے شورش و ہنگامہ برپا رہ چکا ہوتا ہے۔

اور جن کی تائید اور مخالفت میں جتنا کچھ کہنا اور کرنا ہے وہ سب کہا اور کیا جا چکا ہوتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب نیا قانون بنتا ہے تو لوگ نئے حالات سے مطابقت کرنے کے لئے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ انھیں ناقابل مضر سمجھ کر ان کو رضاکارانہ طریقے پر قبول کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہاں جوابی انقلابات یا رجعت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

انگلستان میں مزدور پارٹی کے برسر اقتدار آ جانے سے ایک عام آدمی کو فوری طور پر اس بات کا احساس مشکل ہی سے ہو سکے گا کہ برطانیہ کی حکومت اور زندگی میں کوئی واقعی انقلاب ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے نتائج ایسے ہی دور رس ثابت ہوں جیسے کسی دوسری جگہ بہت شور و ہنگامہ، قتل و بربادی، انتشار و ابتری پیدا کرنے کے بعد حاصل کئے جاتے ہیں اور ان میں رجعت اور ناپائداری کا امکان دوسری جگہوں کے مقابلے میں نسبتاً کم ثابت ہو۔

پر امن انقلاب کے اس طریقے کو انگلستان ہی نے ایجاد کیا ہے۔ انگلستان میں بڑی سے بڑی تبدیلیاں ایسی ہی خاموشی سے ہوئی ہیں کہ جس میں نہ خون بہتا ہے، نہ تکلیف ہوتی ہے اور نہ کسی کو ان کے بہت زیادہ غیر معمولی ہونے کا احساس ہوتا ہے ۱۶۸۸ء کا پر امن انقلاب اسی طرح ہوا تھا۔ ۱۸۳۲ء، ۱۸۶۷ء اور ۱۸۸۴ء میں برطانیہ کے دستور میں جو بنیادی تبدیلیاں کی گئیں ان سے انگلستان کی رعایا کو وہ حقوق مل گئے جنھیں حاصل کرنے کے لئے فرانس کو متعدد خونی انقلابات سے گذرنا پڑا تھا۔

۱۸۳۲ء کی اصلاحات سے بیچ کے طبقے کے لوگوں، تاجروں اور دکان داروں کو یہ حق ملا کہ وہ اپنے نمائندوں کو پارلیمنٹ میں بھیج سکیں۔ ۱۸۶۷ء کی اصلاحات سے یہ حق شہر کے کاریگروں کو بھی مل گیا کہ وہ ایوان عوام کے اراکین کے انتخاب میں اپنی رائے دے سکیں اور ۱۸۸۴ء کی اصلاحات نے زراعتی مزدوروں کو بھی اس حق میں شریک کر لیا۔

بعد کو یہ حق عورتوں کو بھی مل گیا۔ یہاں تک کہ اب برطانیہ کی تمام بالغ آبادی کو یہ حق مل گیا ہے کہ
ایوان امرا کی حیثیت برابر گھٹتی چلی گئی یہاں تک کہ اب تمام اہم معاملوں میں فیصلہ کن اختیار
ایوان عوام ہی کو حاصل ہے۔ ایوانِ عوام میں اکثریت رکھنے والی جماعت ہی کو اپنی کابینہ کے
ذریعے حکومت کی رہنمائی کرنے کا حق ملا ہوا ہے اور ہر معاملہ میں ایوان عوام ہی کابینہ
سے جواب طلب کرسکتا ہے۔

برطانیہ کی قومی خصوصیت یہ ہے کہ وہ چیزوں کو مٹاتی نہیں بلکہ انھیں بے ضرر
بنا دیتی ہے۔ انگلستان میں بادشاہ کو ختم نہیں کیا گیا۔ نام کے لئے بادشاہ کو وہ تمام
اختیارات اب بھی حاصل ہیں جو تاریخ کے پچھلے زمانے میں اسے دراصل حاصل تھے۔
وہ حکومت کی رہنمائی کرتا ہے۔ جنگ اور امن کا اعلان کرتا ہے۔ فوج بحری اور ہوائی
بیڑہ کا انتظام کرتا ہے۔ مسودۂ قوانین کو منظور یا نامنظور کرتا ہے پارلیمنٹ کو بلاتا اور
برطرف کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنے ان تمام اختیارات کو اپنے وزیر اعظم کی مرضی کے بموجب انجام
دیتا ہے۔ اس کے وزرا کی کابینہ اس کے نام سے سب کام کرتی ہے اور اپنے کاموں کے لئے
ایوانِ عوام کو اور اس کی معرفت رائے دہندوں کو خود ہی جواب دہ ہوتی ہے۔ بادشاہ
کوئی غلطی نہیں کرسکتا۔ تمام غلطیاں اس کے وزرا کرتے ہیں اس لئے اُنھی سے ان کی باز پرس
کی جاتی ہے۔

ایوانِ امرا کو جس کے اراکین کا انتخاب نہیں کیا جاتا بلکہ جو یا تو موروثی ہوتے ہیں
یا انھیں بادشاہ نامزد کرتا ہے باقی رکھا گیا ہے۔ قانون سازی کے وقت ایوان امرا کی منظوری
ایسی ہی ضروری ہے جیسی کہ ایوان عوام کی۔ لیکن ہر کابینہ کا بادشاہ سے نئے امرا بنوانے
کا اختیار دیا گیا ہے۔ جب کبھی ایوان امرا کی اکثریت، ایوان عوام کے منظور کئے
ہوئے کسی اہم قانون کی مخالفت کرتی ہے تو کابینہ اُنھیں اس بات کی دھمکی دے سکتی ہے
کہ ہم اپنے اختیار سے کام لے کر نئے امرا بنوا دیں گے اور تمھاری اکثریت کو اقلیت میں تبدیل

کردیں گے اور اس دھمکی سے دب کر وہ ایوان عوام کے منظور کردہ قانون کی خود بھی منظوری دے دیتے ہیں۔

اس لئے ہرچند انگلستان کا دستور محدود شہنشاہیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن واقعتاً وہ ایسی ہی جمہوریت ہے جیسی کہ امریکہ میں پائی جاتی ہے۔ اسی مماثلت کی بناء پر بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ برطانیہ بغیر اس بات کا ڈھنڈورا پیٹے ہوئے کہ وہ ایک اشتراکی مملکت ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے اور مزدور پارٹی کی حالیہ کامیابی سے اس اشتراکی رجحان کی تکمیل ہوگئی ہے جس کی انگلستان میں ایک عرصے سے آہستہ آہستہ نشوونما ہو رہی تھی۔

انگلستان میں مزدوروں کی تحریک کو مختلف منزلوں سے گذرنا پڑا۔ ابتدا میں مزدوروں کو متحد ہونے کی بھی آزادی حاصل نہیں تھی۔ بچوں، عورتوں اور مردوں سے نہایت بیدردی کے ساتھ ان کی طاقت سے زیادہ کام لیا جاتا تھا اور انھیں بہت کم معاوضہ دیا جاتا تھا انیسویں صدی کے بیشتر حصے میں، سرمایہ داروں کا نیا طبقہ اور سیاسی مفکر، انفرادیت کے حامی بنے رہے یعنی وہ ملک کی رعایا کے باہمی معاملات میں ان کے آزادانہ معاہدے کو کافی سمجھتے تھے۔ اور اس معاملے میں حکومت کی مداخلت کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس اصول عدم مداخلت کو پہلا نقصان فیکٹری کے ان قوانین سے پہنچا جن کی ابتدا لارڈ ایشلے ثانی، ارل آف شیفٹس بری نے کی تھی۔ اس کے بعد مزدوروں کی موافقت میں قانون سازی کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عورتوں اور بچوں سے کام لینا کانوں کے اندر ممنوع اور فیکٹریوں میں محدود کر دیا گیا۔ تعلیم کو مفت کیا گیا، میونسپلٹیوں ڈسٹرکٹ بورڈوں کو مزدوروں اور کاریگروں کے لئے مکانات فراہم کرنے کے اختیارات دئے گئے۔ کام کے گھنٹے محدود کئے گئے۔ جسم کو نقصان پہنچنے کی صورت میں مزدوروں کو ہرجانہ ملنے لگا۔ ایسے قوانین بنائے گئے جن سے ملاحوں اور دوسرے لوگوں کے لئے جو خطرناک کام

میں مصروف تھے۔ زندگی کے ضائع ہونے کے امکانات کم ہو گئے۔ فنی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انتظامات کئے گئے جن سے غریب لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ بے روزگاروں کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے بھی قانون بنائے گئے۔ قانون امداد غربا کی سختیوں کو کم کیا گیا۔ بڑھاپے کے زمانے میں پنشن کا انتظام کیا جانے لگا۔ مزدوروں کی انجمن سازی کو جائز اور ان کی انجمنوں کے اختیارات کو وسیع کیا گیا۔ ان انجمنوں کے ذریعے متحد ہو کر مزدور اپنی اُجرتوں میں اضافہ کرانے لگے۔ مالکوں کے خلاف ہڑتال اور غدار مزدوروں کے خلاف دھرنا دینے کا انھیں حق مل گیا۔ ہڑتال کے زمانے میں انجمن کے سرمایے کو مزدوروں کے گذر بسر کے لئے صرف کرنے کو بھی جائز سمجھا جانے لگا۔ سرمایہ داروں اور مزدوروں میں باہمی مشاورت کے لئے بھی قانون بنائے گئے تاکہ بغیر ہڑتال کئے باہمی سمجھوتے سے اختلافات کو طے کیا جا سکے۔

یہ بہت اہم مراعات ہیں جو مزدوروں کو قانون نے عطا کی ہیں۔ لیکن یہ قوانین اس وقت بنائے گئے جب مزدور پارٹی برسر حکومت نہیں تھے۔ انھیں یا تو دوسری پارٹیوں کے ہمدرد، نیک دل، فیاض اور انسان دوست افراد نے بنوایا یا ایسے قدامت پسند زمینداروں نے جو نئے سرمایہ داروں کے مخالف تھے یا ان لوگوں نے جو مزدوروں کے ووٹ سے منتخب ہو کر پارلیمنٹ میں پہنچے تھے۔ لیکن بعد کے زمانے میں خود مزدوروں کے درمیان سے بھی ان کے کچھ نمایندے پارلیمنٹ میں پہنچنے لگے اور ان کی یہ تعداد ہر انتخاب میں برابر بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آج ایوان عوام میں غالب اکثریت رکھنے کی وجہ سے انگلستان میں ان کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ آیئے برطانیہ کے مزدوروں کی اس تحریک کے تدریجی ارتقا اور نشو ونما پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

یوں تو مزدوروں کی سرگرمیاں متحدہ صورت میں ایک عرصے سے جاری ہیں۔ ان کی کچھ ابتدا تو اسی وقت سے ہو گئی تھی جب اٹھارھویں صدی کے شروع زمانے میں

مزدوروں کا ایک جداگانہ طبقہ سرمایہ داروں کے بالمقابل نمودار ہوا تھا یعنی ایسا طبقہ جو اپنے رہنے کے مکان، کام کی جگہ، اوزاروں، مشینوں، کچے مالوں اور اپنی تیار کی ہوئی چیزوں کی ملکیت سے محروم ہوتا جارہا تھا۔ جس کے پاس فروخت کرنے کے لئے صرف ایک چیز باقی رہ گئی تھی یعنی محنت کرنے کی صلاحیت جسے وہ روزانہ کے حساب سے یا ہفتہ، مہینہ اور سال کے حساب سے یا اپنے کام کی مقدار کے حساب سے، فروخت کرنا یا کرایہ پر اٹھاتا تھا۔ یہ مزدور چونکہ بڑی تعداد میں ایک ہی فیکٹری اور ایک ہی شہر کے اندر کام کرتے تھے۔ اس لئے ان میں اتحاد اور اشتراک کے مواقع زیادہ پیدا ہوگئے تھے۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے اس رجحان کو اور زیادہ ترقی ہوئی اور مزدوروں کی اس تحریک نے دو مختلف گروہوں کی صورت میں منظم ہونا شروع کیا۔ ایک گروہ کا یہ عقیدہ تھا کہ موجودہ نظام کو بنیادی طور پر بدلے بغیر کام نہیں چلے گا۔ سرمایہ داری نظام اور اس کی مقرر کی ہوئی حکومت خرابی کی اصل جڑ ہیں۔ پہلے حکومت کو بدلا جائے بعد میں سرمایہ داری نظام کو۔ تب مزدوروں کو کوئی فائدہ حاصل ہوسکے گا۔ دوسرا گروہ حکومت یا سرمایہ داری نظام میں تبدیلی کو ضروری نہیں سمجھتا تھا اور اس انقلاب کے لئے انتظار اور قربانی کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ اپنی حالت میں معمولی بہتری پر قانع تھا۔ وہ اپنی مخصوص صنعت کے آجروں سے، صرف اپنی انجمن کے اراکین کی اجرت میں اضافہ یا موجودہ اجرتوں کا قیام یا کام کے اوقات کی کمی وغیرہ کا مطالبہ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے ملک یا ساری دنیا کے مزدوروں کے پورے طبقے کا زیادہ درد نہیں تھا اس کی وفاداریاں صرف اپنی انجمن تک محدود تھیں۔ ہم نے ان دونوں گروہوں کی خصوصیات کو واضح کرنے کے لئے ان کے امتیازی فرق کو ذرا مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ورنہ عملی زندگی میں ان کے اندر حقیقتاً اتنا بعد نہیں تھا۔ دونوں کا مقصد چونکہ مزدوروں کا فائدہ پہنچانا تھا اس لئے یہ تحریکیں کسی طرح شروع سے اکثر ایک دوسرے میں مدغم

چلی آئی ہیں۔

لیکن مزدوروں کے اتحاد کی ان دونوں ابتدائی کوششوں کو جائداد اور سرمایہ کے مالکوں نے جو حکومت کی مشین پر بھی قبضہ کئے ہوئے تھے، سختی کے ساتھ کچل دیا جس کی وجہ سے انھیں ایک عرصے تک کھلے طور پر منظم ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔

انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں یہ تحریکیں ریڈیکلزم، سوشلزم، ٹریڈ یونین ازم اور چارٹزم کے مختلف ناموں سے چلائی گئی تھیں۔ ان تحریکوں کو پورے طور پر ایک دوسرے سے جدا کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ان میں اپنے رہنماؤں کے شدید اختلافات کے باوجود اکثر باتیں مشترک تھیں۔ ریڈیکل جماعت کے لوگ مزدوروں کے مسئلہ کا حل، پارلیمنٹ میں اصلاحات جاری کرکے اور مزدوروں کو سیاسی حقوق دلاکر کرنا چاہتے تھے۔ سوشلسٹ زمین اور سرمایہ پر مزدوروں کا قبضہ کرانا چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ چیزوں کے اندر چونکہ قدر و قیمت صرف محنت ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے کل قیمت کے مستحق صرف مزدور ہیں۔ لیکن یہ ابتدائی سوشلسٹ، قانونی جبر کے ذریعے۔ انفرادی ملکیت کے حقوق کو ختم کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اختیاری امداد باہمی، رضاکارانہ اشتراک اور انسانی ہمدردی اور محبت کے فطری جذبے اور تقاضے کے ذریعے اس کام کو کرنا چاہتے تھے۔ ان جذباتی سوشلسٹوں کے مقابلے میں انیسوی صدی کے وسط میں، انقلابی سوشلسٹ پیدا ہوئے جن کا سب سے زیادہ مشہور رہنما کارل مارکس تھا۔ یہ طبقہ وارانہ جنگ اور خونی انقلاب کے قائل تھے اور حکومت کی طاقت کو مزدوروں کے ہاتھ میں لانا اور اس کے ذریعے دولت آفرینی کے وسائل کو نجی مالکان جائداد سے جبریہ چھینا اور ان کی ملکیت کو اجتماعی سرمایہ بنانا چاہتے تھے لیکن انگلستان میں مارکس کا اثر یورپ کے مقابلے میں زیادہ نہیں ہوا۔ اور انگلستان کی مزدور تحریک نے انقلابی رنگ کبھی قبول نہیں کیا۔ منڈمین نے ضرور [illegible] میں سوشل ڈیماکریٹک فیڈریشن قائم کی۔ لیکن [illegible] میں فیبین سوسائٹی جسے سڈنی وب اور برنارڈشا نے [illegible] میں قائم

گیا تھا اس کے اثر کو زائل کر دیا۔ فے بین ازم کی تحریک طبقہ وارانہ جنگ اور خونی انقلاب کی معتقد نہیں تھی۔ یہ طبقہ متوسط کی رائے کو تعلیم اور پروپگنڈا کے ذریعے اپنا ہم خیال بنا کر حکومت کی مشین پر قبضہ کرنا اور تدریجی طور پر زمین اور صنعتی سرمایہ کی ملکیت کو نجی افراد کے ہاتھ سے جماعت کے ہاتھ میں منتقل کرانا چاہتی تھی۔

چارٹزم کی تحریک اس بے اطمینانی کا نتیجہ تھی جو ۱۸۳۲ء کی آئینی اصلاحات میں مزدوروں کی حق تلفی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ لیکن یہ وقتی جوش دکھلا کر ٹھنڈی پڑگئی۔

ان تحریکوں میں اپنے دیرپا اثر اور نتائج کے لحاظ سے سب سے اہم تحریک ٹریڈ یونین ازم یعنی مزدوروں کی انجمنوں کی تحریک تھی جسے ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

(باقی)

سہارنپور کی سکنائی جائداد کا جائزہ

میری خوش نصیبی سے میری تحقیقات جولائی ۱۹۵۱ء) سے چند مہینے پہلے سہارنپور میونسپلٹی نے ہاؤس ٹیکس عائد کرنے کے لئے سہارنپور کے جملہ مکانات کے بارے میں صرف کثیر کے بعد ایک مکمل فہرست تیار کرائی تھی جس میں میونسپلٹی کے ہر حلقے کے لئے محلہ وار، گھروں کی نوعیت، اُن کے مالکوں اور رہنے والوں کے نام اور ان کے واقعی یا امکانی کرایوں اور مجوزہ ہاؤس ٹیکس وغیرہ کے بارے میں معلومات اکٹھی کی گئی تھیں۔ یہ چیز میری تحقیقات کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی اور میں مولوی فضل الرحمٰن صاحب چیرمین میونسپل کمیٹی سہارنپور کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے ان قیمتی رجسٹروں سے مجھے فائدہ اُٹھانے کا موقع عنایت فرمایا۔ میں نے تقریباً ڈیڑھ ہفتہ تک میونسپل کمیٹی کے دفتر میں ان رجسٹروں پر کام کیا اور ان سے معلومات کو اخذ کیا۔ جن کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے دیہات قصبات اور ان شہروں کی جہاں جدید صنعت و تجارت کا ابھی زیادہ غلبہ نہیں ہوا ہے۔ یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ یہاں تقریباً ہر شخص کا اپنا ذاتی یا خاندانی مکان ہوتا ہے، چاہے وہ پھوس ہی کا کچا گھروندا کیوں نہ ہو، شہر سہارنپور کے بارے میں میں نے کوئی باقاعدہ تحقیقات تو نہیں کی۔ لیکن جہاں تک میں اندازہ کر سکا میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں اگرچہ یہاں کرایے کے مکانوں میں رہنے والے پردیسیوں کی تعداد بہت خاصی ہے لیکن جن لوگوں کا سہارنپور آبائی وطن ہے، ان میں سے تقریباً ہر شخص کے پاس اپنا ایک ذاتی یا خاندانی مکان ہے۔ میونسپل کمیٹی نے ہاؤس ٹیکس لگانے کے لئے سہارنپور کے مکانوں کے بارے میں جو تحقیقات کرائی وہ ہمہ گیر تھی۔ اس میں شہر کے کسی مکان کو چاہے اس کی حیثیت کتنی ہی کم کیوں نہ ہو تحقیقات کی حدود سے مستثنیٰ نہیں سمجھا گیا۔ اس لئے سکنائی مکانات کی

حیثیت کی فرقہ وارانہ تقسیم معلوم کرنے کا مجھے پورا موقع حاصل تھا۔ اگرچہ یہ کام دیر طلب ضرور تھا کیونکہ تمام مکانوں کی میزان جیسا کہ میں آگے صحیح صحیح بتلاؤں گا، بیس پچیس ہزار تک پہنچی تھی۔ لیکن میرا مقصد چونکہ محض مکانوں کی فرقہ وارانہ تقسیم معلوم کرنا نہیں تھا۔ بلکہ سکنائی جائداد کے ذریعے مسلمانوں اور غیر مسلموں کی نسبتی خوش حالی کا اندازہ کرنا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی تحقیقات کو محدود کر دینا ضروری سمجھا، چنانچہ میں نے اپنی تحقیقات سے ان مکانوں کو خارج کر دیا۔ جن کا کرایہ یا حیثیت دس روپے ماہوار یا ایک سو بیس روپے سالانہ سے کم درج کی گئی تھی۔ اس ایک سو بیس روپے سالانہ کرایہ کا مفہوم مکان کی بازاری قیمت کے لحاظ سے کیا سمجھنا چاہئے۔ اس کے بارے میں میں نے مولوی عبدالحق صاحب وکیل سہارنپور سے مشورہ کیا جن کو اپنی وکالت کے سلسلے میں ان معاملات سے بھی واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ صاحب موصوف نے ازراہ عنایت سکنائی جائداد کی بازاری مالیت کا ایک آسان قاعدہ مجھے بتلایا جس پر بازار میں بھی عمل درآمد ہوتا رہتا ہے اور اس کو ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

(۱) ۴ر سیکڑہ ماہوار کے حساب سے مہینے کی آمدنی کو چھ سو سے ضرب دے لیجئے تو آپ کو جائداد کی مالیت معلوم ہو جائے گی۔
(۲) ۳ر " " " " چار " " " "
(۳) ۲ر " " " " تین " " " "
(۴) ۱ر " " " " دو " " " "

(نوٹ: یہ موٹا تخمینہ ہے ۔ ۲ر اور ۴ر کے لئے تو فارمولا بالکل صحیح نکلتا ہے لیکن ۳ر کی جگہ دو آنے آٹھ پائی اور ۱ر کی جگہ پانچ آنے چار پائی سے حساب لگانا ضروری ہوتا ہے جب حساب ٹھیک بیٹھتا ہے۔)

مولوی صاحب موصوف نے یہ بھی بتلایا کہ دور افتادہ محلوں میں جائداد کا [illegible] ۔۔۔ کے حساب سے لگایا جاتا ہے بازار کے خاص میں جو غیر اہم بازار ہے ۴ر سیکڑہ کے

حساب سے اور بازار شہنشاہی، بازار سبزی گنج، بازار شہید گنج جو تجارت کا مرکز ہیں ۱۲/ اور کبھی ۱۳/ کے حساب سے بھی۔ چنانچہ جب جامع مسجد کے لئے جس کے مولوی صاحب موصوف بھی متولی ہیں۔ بازار شہید گنج میں دکانیں خریدی گئیں۔ تو ان کے ایک تہائی حصے کے لئے جس کا کرایہ تیس پینتیس روپے ماہانہ ہے دس ہزار کی قیمت ادا کی گئی۔ یہ دکانیں پختہ ہیں لیکن صرف ایک منزلہ ہیں۔

بعض محلوں میں گز گتی کے حساب سے مکان فروخت ہوتے ہیں مثلاً محلہ شاہ ولایت میں پندرہ روپے تا بیس روپے اور بعض اوقات پچیس روپے تا تیس روپے فی گز کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں اور محض خالی آراضی جس پر مکان نہیں ہوتا۔ آٹھ سے پندرہ روپے فی گز تک جیسا اس کا موقع ہو فروخت کی جاتی ہے۔

بنگلہ کوٹھیوں کا حساب یہ ہے کہ انبالہ روڈ، پٹھان پورہ، سول لائن اور اسٹیشن روڈ پر ۱۰/ کے حساب سے۔ اگر کوٹھی شہر سے زیادہ دور ہوگی جیسے بیہٹ یا سرساوے کی سڑک پر تو ۸/ یا ۹/ کے حساب سے۔

لیکن ان تمام سودوں میں ذاتی عنصر کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے اور اس میں خریدار اور فروخت کنندہ دونوں کی ضرورت کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال مولوی صاحب موصوف کے اس بیان کی روشنی میں دس روپے ماہوار کرایہ کے مکان کی بازاری قیمت محل وقوع اور خریدار و فروختندہ کی نسبتی ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے معمولی حالات میں دو ہزار اور چھ ہزار روپئے کے درمیان قرار دی جا سکتی ہے۔

لیکن سہارنپور کے زیادہ تر مکان ایسے ہیں جن میں مالکان مکان خود رہتے ہیں۔ اس لئے ہاؤس ٹیکس لگانے کے لئے ان مکانوں کی حیثیت تشخیص کرنے کے واسطے جو لوگ مقرر کئے گئے تھے انھیں ان کے امکانی کرایے کا اندازہ خود کرنا پڑا۔ اس اندازہ میں ظاہر ہے انصاف سے کام لیتے ہوئے وہ شبہہ کا فائدہ مالک مکان ہی کو دے سکتے تھے اور

اس کا کم ترین امکانی کرایہ ہی تشخیص کر سکتے تھے۔ لیکن میں نے ذاتی طور پر جس قدر تحقیقات کی اس سے مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ بہت سے ایسے مکان جن کا کرایہ دس روپے ماہوار رکھا گیا ہے انھیں اگر کرایے پر اُٹھایا جاتا یا مالک مکان اسی حیثیت کے مکان کو بازار میں کرایے پر حاصل کرنا چاہتا تو اس کو واقعی کرایہ بیس روپے اگر نہیں تو کم از کم پندرہ روپے ضرور ادا کرنا پڑتا۔ اس لئے میری رائے میں مکان کی صحیح قیمت نکالنے کے لئے اوسط ۲۰ یا ۱۵ کے نرخ کو قبول کرنا چاہیے۔ یعنی دس روپے ماہوار کرایے کے مکان کی مالیت چاہے وہ کسی محلے میں کیوں نہ ہو کم سے کم چھ ہزار قرار دینا چاہیے۔ اور اس قیمت کو انفلیشن (افراطِ زر) سے پہلے کی قیمت ماننا چاہیے۔ لیکن یہ میری ذاتی رائے ہے اور اس کے منوانے کے لئے میرے پاس کوئی قطعی ثبوت اور فیصلہ کن شہادت موجود نہیں ہے۔

بہرحال مندرجہ ذیل فرقہ وارانہ تحقیقات میں صرف وہ مکان شامل کئے گئے ہیں جن کا ماہانہ کرایہ کم سے کم دس روپے ہے اور اپنی اس تحقیقات کے نتائج کو میں نے حسب ذیل طریقے پر ترتیب دی ہے:-

۱۔ میزان حلقہ ہائے میونسپلٹی شہر سہارنپور	= ۵
۲۔ میزان محلہ جات	= ۱۳۱
۳۔ میزان کل مکانات	= ۱۸،۹۵۴
۴۔ میزان ایک سو بیس روپے سالانہ اور اس سے زیادہ حیثیت کے جملہ مکانات	= ۲،۳۰۵
۵۔ " " " " " مسلم "	= ۹۵۳
۶۔ میزان چھ سو سے بارہ سو روپے سالانہ کے کل مکانات	= ۱۲۱
۷۔ " " " " " مسلم "	= ۳۴
۸۔ میزان بارہ سو روپے سالانہ اور اس سے زائد کے کل مکانات	= ۳۲
۹۔ " " " " مسلم "	= ۵

۱۰- میزان کل رہائشی مکانات و بنگلہ و کوٹھی و بلڈنگ و کوارٹرز جن کی حیثیت ایک ہزار روپے یا اس سے زائد سالانہ ہے =۲،۵۲۱

۱۱- میزان مسلم رہائشی مکانات و بنگلہ و کوٹھی و بلڈنگ و کوارٹرز جن کی حیثیت ایک سو روپے یا اُس سے زائد سالانہ ہے۔ =۵۳۳

۱۲- میزان چھ سو سے بارہ سو روپے سالانہ کی حیثیت کے کل رہائشی مکانات وغیرہ =۶۹

۱۳ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 مسلم 〃 〃 =۱۴۰

۱۴- میزان بارہ سو اور زائد روپیہ سالانہ کی حیثیت کے کل رہائشی مکانات وغیرہ =۱۳۰

۱۵- 〃 〃 〃 〃 مسلم 〃 〃 =×

"	۲۵ - حلوائیاں	" " "	۵۶	×	×	×	×	×	×	×	×	×	×	×	×
"	۲۶ - سلامت رائے	" " "	۵۰	۱۴	×	×	×	×	×	۱۴	×	×	×	×	×
"	۲۷ - چاہ نیلگراں	" " "	۶۲	۸	×	×	×	×	×	۸	×	×	×	×	×
"	۲۸ - چاہ چینیلی	خالص ہندو	۶۰	۱۳	×	×	×	×	×	۱۳	×	×	×	×	×
"	۲۹ - بیرونجات چک ملاحاں بدر	کم حیثیت ہندو اہالی بستی کذریہ اجارہ۔ اکثریت خاکروب کہار	۱۵۳	۴	۱	×	×	×	×	۴	۱	×	×	×	×
	میزان		۳،۰۷۶	۴۵۶	۵۸	۱۶	۳	۵	۱	۴۲۱	۴۰	۲	×	۱	×

نام محلہ	نوعیت محلہ	کل	میزان مکانات ودکانات احاطے وغیرہ: ۱۲۰ روپے سے زاید — کل	مسلم	۶۰۰ سے ۱۲۰۰ روپے تک — کل	مسلم	۱۲۰۰ روپے سے زائد — کل	مسلم	رہائشی مکانات: ۱۲۰ روپے سے زائد — کل	مسلم	۶۰۰ سے ۱۲۰۰ روپے تک — کل	مسلم	۱۲۰۰ روپے سے زائد — کل	مسلم	کیفیت
سول لائن سول لائن مختلف شہر کوناکس	کوٹھیاں و بنگلے	۷۶	۷۶	۱۵	۳۵	۷	۲	×	۷۶	۱۵	۳۵	۷	۲	×	
〃 〃 〃 〃	بلڈنگ و کوارٹر	۲۰۴	۲۰۱	۳۶	۱۷	۱	۸	×	۲۰۱	۳۶	۱۷	۱	۸	×	
〃 〃 〃 〃	فیکٹری آفس ودوکان وسنا ہال	۵۰	۴۹	۳	۲	۷	۳	×	×	×	×	×	×	×	
〃 〃 〃	میزان	۵۳۰	۳۲۳	۵۴	۵۴	۸	۱۳	×	۲۷۷	۵۱	۵۲	۸	۱۰	×	
جنوبی ۵۰ مختلف محلوں	〃	۵,۵۲۵	۱۱,۰۶۱	۴۲۷	۲۳	۱۵	۵	۱	۳۰۹	۲۲۴	×	×	×	×	
غربی ۳۸ 〃 〃	〃	۴,۶۹۳	۲۰۰	۹۷	۲	×	×	×	۱۸۴	۹۲	×	×	×	×	
شمالی ۲۵ 〃 〃	〃	۳,۰۵۷	۴۵۹	۵۸	۱۶	۳	۵	۱	۴۲۱	۴۰	۲	×	۱	×	
شرقی ۲۸ 〃 〃	〃	۵,۱۴۹	۳۶۲	۱۱۸	۲۶	۷	۹	۲	۳۳۲	۱۱۴	۱۳	۷	۳	×	
۵ ۱۳۱ 〃 〃	میزان کل	۱۸,۹۵۴	۲,۴۰۵	۹۵۳	۱۲۱	۳۲	۳۲	۵	۱,۵۲۱	۵۳۳	۹۹	۱۳	۱۳	×	

تعلیم میں کھیلوں کی اہمیت

کھیل کا صحیح مفہوم | معمولی جراثیم اور کیڑے پانی میں نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے چڑھتے اور اُترتے ہیں۔ مرغابیاں سطح آب پر ایک دوسرے کا تعاقب کرتی ہیں۔ مچھلیاں اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہیں۔ درختوں پر بلبل چہچہاتے ہیں۔ ہرن میدانوں میں چھلانگیں مارتے ہیں۔ شیر خوار بچہ دودھ سے سیر ہو کر اِدھر اُدھر شیشی کو حرکت دیتا ہے یہ اور اس قسم کے جملہ حرکات کھیل کہلاتے ہیں یعنی کھیل سے مراد وہ بے ساختہ جسمانی حرکات ہیں جن سے ایک قسم کا خط حاصل ہوتا ہے اور یہ زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ کھیل کی تفہیم کے سلسلے میں ایک محقق یوں رقم طراز ہے۔ "کھیل فطری ورزش اور جسمانی و دماغی خوشی ہے" فرزبل لکھتا ہے "کھیل عالم طفلی کی ہونہار کلیوں کی شگفتگی ہے" ورسٹر ڈکشنری میں کھیل کی تعریف یوں لکھی ہوئی ہے "کوئی ورزش یا حرکات کا سلسلہ جو بغرض تفریح کیا جائے" اسٹانڈرڈ ڈکشنری میں کھیل کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے "کھیل وہ عمل ہے جو بے مقصد یا بہ غرض انبساط کیا جائے"

ایک شیر خوار بچہ بھوک لگنے کی وجہ سے دودھ کی شیشی حاصل کرنے کے لئے جو جدوجہد کرتا ہے وہ کھیل نہیں ہے کیونکہ یہ جدوجہد اس کی ذاتی ضرورت کی تکمیل کرتی ہے اور دودھ پی لینے کے بعد شیشی کو اِدھر اُدھر جو حرکت دیتا ہے وہ کھیل ہے اگرچہ دونوں حالتوں میں حرکات ایک ہی قسم کی ہوں گی۔ مگر عضویاتی کیفیت مختلف ہوگی۔ اگر ہم کھیل اور کام کے فرق پر بھی غور کریں تو کھیل کی صحیح تفہیم ہو سکتی ہے۔ ایک لڑکا محض مدرس کے خوف و ڈر سے گیمس میں حصہ لیتا ہے تو یہ گیمس کام کی نوعیت اختیار کر لیں گے۔ کیونکہ یہ بیرونی تحریک سے متاثر ہیں اور جب خوشی خوشی اقلیدس کے مسئلے محض طبع آزمائی کے لئے حل کرے گا تو یہ دلچسپ کھیل ہو جائیں گے۔ یہاں ہم نے دیکھا کہ کھیل اور کام میں فرق رجحانِ طبع پر موقوف ہے مشاغل

کی نوعیت پر نہیں۔ پس کھیل سے مراد ایسے مشاغل و معروفیات ہیں جن سے ذاتی ضروریات کی تکمیل نہ ہو بلکہ جبلی تقاضہ کی۔

کھیل کے متعلق نظریئے ماہرینِ نفسیات نے کھیل کے متعلق جو مختلف اور دلچسپ نظریئے پیش کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

نظریہ فاضل توانائی جس طرح ایک ریلوے انجن میں زیادہ بھاپ پیدا ہو جاتی ہے تو زائد بھاپ کو خارج کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی بچوں میں جو قوت و توانائی بلا صرفہ مجتمع رہتی ہے اس کے اخراج کے لئے کھیل ضروری ہے۔ اس نظریے کے پیش کرنے میں ہربرٹ اسپنسر اور شیلر المانوی شاعر و فلاسفر متفق ہیں۔ لیکن انھوں نے غور نہیں کیا کہ بیمار ابھی جوں ہی تندرست ہو جاتا ہے کھیل میں حصہ لیتا ہے۔ بچے باوجود تکان کے برابر کھیلتے رہتے ہیں۔ معمر حضرات دیگر مصروفیات میں تھک جانے کے باوجود کھیلتے ہیں۔

نظریہ تیاری مختلف کھیلوں کے ذریعے بچے ان مشاغل و حرکات کی مشق کرتے ہیں جو آئندہ زندگی میں اُنھیں پیش آنے والے ہوتے ہیں۔ اس نظریے کا پیش کرنے والا پروفیسر کارل گروس جرمنی کا عالم نفسیات ہے۔ لیکن اس نے شاید اپنے اس نظریے پر نظرثانی نہیں کی کیونکہ اگر یہ بربنائے حقیقت ہوتا تو معمر افراد کیوں کھیلتے اور بچے اپنی آئندہ زندگی کی مصروفیت سے ناواقف رہتے ہیں مگر کھیلتے ہیں۔

جبلی نظریہ اس کو نسلی اعادہ کا نظریہ یا نظریہ کلچری ادوار بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اعصابی عادات اور افعال ماضیہ کا اعادہ یعنی اسلاف کی کارگذاریوں کا اعادہ کھیل کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس نظریے کا پیش کرنے والا ڈاکٹر جی اسٹانلی ہال ہے لیکن اس کے پیش نظر حسب ذیل واقعات نہیں تھے کہ بچہ بلحاظ کلچر کھیل نہیں کھیلتا۔ معمر افراد کلچری ادوار ختم کر چکنے کے باوجود کھیلتے ہیں۔ بچے موجودہ سائنٹیفک کھیلوں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔

نظریہ رشک ورقابت | نقالی قوت ایجاد اور دوسروں کی نسبت اپنی کامیابی طشت از بام کرنے کی خواہش بچہ کھیل کے ذریعے پوری کرتا ہے۔ اس نظریے کا پیش کرنے والا میگڈوگل ہے۔ لیکن اس نے حسب ذیل حقائق کو نظر انداز کیا کہ شیر خوار بچہ تنہائی اور اون کے گولے سے بلا رشک ورقابت کھیلتا ہے اور جو کھیل رشک و رقابت کے جذبے کے تحت کھیلے جاتے ہیں اُن کی نوعیت جدا ہوتی ہے۔

تفریحی نظریہ | زندگی کی الجھنوں اور افکارات سے نجات پانے کے لئے قدرتی طور پر افراد کھیل میں حصہ لیتے ہیں۔ اس نظریے کے پیش کرنے والے نے یہ نہیں غور کیا کہ بچے بہ نسبت بالغوں کے کھیلوں میں زیادہ حصہ لیتے ہیں اور فارغ البال اور خوش حال افراد کو ہی کھیلوں میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔

کھیل کاہلی کا ردِ عمل ہے | کاہلی اور تساہل سے بچنے کے لئے افراد کھیل کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ لیکن اس نظریے سے اس امر کی تشریح نہیں ہوتی ہے کہ ہم روزمرہ کے ضروری اور ناگزیر دھندوں سے اکتا جاتے ہیں اور پھر کھیل میں کیوں حصہ لیتے ہیں۔

توازنی نظریہ | کھیل ایسی فعلیت ہے جو دماغی اور جسمانی قوتوں کو توازن میں رکھتی ہے اس نظریے کا پیش کرنے والا مسٹر پیاٹرک امریکن فلاسفر ہے۔ لیکن اس نے غور نہیں کیا کہ دماغی کام کرنے والے بھی کھیلتے ہیں۔

حیاتیاتی نظریے | اس کی رو سے کھیل جسم کی ساخت اور نمو پر منحصر ہے۔ یعنی کھیل کے حرکات و مشاغل ایسے ہوتے ہیں جو بڑھتے ہوئے جسم کی ضروریات کی تکمیل کے لئے ضروری اور موزوں ہوں اسی لئے عمر کے ہر مرحلے پر مختلف اقسام کے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ اس نظریے کی پیش کرنے والی خاتون مس ایلٹس ہے۔ اس نظریے کا تعلق حقیقت سے معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر جوزف لی بھی اس کی تائید کرتے ہوئے اس طرح رقمطراز ہیں "کھیل بالیدگی کے لئے بے حد ضروری ہے۔"

کھیلوں کے اقسام | بلحاظ نوعیت کھیلوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دیسی کھیل اور دوسرے انگریزی کھیل۔ دیسی کھیلوں سے کبڈی، گلی ڈنڈا۔ درختوں پر چڑھ کر پھل توڑنا تالاب یا دریا میں تیرنا۔ دیسی کسرت کرنا۔ مگدر پھرانا وغیرہ اور انگریزی کھیلوں سے مراد کرکٹ، ہاکی، اور فٹ بال وغیرہ۔ ماہرین کا خیال ہے کہ انگریزی کھیلوں کی بہ نسبت دیسی کھیل زیادہ مفید ہیں۔ کیونکہ ہمارے بزرگ صرف دیسی کھیل ہی میں حصہ لینے کے باعث ہم سے زیادہ صحت مند اور قوی الجثہ ہوتے تھے اور ان کھیلوں میں صرفہ بہت ہی کم ہے۔ علاوہ ازیں بلحاظ مکان کھیلوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ درون دروازہ، کھیل مثلاً شطرنج، بلیرڈ وغیرہ اور دوسرا بیرون دروازہ، کھیل مثلاً فٹ بال، کرکٹ اور والی بال وغیرہ۔

تعلیم میں کھیلوں کی اہمیت | تمام ماہرین تعلیم متفق ہیں کہ تعلیمی ترقی کے سلسلے میں کھیلوں کی ضرورت ایسی ہے جیسے توانا اور تندرست جسم کے لئے عمدہ غذا کی۔ ایک عام ضرب المثل بھی اس حقیقت کو یوں بے نقاب کرتی ہے کہ تندرست دماغ تندرست جسم میں ہی رہتا ہے مسٹر پیاٹرک امریکن فلاسفر کے خیال کے مطابق کھیل دماغی اور جسمانی قوتوں میں توازن برقرار رکھتا ہے۔ طلبہ جب دماغی کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو کھیل نہ صرف دماغی تھکن کو دور کرتے ہیں بلکہ دماغ کی کھوئی ہوئی توانائی کی تکمیل کرتے ہیں۔ طلبا کی تعلیمی مصروفیت اس قوت کا مظاہرہ ہے جو دماغ کے ریشوں اور اعصابوں کے جلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جلانے کا فعل خون کی آکسیجن انجام دیتی ہے۔ ان کے جلنے کی وجہ سے ایک طرف توانائی پیدا ہو کر ممدو معاون مصروفیت ہوتی ہے تو دوسری طرف مسموم فضلہ تیار ہو کر باعث ذہنی یا اعصابی یا دماغی تکان ہوتا ہے۔ اس مسموم فضلہ کو ہٹانے کے لئے تازہ خون کے دورہ کی ضرورت ہے۔ تاکہ یہ پسینہ وغیرہ کے ذریعے خارج ہو جائے۔ تازہ خون کا دورہ اور پسینہ کا اخراج جسمانی حرکات مثلاً کھیل، ڈرل وغیرہ پر موقوف ہے۔ چنانچہ ہر تعلیمی ساعت

کے اختتام پر ایک منٹ کی ڈرل کے لئے اسی وجہ سے زور دیا جاتا ہے۔
عموماً طلبا، تنگ و تاریک کمروں میں بیٹھ کر محنت شاقہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان میں ضعف معدہ کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ یہ شکایت کھیلوں میں حصہ لیتے رہنے سے بہت جلد رفع ہوجاتی ہے۔ کھیلوں سے نہ صرف جسمانی صحت مندی حاصل ہوتی ہے بلکہ بہادری اطاعت، ایمان داری اور اشتراک عمل جیسے اعلیٰ صفات پیدا ہوتے ہیں روایت ہے کہ ایٹن اسکول کے کھیل کے میدان میں جنگ واٹرلو میں فتح یابی حاصل ہوئی تھی۔ غرض تعلیم میں کھیلوں کی بڑی اہمیت ہے۔ کھیلوں کی وجہ سے طلبہ بام عروج پر پہنچتے ہیں اور دنیا میں ان کے کارنامے مثل آفتاب کے روشن رہتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے بعض ماہرین تعلیم کھیلوں کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ کھیل ہی تعلیم کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ اور کھیل ہی کی بدولت طالب علم کو صحیح زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔
وینل پولنگ لکھتا ہے :-

Give me the direction of the play life of the youth of this generation and I will dictate the path tomorrow.

کھیل کی اسپرٹ | کھیل کی اسپرٹ سے مراد وہ رجحان طبعی ہے جو درجہ نشوونما کے موافق ہو اور جس کی بدولت مصروفیات کی انجام دہی برضا و رغبت ہو۔ آج کل ماہرین تعلیم اس کھیل کی اسپرٹ کو مدرسے میں رواج دینے کے کوشاں ہیں تاکہ طلبا، بغیر مدرس کی تحریک کے خوشی خوشی تعلیمی مصروفیات میں حصہ لیں تاکہ تعلیم مفید اور موثر ہوسکے حقیقت یہ ہے کہ طلبا، جب اس اسپرٹ کے زیر اثر مدرسے کی مصروفیات میں حصہ لیتے ہیں تو ان کو ترک کر کے گھر جانا دوبھر معلوم ہوتا ہے۔

کھیل اور جسمانی تربیت | قدیم زمانے میں بچوں کو اپنے والدین کے کام کاج میں حصہ ملتا تھا

جس کی وجہ سے وہ طاقتور اور جسیم ہوتے تھے ۔ موجودہ زمانے میں بچوں کو ان کی ابتدائی عمر ہی میں درسگاہ میں شریک کرا دیا جاتا ہے ۔ پس ان کی جسمانی تربیت اور صحیح نشوونما کے لئے مدرسے میں کھیل ہی موزوں ذریعہ ہے جس کی وجہ سے ان کے تمام اعضاء کی اچھی اور عمدہ تربیت ہوتی ہے اور وہ قوی اور طاقتور بن سکتے ہیں ۔ جسمانی قوت اور توانائی جیساکہ اکثر ماہرین تسلیم کرتے ہیں، اخلاقی سیرت کا ایک جزو ہے کیونکہ پُرخطر مواقع پر ثابت قدم رہنے اور دل کو مضبوط کرکے جرأت اور دانشمندی سے کام لینے کے لئے اچھی جسمانی قوت اور توانائی کی ضرورت ہے ۔

کھیل اور عقلی تربیت منظم کھیلوں میں جب بچے حصہ لیتے ہیں تو ان کو ان میں توجہ، تفکر اور تخیل کو کام میں لانا پڑتا ہے ۔ جس کی وجہ سے ان کی اچھی تربیت ہوتی ہے فیصلہ کی تربیت کھیل میں بہت اہم ہے ۔ فوری اور صحیح فیصلے کے لئے کھلاڑی کو اچھا مشاق ہونا ضروری ہے مثلاً فٹ بال کے کھیل میں ایک سیکنڈ کے اندر گیند کو ٹھوکر لگانے کے لئے سمت زاویہ اور قوت کا فوراً صحیح فیصلہ کرنا پڑتا ہے ۔ ورنہ غلط فیصلہ پر بڑی شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے اس لئے کھیلوں میں فیصلہ کی تربیت نقالی مضامین سے زیادہ ہوتی ہے ۔ علاوہ ازیں کھیلوں میں بچہ اپنی ذات کو فراموش کرکے کھیل کے حرکات میں منہمک رہتا ہے ۔ یہ خود فراموشی رہنمائی کے لئے راستہ صاف کرتی ہے ۔

کھیل اور معاشرتی تربیت کھیل میں حصہ لینے سے بچہ بخوبی معلوم کر لیتا ہے کہ ہم صحبتوں کی کتنی اہمیت اور ضرورت ہے سادہ منظم کھیلوں اور ان کے مقابلوں میں مثلاً ہاکی فٹ بال اور کرکٹ میں بچوں کو شریک کرا کے اشتراک باہمی کے جذبات کی بخوبی تربیت کی جا سکتی ہے ۔ چونکہ بچہ اپنی ٹیم کی خاطر اپنی انفرادی حیثیت کو مٹا دیتا ہے ۔ اس لئے

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

کا حقیقی درس بچے کو کھیل ہی سے بخوبی حاصل ہو سکتا ہے ۔ اپنے لیڈر کی اطاعت ۔ فرمانبرداری

اور اس کا احترام کرنا۔ کھیلوں کی وجہ سے ہی بچہ عمدگی سے سیکھتا ہے۔ کسی نے بجا کہا ہے کہ "کھلاڑی پن ہی اخلاقیات کا اولین سادہ اساس ہے"

کھیل اور عملی تربیت | خود اعتمادی۔ قوت عمل اور معینہ مقصد کامیاب زندگی کی خصوصیات ہیں۔ ان کی تربیت اور ان کا حصول حقیقی طور پر کھیلوں میں حصہ لینے سے ہوتا ہے۔ اگر ان کے ساتھ تھوڑا سا علم بھی شامل کر لیا جائے تو شاندار نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ کام خواہ کتنا ہی دلچسپ ہو۔ دو تین گھنٹوں کی محنت کے بعد انسان تھک جاتا ہے مگر جو بچے کھیلوں میں زیادہ عرصے تک حصہ لے کر بلا تھکن محنت و مشقت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ کام کو بھی بلا تھکن انجام دے سکتے ہیں۔ خدا ترسی اور تندہی کے مظاہرے کھیل ہی کی بدولت نمایاں ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں حرکات و سکنات میں آسانی و تناسب کھیل ہی کی وجہ سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ طالب علم کی عملی زندگی میں کھیل کس قدر معاونت پیدا کر دیتے ہیں۔

کھیل اور شہریت | کھیل کے میدان میں تمام حصہ لینے والوں کی حیثیت یکساں رہتی ہے۔ یہاں امیر و غریب کا امتیاز نہیں رہتا ہے۔ اپنے حقوق کی حفاظت اور دوسروں کے حقوق کی نگہداشت کا سبق کھیل ہی میں عملی طور پر ملتا ہے۔ اخلاقی اور مدنی تربیت کے جو مواقع کھیل میں حاصل ہوتے ہیں وہ کسی نصابی مضمون سے نہیں ہوتے۔ رضاکارانہ خدمات کی انجام دہی کا سبق کھیلوں کے ہی میدان سے حاصل ہوتا ہے۔ ٹیم کے ساتھ پوری وفاداری اپنی انفرادیت پر غالب آ جاتی ہے۔ جس سے شہریت اور جمہوریت کا صحیح احساس پیدا ہوتا ہے۔

تعلیم میں کھیلوں کی اہمیت کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ہم اس اہم نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کھیل کو تعلیم کے سب سے بڑے ارکان میں سے ایک سمجھا جانا مناسب اور ضروری ہے۔ تعلیم سے مراد اس صلاحیت اور عقل تمیزی کی تربیت ہے جو عملی زندگی کے کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کام میں لائی جاتی ہے۔ یہ تربیت کھیلوں کے اہم حصے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔

محمد مختار احمد بی ایس سی

زرعی ترقی کے لئے حکومت ہند کا منصوبہ

ذیل میں اس یادداشت کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جسے زراعت اور فلاحت حیوانات کی ترقی کے لئے زرعی تحقیقات کی شاہی کونسل کے مشاورتی بورڈ نے حکومت ہند کے لئے تیار کیا ہے۔

مسئلہ | ہندوستان کی سب سے اہم غذا اناج ہیں۔ یعنی چاول، گیہوں اور جوار باجرا ہندوستان کی اکثر غذاؤں کے ساتھ دالیں بھی ملا کر کھائی جاتی ہیں۔ چکنائی حاصل کرنے کے لئے اکثر لوگ نباتی تیل اور گھی کو استعمال کرتے ہیں۔ دودھ اور دودھ کی بنی ہوئی چیزیں ملک کے بعض حصوں اور بعض گروہوں میں اگرچہ خاصی مقدار میں کھائی جاتی ہیں لیکن اکثر حصوں میں غریبوں کی بڑی تعداد ان کا استعمال بہت کم کر پاتی ہے۔ غذا کے بارے میں جو پیمائشیں کی گئی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی تیس فی صدی آبادی یعنی دس کروڑ سے زائد آدمیوں کو عام زمانوں میں ضرورت سے کم غذا میسر آتی ہے۔

پھر غذا محض مقدار کے لحاظ سے ناکافی نہیں ہوتی بلکہ اس کی نوعیت بھی ناقابل اطمینان اور غیر متوازن ہوتی ہے۔ چکنائی کا استعمال بلا استثنا کم کیا جاتا ہے۔ چاول کھانے والوں کی غذا میں عموماً چونے کی کمی ہوتی ہے اور ہندوستان کی اکثر غذاؤں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں حیاتین بہت کم ہوتے ہیں۔

مقصد | ہندوستان میں خاص خاص غذاؤں کی سالانہ پیداوار کا اوسط تقریباً حسب ذیل قرار دیا جا سکتا ہے۔

اناج	۴ کروڑ ٹن
دالیں	۵۰ لاکھ ٹن
چکنائیاں اور تیل	۱۹ " "

پھل ... ... ۹۰ لاکھ ٹن

ترکاریاں ... ... ۹۰ " "

دودھ[1] ... ... ۲ کروڑ ۳۰ " "

گوشت مچھلی اور انڈے ... ... ۱۵ " "

بظاہر پیداوار کی یہ مقداریں بہت کثیر معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ماہرینِ غذائیات نے مناسب اور متوازن غذا کی جو کم ترین مقدار مقرر کی ہے اس کے مقابلے میں ۴۰ کروڑ آبادی کے لئے ان سے ناکافی غذاء حاصل ہوتی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے غذا کی پیداوار میں حسب ذیل اضافے کرنا ضروری ہیں۔

اناج میں دس فی صدی۔ دالوں میں بیس فی صدی چکنائی اور تیلوں میں دو سو پچاس فی صدی۔ پھلوں میں پچاس فی صدی۔ ترکاریوں میں سو فی صدی۔ دودھ میں تین سو فی صدی مچھلی اور انڈوں میں تین سو فی صدی۔

اس لئے قومی خود کفالت کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے پیداوار کے اتنے اضافہ فی صدی کو کم ترین مقصد قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر اس نصب العین کی تکمیل کے سلسلے میں دودھ اور جانوروں کی محنت کی مقدار کے بڑھانے کی جو ضرورت ہوگی اُسے جانوروں کے لئے کافی چارہ مہیا کرکے ہی پورا کیا جا سکے گا۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ اس کے لئے کھلی اور دیگر دودھ بڑھانے والی غذاؤں کی مقدار میں چار سو فی صدی اور چارہ کی مقداروں میں پچپن فی صدی اضافہ کرنا ضروری ہوگا۔ آخر میں غذائی فصلوں اور تجارتی فصلوں کے درمیان بھی ایک مناسب توازن پیدا کرنا ہوگا تاکہ لوگوں کو نہ صرف کافی غذاء کھانے کو میسر آئے بلکہ ان کی قوت خرید بھی بڑھے، جس سے کہ وہ کپڑا اور دوسری وہ سہولتیں فراہم کر سکیں جو ایک زیادہ مکمل اور زیادہ خوش حال زندگی کے لئے ضروری ہیں۔

---

[1] اس میں سے صرف ۲۰ فی صدی یعنی ۴۶ لاکھ ٹن دودھ کی صورت میں اور باقی مٹھے اور گھی کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں مختلف اسباب کی بنا پر، اکثر فصلوں کی پیداوار فی ایکڑ بہت کم ہے۔ مزروعہ رقبہ کا ۴/۵ حصہ بارانی ہے اور اس کی کامیابی کا دارومدار تمام تر بارش پر ہوتا ہے۔ بیشتر علاقہ میں بارش یا تو غیر یقینی ہوتی ہے یا نا وقت ہوتی ہے۔ کاشتکار اپنی مجبوریوں یا ناواقفیت کی بنا پر اپنی زمین سے اور بارش اور آبپاشی کی سہولتوں سے جتنا فائدہ اُٹھانا چاہئے اتنا نہیں اُٹھاتا۔ وہ اپنی فصلوں میں یا تو ناکافی کھاد ڈالتا ہے یا سرے سے ڈالتا ہی نہیں ہے کاشتکاروں کی اکثریت بیجوں کی بہترین اور ترقی یافتہ قسموں کا استعمال نہیں کرتی۔ کاشت کا معیار پست ہے اور دقیانوسی ہل ہی واحد اوزار ہے جس سے کہ عام طور پر کام لیا جاتا ہے نقصان رساں جانوروں اور فصلوں کی بیماریوں کی کوئی روک تھام نہیں کی جاتی کھیت میں گھاس پات خوب اپنی مرضی کے مطابق اُگتی رہتی ہے اور زمین کا ڈھال اس قسم کا ہوتا ہے کہ اوپر کی زرخیز مٹی کٹ کٹ کر باہر بہہ جاتی ہے اور بارش اور سطح کے پانی کو مینڈیں بنا کر اور دوسرے ذرائع اختیار کر کے قابو میں رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی یہ چند وہ امور ہیں جن پر مناسب توجہ کر کے کاشتکار اپنی زمین کی پیداوار میں بلاواسطہ اضافہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح اپنے پالتو جانوروں سے بھی اُسے فائدہ کم حاصل ہوتا ہے۔ انھیں اول تو چارہ ناکافی مقدار میں دیا جاتا ہے دوسرے ان کی نسل کشی میں کوئی امتیاز ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ غیر تسلی بخش انتظام اور امراض کی تباہی کی وجہ سے پیداوار فی جانور جتنی ہندوستان میں کم ہے اتنی دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہے۔

ذرائع | غذائی خود کفالت اور قوت خرید کے اضافہ کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اولین ضرورت یہ ہے کہ تمام قومی وسائل کے بہترین استعمال کی ضمانت کی جائے اور سائنس اور ٹیکنالوجی نے اب تک جو جو طریقے معلوم کئے ہیں ان سب سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا جائے۔ ان ذرائع میں حسب ذیل کو شامل کیا جا سکتا ہے:۔

پانی:۔ فصلوں کی پیداوار پر کسی دوسرے واحد عامل کا اتنا زبردست اثر نہیں پڑتا

جتنا کہ آبپاشی کا پڑتا ہے۔ چاہے وہ مصنوعی ہو یا قدرتی۔ اس کے ذریعے غیر بارانی ریگستان جہاں کوئی فصل نہیں ہوتی پُر بہار اور ثمردار نخلستانوں میں تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔ اور غیر یقینی بارش کے علاقوں سے ہر سال یقینی پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے۔ پھر ان آخر الذکر علاقوں میں نہ صرف پیداوار کو یقینی بنایا جا سکتا ہے بلکہ جب آبپاشی پر قابو رکھنا ممکن ہوتا ہے تو اُن کی پیداوار کو سو فی صدی تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ غیر بارانی علاقوں کو بارش سے جو فائدہ ہے اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ پھر چونکہ مزروعہ رقبہ کا کچھ حصہ غیر آبپاشی شدہ ہے۔ اس لئے ملک میں بصورت مجموعی پانی کے تمام ذرائع کے بیش تریں استعمال سے پیداوار کو غالباً پچاس فی صدی تک بڑھایا جا سکے گا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ پانی کے تمام ذریعوں سے بیش ترین فائدہ اُٹھانا نہایت لازمی ہے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے حسب ذیل طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ ان دریاؤں کے بہاؤ، رفتار اور سمت کو گرفت میں لانا جن میں پانی کی رسد کافی ہوتی ہے، اور ان کے پانی کی تقسیم کے لئے آبپاشی کی نہریں تعمیر کرنا۔

۲۔ جہاں بہاؤ کی آبپاشی ممکن نہیں ہے وہاں براہِ راست دریاؤں یا نہروں سے پانی کو اُٹھانے کے لئے مشینی ذرائع کا استعمال کرنا۔

۳۔ ایسے تہ نشین پانی کے لئے جو آبپاشی کے لئے موزوں ہو۔ نل دار کنوئیں (ٹیوب ویل)، اور کھُلے رہنے والے کنوئیں بنانا اور موجودہ کنوؤں میں سوراخ کرنا (بورنگ)

۴۔ آبپاشی کے لئے چھوٹی تعمیرات بنانا، مثلاً تالاب اور ان میں بارش کا زاید پانی پہنچانا تاکہ اُسے بعد میں استعمال کیا جا سکے۔

۵۔ مٹی کے کٹاؤ کو قابو میں لا کر بند کرنا، اور ڈھلوان زمین کو مختلف سطحوں کے ہموار چبوتروں میں تقسیم کر کے بارش کے پانی کو استعمال کرنا اور کاشت کے موزوں طریقوں کے ذریعے بارش کے پانی کو زمین کے اندر زیادہ سے زیادہ محفوظ رکھنا۔

پانی سے بیش ترین فائدہ اٹھانے کے لئے اولیں شرط یہ ہے کہ وسائل اور ان رقبوں کی جنہیں ترقی دینا ہے مکمل پیمائش کرائی جائے اس کے بعد ضروری اسکیمیں تیار کی جائیں جب یہ باتیں ہو جائیں تب آخری مفصل فیصلے کئے جائیں۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں۔ ان ابتدائی منزلوں سے گذرنے میں ممکن ہے کئی برس لگ جائیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ ترقی کا کام جب تک سب رقبوں کی پیمائش نہیں ہو جائے گی اس وقت تک رکا رہے گا۔ نئی تعمیرات کا کام ہر منفرد رقبہ یا منصوبہ کی پیمائش کے بعد شروع کیا جا سکتا ہے اور اس کے بارے میں اسکیم تیار کی جا سکتی ہے اور مفصل لاگت کے تخمینے کرائے جا سکتے ہیں۔

زمین :- زمین سے بہترین فائدہ بھی کئی طریقوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے

(الف) ۷ کروڑ ایکڑ کے اس مجموعی رقبہ میں سے جو اس وقت پڑتی یا بنجر پڑا ہوا ہے ایسے رقبے کو کاشت میں لانا جس پر فصلوں کا پیدا کرنا ۔ نفع بخش بنایا جا سکتا ہے۔ بظاہر مٹی کے کٹاؤ، بارش کی زیادتی یا قلت، انتہائی شوریت اور القلیت اور گہری جڑوں والی گھاس پات نے اس بڑے بنجر رقبہ کو کاشت کے لئے ناموزوں بنا رکھا ہے۔ لیکن بہت سی صورتوں میں نہ تو ان رقبوں کے محل وقوع کا علم ہے جنہیں دوبارہ کاشت میں لایا جا سکتا ہے اور نہ اس بات کا کہ ان کی وسعت کیا ہے۔ اس لئے اولین ضرورت یہ ہے کہ اس بات کی پیمائش کرائی جائے کہ زمین کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر کاشت نہ کئے جانے کے اسباب کیا ہیں۔ ان پیمائشوں کے بعد زمین کی بازیابی کے لئے موزوں اسکیمیں تیار کرائی جا سکتی ہیں۔

(ب) زمین کے کاشت سے خارج ہو جانے کی روک تھام کی جائے۔ اس ذیل میں سب سے اول کام تو زمین کے کٹاؤ پر قابو حاصل کرنا ہے جس کے لئے اولین ضرورت یہ ہے کہ ہر بڑے طاس کے علاقے کے پانی کو قابو میں رکھا جائے اور زرعی زمین پر سے اس کے گذرنے کا تدارک کیا جائے۔ کیونکہ وہ اس کی زرخیز سطح کو بہالے جاتا ہے۔ (اس اصل مقصد کے حصول کے ضمن میں پانی کو اس طرح بھی گرفت میں رکھا جا سکتا ہے کہ اس سے آبپاشی کا پانی نکلے

کا یا دونوں کام لئے جا سکیں۔ اس معاملے میں بھی پہلی منزل یہ ہے کہ بڑے بڑے خاص کے علاقوں کی پہلے پیمائش کرائی جائے اور بعد میں ان پر قابو حاصل کرنے کے لئے ضروری اسکیمیں تیار کرائی جائیں۔

ڈھالو زراعتی زمینوں کو ان تباہ کن اثرات سے محفوظ کرنے کے لئے جو شدید بارش کے پانی یا غیر قابو یافتہ پانی کے بلند سطح سے بہہ کر آنے اور اپنے ساتھ اوپر کی زرخیز مٹی کو بہا کر لے جانے سے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ چبوترہ بندی اور پشتہ سازی کی ایک ملک گیر پالیسی کو اختیار کیا جائے۔ ان پشتوں کی مناسب تقسیم، درجہ بندی اور تعداد کیا ہو اس کا فیصلہ کرنے کے لئے بھی گاؤں گاؤں کی پیمائش انجینیروں سے کرانا ضروری ہے۔ اس کے بعد پشتہ کی ضروری لمبائی کا تعین کیا جا سکے گا اور مقررہ سالوں کی ایک مدت کے لئے پشتہ سازی کا ایک مکمل منصوبہ تیار کیا جا سکے گا۔

(ج) زمین سے مناسب فائدہ حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ناگزیر ہے کہ سائنس کے تجربے اتنے بڑے پیمانے پر کئے جائیں کہ جن کے ذریعے زراعت کے افسر کو یہ موقع حاصل ہو کہ وہ کاشتکار کو بتلا سکے کہ اس کی مخصوص زمین اور اس کی انفرادی ضرورتوں کے لئے کاشت کا کون سا طریقہ موزوں ترین ہوگا۔ موجودہ زمانے میں بعض معاملات کے بارے میں ہر چند خاصی معلومات موجود ہیں لیکن دوسرے ایسے معاملے بھی ہیں جن کے بارے میں معلومات قطعاً ناکافی ہیں۔ ان معلومات کے اکٹھا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سارے ملک کی ہر قسمت کے اندر جہاں جہاں اس وقت کوئی تجربی فارم موجود نہیں ہے اس قسم کا فارم قائم کیا جائے۔

(د) زمین سے بیش ترین فائدہ اٹھانے کی آخری تدبیر کا تعلق زیادہ تر خود کاشتکار کی ذات سے ہے اور اس میں فصلوں کی پیداوار کو بڑھانا شامل ہے جس کے لئے کاشت کے ترقی یافتہ طریقے اختیار کرنا ضروری ہیں۔ مثلاً کھاد دینا، بہتر بیج کا بونا، جتائی کے

طریقوں کو بہتر کرنا، نقصان رساں جانوروں اور امراض پر قابو پانا۔

غذائی فصلوں کو کھاد سے جو فائدہ پہنچتا ہے، وہ فصل زمین، آب و ہوا اور آبپاشی کی سہولتوں کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ مناسب کھاد کی وجہ سے چاول کی فصل میں فی ایکڑ بیس تا ایک سو پچاس فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ ہندوستان کے لئے بصورت مجموعی تیس فی صدی کا اضافہ عملی طور پر قابل حصول تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ گیہوں پر کھاد کے جو تجربے کئے گئے ہیں ان میں صفر سے لے کر ۶۵ فی صدی تک اضافہ ہوا ہے۔ اس فصل کے لئے بصورت مجموعی ۲۰ فی صدی اضافہ لائق حصول قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر آبپاشی کی سہولتیں بھی حاصل ہوں گی تو اضافہ اور بھی بہت زیادہ ہوگا۔

کھاد کے ایک ہمہ گیر پروگرام میں تمام کھادوں کو شامل کرنا ہوگا اور ان کو کافی مقدار میں پیدا کرنے کے لئے تدبیریں اختیار کرنا ہوں گی۔ جانوروں کے باڑے کے کھاد کا موجودہ زمانے میں صرف چالیس فی صد حصہ زراعتی زمینوں میں پہنچ پاتا ہے۔ اس تناسب کو جب ہی بڑھایا جا سکے گا جب گوبر کے ایندھن کے بدلے میں کسی دوسرے ایندھن مثلاً لکڑی یا معدنی تیل کی کافی رسد مہیا کی جا سکے گی۔ آبپاشی شدہ غذائی فصلوں اور گیہوں اور چاول کے لئے نباتی کھاد کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ شہر اور دیہات کے تمام نباتی فضلہ کو کمپوسٹ کھاد بنا کر دوبارہ زمین میں پہنچا دینا چاہیئے۔ کھلی کو بھی بڑی مقدار میں فراہم کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ تلہن کا صرف تیل ہی غیر ملکوں کو برآمد کیا جائے اور ان کی کھلی کو جانوروں کی غذا اور کھاد کے لئے رکھ لیا جائے۔ مصنوعی کھاد خصوصاً سلفیٹ آف امونیا اور بعض علاقوں کے لئے فاسفیٹ کے کھاد بھی) سستی قیمت پر بہت بڑی مقدار میں فراہم کرنے چاہئیں۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں سالانہ پچاس لاکھ ٹن سلفیٹ آف امونیا سے کم کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس وقت تین لاکھ پچاس ہزار ٹن سالانہ کی تیاری کا مسئلہ زیر غور ہے۔

بیج کی ترقی یافتہ قسموں کے بونے سے پیداوار فی ایکڑ کو دس تا پندرہ فی صد بڑھایا جاسکتا ہے۔ بیج کو کافی مقدار میں فراہم کرنے کے لئے رجسٹری شدہ بیج بونے والوں کی نگرانی میں، بیج کے بہت سے فارم قائم کرنا ہوں گے اور انھیں بیج کی منظم پیداوار سے منسلک کرنا ہوگا۔ اس بیج کی تقسیم اور اس کی قیمت بصورت جنس یا نقد کی وصول یابی کے لئے پانچ ہزار بیج گودام قائم کرنا ہوں گے۔

بوائی کے طریقوں میں ترقی کا جو علم اب تک حاصل کیا گیا ہے وہ کسانوں کی رہنمائی کے لئے بعض معاملوں میں تو کافی ہے لیکن دوسرے معاملوں میں ناکافی ہے اور جو نئے تجربی فارم آیندہ قائم کئے جائیں گے ان کے لئے ابھی بہت سا کام کرنا باقی ہے تب کہیں زمین اور آب ہوا کی تمام مختلف حالتوں میں کسان کو مکمل رہنمائی فراہم کی جاسکے گی۔ بیلوں سے کھنچے جانے والے ترقی یافتہ اوزاروں کے ایجاد کرنے میں ہندوستان کے مختلف حالات کا لحاظ کرتے ہوئے عملی تحقیقات کی ضرورت باقی ہے۔ قوت محرکہ سے چلنے والی مشینوں کو جو اہمیت پیداوار کے بڑھانے میں حاصل ہوگی ان کے پیش نظر ٹریکٹروں اور اُن کے اوزاروں اور مشینوں کا درآمد کرنا اور ان سے وسیع پیمانے پر تجربہ کرنا بھی ضروری ہوگا۔ جب تک اس بات کی پیمائش نہ کی جائے کہ مختلف علاقوں میں قوت محرکہ سے کاشت کی کتنی گنجائش ہے اور اس کی معاشیات کے بارے میں تجربے نہ کئے جائیں اس وقت تک اس قسم کی کاشت کا مستقبل تاریکی ہی میں رہے گا۔

قوت محرکہ کی کاشت کے امکانات سے ملا جلا ایک اور مسئلہ بھی ہے یعنی یہ کہ بیش ترین پیداوار اور بیش ترین بہبود کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کاشت کے کن مختلف نظاموں کی توسیع کے مواقع ہندوستان میں زیادہ موجود ہیں۔ بہت سوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک کھیتوں کی چک بندی نہیں کی جائے گی ان کی پیداوار نہیں بڑھ سکے گی۔ دوسرے لوگ ایسے ہیں جنھوں نے گاؤں کو اکائی مان کر فصلوں کی

چک منڈی کے تجربے کو کامیابی کے ساتھ چلا رہا ہے۔ اشتمالی کاشت اور امداد باہمی کی کاشت کے حامی بھی موجود ہیں۔ جب تک بڑے بڑے رقبوں میں ان تمام نظاموں کا تجربہ نہ کیا جائے اس بارے میں کوئی عمومی بیان دینا کہ ان میں سے کون سب سے بہتر ہے یا یہ مشورہ دینا کہ کسی خاص علاقے یا حالات کے لئے کون سا نظام سب سے زیادہ موزوں ہے ناممکن ہوگا۔ اس کے بارے میں تحقیقاتیں کرانا نہایت ضروری ہے اور ان کو بلا تاخیر شروع کر دینا چاہئے۔

نقصان رساں جانوروں اور بیماریوں سے فصلوں کی کافی حفاظت کرنے سے پیداوار میں گمان یہ ہے کہ اوسطاً پانچ فی صد اضافہ کیا جاسکے گا۔ جب ذخیرہ کے طریقوں میں بھی زیادہ احتیاط برتی جائے گی تو غذائی اناج کی اور زیادہ مقدار کھانے کے لئے محفوظ کی جا سکے گی۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے حفاظتی طریقوں کو پوری طرح رائج کرنے سے پہلے نہ صرف مختلف سمتوں میں مزید علمی تحقیقات اور تجربوں کی ضرورت ہے بلکہ کافی بڑے پیمانے پر کیڑا مار اور پھپوند ضائع کرنے والی دوائیں اور ان کے استعمال کرنے کی مشینوں کو بھی تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر آلو جیسی پیداوار کو اس عظیم نقصان سے بچانا ہے جو ذخیرہ کے زمانے اس کو پہنچتا ہے تو ہمیں سرد ذخیروں کا بھی خاص کر بیج کے آلوؤں کے لئے انتظام کرنا ہوگا۔

پالتو جانور | ہندوستان کے گلوں اور ریوڑوں کی پیداوار میں اضافہ کا انحصار بہت بڑی حد تک ان کی غذا کی مقدار اور اس کی نوعیت کی بہتری پر ہے۔ یہاں ہر قسم کی غذا کی کمی پائی جاتی ہے۔ بھوسے اور اناج کی ضمنی پیداواروں کی رسد میں تو اس وقت اضافہ ہو سکے گا۔ جب انسانی خوراک کے لئے زیادہ اناج بویا جائے گا۔ لیکن چارہ کی ضرورت کو بہت بڑی حد تک گھاس کو خشک کرنے اور سبز حالت میں گڑھے کے اندر دبانے سے اور چارہ کی زمینوں کے معقول انتظام سے اگر ان میں مناسب توسیع بھی کر دی جائے پورا کیا جا سکے گا۔ تلہن کی صنعت سے جو کھلی حاصل ہوتی ہے وہ ضرورت کے صرف چوتھائی حصے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اس کی رسد کے بڑھانے کا طریقہ یہ ہے کہ کھلی کی برآمد پر پابندی عائد کی جائے۔

اناجوں کی پیداوار بڑھائی جائے۔ چارہ کے لئے بوئی ہوئی فصلیں بھی پالتو جانوروں کے لئے قیمتی غذا مہیا کرتی ہیں لیکن چونکہ ان کے بونے کے لئے اکثر انھی زمینوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کی انسانی غذا کے بونے کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے ان کو مقابلے میں دوسرے درجے پر رکھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود چارہ کی فصلوں کی پیداوار بڑھانے کی (خاص طور پر دودھ دینے والے مویشیوں کے لئے) فوری ضرورت ہے اور اس کی طرف مناسب توجہ کرنی چاہیے۔

آج کل جو مویشی پائے جاتے ہیں ان سے بیشتر کی نسل میں کوئی بات لائق ذکر نہیں ہوتی مویشی کی پیداوار کے بڑھانے کے سلسلے میں دوسرا کام یہ ہے کہ ان کی درجہ بندی کرکے ان کی نسل کو ایسی معروف نسلوں کے معیار تک ترقی دی جائے جن کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ ان کے اندر سب مذید خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے لئے نسل کشی پر نگرانی رکھنا ضروری ہے اور اسی کے لئے بڑی تعداد میں اعلیٰ نسل کے سانڈ فراہم کرنا چاہئیں۔ اس مقصد کے پیش نظر نسل کشی کے پچاس فارموں سے ابتدا کی جاسکتی ہے۔

پالتو حیوانوں کی پیداوار میں فوری اضافہ دیہات کے بعض روزمرہ کے کاموں کے انتظام میں تبدیلیاں پیدا کرنے سے کیا جاسکے گا۔ مثلاً ایسے کاموں سے دودھ دینے والی گایوں کے خشک رہنے کے زمانے کو مختصر کیا جاسکے گا یا ایسے کاموں سے جن کے ذریعے موسم کی سختی سے حفاظت کرکے نئی نسل کی زندگی اور تندرستی کو محفوظ کیا جاسکے گا یا پھر ایسے کاموں سے جن کے ذریعے مناسب طور پر نظم و ضبط قائم رکھ کر اور ابتدائی طور پر انھیں مصنوعہ شکل دے کر حیوانی پیداواروں کا تحفظ کیا جاسکے گا۔

پھر ضرورت اس کی ہے کہ مندرجہ بالا ترقیوں سے جن اچھے نتائج کے حاصل ہونے کی توقع ہے وہ بیماریوں کے پھیلنے کی وجہ سے برباد نہ ہوجائیں۔ جانوروں کی رائج الوقت وبائی بیماریوں کا تدارک کرنے کے سلسلے میں بہت سی باتیں ابھی دریافت کرنا باقی ہیں

لیکن بیماری کے بارے میں تحقیقات سے جو علم فی الحال حاصل ہو چکا ہے اس کے فوری اور وسیع استعمال کے ذریعے بھی ملک کو زبردست نقصان سے بچایا جا سکتا ہے۔ مزید تحقیقات کے علاوہ سب سے زیادہ فوری ضرورت یہ ہے کہ کافی مقدار میں آدمی فراہم کئے جائیں تاکہ مناسب تدبیر یا صحیح وقت پر یعنی بیماری کے جاگزیں ہونے سے پہلے نہ کہ بعد میں استعمال کی جا سکیں۔

پالتو جانوروں کے بارے میں ہزاروں مسائل پر علمی تحقیقات کرنا ضروری ہے اور ان میں سب ہی طرح کی چیزیں شامل ہیں مثلاً افزائش نسل کے طبعی طریقوں میں سائنس کی مداخلت اور فراہمی غذا کی معاشیات سے کر روزانہ زندگی کے ایسی معمولی مسائل تک کہ گاؤں کے مخصوص حالات کی روشنی میں مرغی خانہ کا موزوں ترین نقشہ کیا ہو سکتا ہے۔

حیوانی پیداواروں کی فروخت کی دقتوں کی وجہ سے بھی ان کی پیداوار کو ایک محدود حد تک ہی بڑھایا جا سکتا ہے۔ دودھ کے جمع، منتقل اور تقسیم کرنے کے سلسلے میں بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کی نوعیت ہر اس رقبہ کے لئے جس کو کہ دودھ مہیا کرنا ہوتا ہے مختلف ہوتی ہے۔ ان کے مناسب بندوبست کے لئے ابتداءً یہ ضروری ہے کہ رقبہ متعلقہ کی نہایت احتیاط کے ساتھ پیمائش کرائی جائے۔ مکھن سازی کی جدید آلات کو بھی گاؤں میں رواج دینے کی ضرورت ہے اور دودھ کی پیداواروں کو مصنوعہ شکل دینے کے لئے مناسب کارخانے قائم کرنا بھی توسیع و ترقی کی ضروری شکلیں ہیں۔ لیکن ان کے لئے بہت زیادہ سرمایہ درکار ہے۔

ملک کے مچھلی کے وسائل سے کبھی کافی مقدار میں اور مسلسل طریقے پر فائدہ نہیں اٹھایا گیا سمندر سے مچھلی پکڑنے کے ترقی یافتہ طریقوں کی آزمائش کرنی اور انھیں ترقی دینی چاہیے۔ جو مچھلی پکڑی جاتی ہے اس کو ہاتھ لگانے، تیار کرنے، ذخیرہ کرنے اور منتقل کرنے کے لئے بھی جدید ذرائع کی تحقیقات کرنا چاہیے۔ بعض سمتوں میں تو فوری کارروائی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً خشکی کے اندر ماہی گاہوں کے میں فوری توسیع، تالابوں، جھیلوں، اور جوہڑوں میں

مچھلی کے مناسب بیج ڈال کر کی جاسکتی ہے۔ بنیادی اور ترقی دونوں طرح کے کاموں میں عملی تحقیقات کی ضرورت ہے تاکہ مزید ترقی کے لئے جو واقفیت ضروری ہے اسے حاصل کیا جا سکے اس صنعت کی نگرانی، تحقیقات اور توسیع کے لئے باقاعدہ تنظیم کی ضرورت ہے جس کا انتظام ایک کل ہند مرکزی ماہی گیری کمیٹی کا تقرر کرکے جس کی سالانہ آمدنی یقینی ہو کیا جا سکتا ہے۔

پیداوار کے اضافہ کے لئے ضروری محرکات | لیکن اس مطلوبہ مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری محرک بھی مہیا کرنا لازمی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ کاشتکار کو اپنی حالت کی طرف سے مطمئن کرنے کی ضرورت ہے۔ برطانیہ عظمیٰ میں جنگ کے زمانے میں اس محرک کو فراہم کرنے کا ایک طریقہ اختیار کیا گیا کہ پیداوار کی کمترین قیمتوں اور یقینی منڈی کی جنگ کے زمانہ اور اس کے ایک سال بعد تک کے لئے کسان کے واسطے ضمانت کر دی گئی۔ ہندوستان میں ابھی حال میں اس قسم کی مشروعات گیہوں، جوار، باجرا اور روئی کی قیمتوں کے لئے کی گئی ہے۔ لیکن اگر کاشتکار سے اس اصلاح و ترقی پر روپیہ اور محنت صرف کرانا ہے جو پیدائش کے اضافہ کے لئے ضروری ہے اور اگر ہندوستان میں مستقبل میں افراط کی معیشت کو پیدا کرنا ہے تو پیداوار کی یقینی فروخت اور نفع بخش قیمتوں کے بارے میں لانبی مدت کے لئے ضمانت کرنا ہوگی، کم سے کم ان غذائی فصلوں کے لئے جو بہت لازمی ہیں اس ضمانت کے ساتھ ساتھ ملک کے مجموعی استحکام اور اطمینان کو قائم رکھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ حکومت کی طرف سے اناج کے ایسے ذخیرے رکھے جائیں جو قحط سالی کے زمانے میں کام آسکیں۔

ضروری اصلاحات | پیدائش کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لئے دوسرے اہم معاملات جن کی طرف توجہ ضروری ہے حسب ذیل ہیں:۔

کاشتکار کے لئے پٹہ کا کافی حد تک مضبوط اور محفوظ ہونا۔ پرانے زمینداروں کا مسئلہ اور رقبہ زیر جوت کا بہت زیادہ منقسم ہونا۔ اگر کسان کو بہترین معاوضہ دلانا اور خریدار کو بہترین پیداوار مہیا کرنا ہے تو کھیت کی پیداوار جن حالات میں موجودہ زمانے میں

فروخت ہوتی ہے وہ بھی اصلاح چاہتے ہیں۔ فروخت کا ایک معقول اور مرتب نظام اسی وقت بن سکے گا جب ایک مقررہ معیاری نوعیت کی چیز کے لئے ایک واجبی قیمت قائم کردی جائے گی۔ ان معیاروں کی نگرانی کرنے کے لئے منڈیوں کے لئے قواعد وضوابط بنانا ضروری ہیں۔ اور دکانداروں کو چاہے وہ تھوک ہوں یا خوردہ فروش یا گاؤں کے پھیری والے سب کے لئے لائسنس لینا ضروری کردیا جائے، اور گاؤں کے اندر فروخت کی تنظیم کو قائم کردیا جائے۔

یہ نصب العین جو مقرر کیا گیا ہے اسی وقت حاصل ہوسکے گا۔ جب تحقیقات علمی کے سلسلے کو مرکز میں اور صوبوں اور ریاستوں میں خوب ترقی دے دی جائے گی۔ اور ضروری عملہ کو اور ان سہولتوں کو فراہم کیا جائے گا جو تحقیقات کے نتائج کو کسان تک پہنچانے اور زراعت کے روزمرہ کے معمولات میں زیادہ سے زیادہ رائج کرنے کے لئے ناگزیر ہیں۔

منصوبے کی کامیابی کے امکانات اس کی اگر ترقی کے لئے جتنے روپے کی ضرورت ہے اسی اس کی تکمیل کی مدت اور اس پر خرچ کا تخمینہ کا انتظام کردیا جائے اور کسان کے اندر مسلسل کوشش کرنے کے محرکات پیدا کردئے جائیں اور اس خاکے میں جتنی چیزوں خدمتوں سہولتوں کو ضروری بتلایا گیا ہے ان سب کا بندوبست کردیا جائے تو زراعتی پیداوار میں سو فی صدی کا امکان ہے۔ پھر چونکہ ان سہولتوں کی فراہمی ان تعمیرات پر ہے جن میں سے بعض ابتدا کرنے اور پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کئی برس لگ جائیں گے اس لئے یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ پیداوار پندرہ سال سے پہلے دوگنی نہیں کی جاسکے گی گو جنگ کے ختم ہونے سے دس سال کے اندر اندر اس میں پچاس فی صدی کا اضافہ ہوجائے گا۔

موجودہ حالات میں اس منصوبہ کی لاگت کا تخمینہ زیادہ تر قیاسی ہوسکتا ہے

کیونکہ بہت سے عامل ابھی تک لامعلوم اور ناقابلِ شمار ہیں۔ لیکن غیر اعادی خرچ کے بارے میں برطانوی ہندوستان کے لئے غالباً یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ سرمایہ کی تعمیر پر دس ارب روپیہ صَرف کرنا ضروری ہوگا۔ اس کا اعادی خرچ ۲۵ کروڑ روپے سالانہ سمجھنا چاہیے۔ جس میں سے تین کروڑ مرکز کو کرنا ہوگا اور ۲۲ کروڑ صوبوں کو۔

حالاتِ حاضرہ

رفتارِ عالم

جنگ کے ساتھ محسوس ہونے والے انقلابوں کا دور ختم ہوگیا، لیکن یہ سمجھنا کہ جنگ کی سخت آزمائش کے بعد کچھ دنوں تک دنیا ایک حالت پر قائم رہے گی اپنے آپ کو دھوکے میں ڈالنا ہے۔ البتہ تصادم کے امکانات بہت کم ہوگئے ہیں۔ جاپان کے ہتھیار ڈالنے سے پہلے ہی متحدہ اقوام کا ایک دستور مرتب ہوگیا تھا، اور اسی کے ماتحت دنیا کی مختلف سیاسی حلقوں میں تقسیم ہوگئی تھی جس کی بدولت قوت میں توازن پیدا کرنے کی صورت نکالی جا سکتی ہے بغیر اس کے کہ بڑی ریاستوں کی کشمکش خطرناک ہو جائے۔ اس تقسیم کی پوری تفصیل ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اور شاید اسے وضاحت سے بیان کرنا مصلحت کے خلاف ہوگا۔ بحرالکاہل میں متحدہ ریاستوں کی اغراض کو ترجیح دی گئی ہے، اور چین کو بحرالکاہل کے حلقے میں شامل کرنا غلط نہ ہوگا۔ روس نے چین کی قومی حکومت سے دوستانہ معاہدہ کرلیا ہے، اور غالباً روس ہی کی کوشش سے قومی حکومت اور چینی کمیونسٹوں میں صلح رہی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ روس نے پورے طور پر اور صاف دلی سے متحدہ ریاستوں کا بحرالکاہل اور چین پر حق تسلیم کرلیا ہے مگر دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ جاپان کے ساتھ بے جا رعایت کی جا رہی ہے اور اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جاپان قوت کا توازن قائم رکھنے کا ایک ذریعہ بنایا جائے گا، اور قوت کا توازن روس کے سوا اور کوئی طاقت بگاڑ نہیں سکتی۔ جزائر مشرقی ہند کا مسئلہ ابھی بحث میں نہیں آیا۔ لیکن برہما اور ملایا کا معاملہ طے سمجھنا چاہیئے، اور ہند چینی پر فرانسیسی دوبارہ قبضہ کر رہے ہیں۔ اگرچہ وہاں کی آبادی ان کی حکومت نہیں چاہتی

اس میں بھی اب کوئی شک نہیں رہا ہو کہ ہانگ کانگ برطانیہ کو واپس ملے گا۔ گویا مشرقی ایشیا میں جنگ کا نتیجہ یہ نکلا ہو کہ ان قوتوں میں سے جو یہاں مقابلہ پر آگئی تھیں، جاپان ایک عرصے کے لئے خارج ہو گیا ہے، اور متحدہ ریاستوں کی حدود مشرقی ایشیا سے مل گئی ہیں۔ چین پہلے کی طرح بیرونی امداد کا محتاج ہے اور اس امداد پر صرف اس کی ترقی ہی نہیں بلکہ اتحاد اور امن و امان کا مدار ہے۔ آگے جو کچھ ہوگا اس میں مقابلہ کرنے والی قوتوں کی دولت اور صنعتی استعداد فیصلہ کن ثابت ہوگی۔

یورپ کے مسائل بہت زیادہ پیچیدہ ہیں۔ وہاں جرمنی نے جن اختلافات سے فائدہ اٹھایا تھا وہ بہت پرانے، شاید ازل سے مقدر ہیں، اور جرمنی کی شکست سے ان کی شدت میں کوئی فرق نہیں آیا ہو۔ روس نے انقلاب کے بعد توسیع کے منصوبے داخل دفتر کر دئے تھے اور اب جو یہ دفتر کھولا گیا ہے تو معلوم ہوا ہے کہ بہت سی کارروائیاں تکمیل کی منتظر ہیں۔ روسی سیاست کی وہی کیفیت ہو گئی ہو جو کسی دفتر کے نگران کی ہوتی ہے۔ جس کے سامنے پرانے کاغذات رکھ دئے جائیں اور وہ سوچنے لگے کہ آخر یہ چٹھے کیوں رہ گئے۔ روس نے اپنی حفاظت کا انتظام کر لیا ہے، نسلی اور فوجی نقطۂ نظر سے اپنی مغربی سرحد میں درستی ترمیم کر لی ہو، لندن میں وزیروں کی جو کانفرنس ہو رہی ہے اس میں روسی کوئی مطالبہ اس بنا پر پیش نہ کر رہے ہوں گے کہ وہ روس کی حفاظت کے لئے لازمی ہے۔ اب وہ اس بات کی کسر نکال رہے ہیں کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد انھیں کچھ نہیں ملا اور پھر قریب بیس برس تک وہ توسیع کے موقعوں سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ پہلی جنگ عظیم میں روس کامیاب ہوا ہوتا تو اسے یقیناً قسطنطنیہ، مشرقی تھریس، بحرۂ کیسپین کے کچھ جزیرے اور ایشیائے کوچک کا ساحلی علاقہ ملتا، اور ان مقبوضات کے ذریعے اُسے جو اقتدار حاصل ہوتا اسی کی مناسبت سے وہ مشرق وسطیٰ کی سیاست میں اپنے مفاد کی خاطر دخل دیتا۔ اسی بنا پر روس نے اس وقت ترکی سے مطالبہ کیا کہ اسے درِ دانیال میں برابر کا حق دار مانا جائے، اور اتحادیوں

سے مطالبہ کیا ہے کہ اسے بحر کیسپین کے چند جزیرے، جزائر ڈوریکانیز اور اٹلی کی افریقی نوآبادیوں کا ایک حصہ دیا جائے۔ ان مطالبوں سے ترک اور اتحادی دونوں پریشان ہیں، مگر وہ جانتے ہیں کہ روس لڑائی پر آمادہ نہیں ہے، اور ان کی پریشانی ویسی ہی ہے جیسے کسی مدعی کے دعوے دائر کر دینے سے مدعا علیہ کو ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ دعوے کو غلط کیسے ثابت کیا جائے۔ ترک درد انیال کے معاملے کو ان ریاستوں کے سامنے پیش کرنے کو تیار رہیں جنھوں نے مونٹرو کے معاہدے پر دستخط کئے تھے۔ غالباً ان کی بریت کے لئے یہ جواب کافی ہوگا۔ مگر اتحادی کیا کریں گے۔ اٹلی سے طرابلس، لبیا، ایرٹریا اور سومالی لینڈ چھینے گئے ہیں اب یہ کس کو دئے جائیں؟ ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ یہ متحدہ اقوام کی عملداری میں رہیں اور ایک کمیشن یہاں حکومت کرے۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ یہاں متحدہ اقوام میں سے کسی ایک کی حکومت ہو اور باقی اس کی نگرانی کریں۔ بہر حال فیصلہ متحدہ اقوام کی مجلس حفاظتی کمیٹی کے مستقل اراکین یعنی روس برطانیہ، فرانس، متحدہ ریاستوں اور چین کی سفارش کے مطابق کرے گی اور روسی چاہتے ہیں کہ یہ کمیٹی سفارش کرے کہ اٹلی کی افریقی مقبوضات میں سے کم از کم طرابلس اور ایریٹریا میں متحدہ اقوام کے زیر نگرانی روس کی عملداری ہو۔ انگریز اسے ایک بدیہی بات سمجھتے ہیں کہ دنیا کے اس حصے میں ان کا تسلط ہو، اور جس زمانے میں برطانیہ کا بیڑا سمندر پر راج کرتا تھا، انگریز اپنے حق کو سب سے تسلیم کرا سکتے تھے لیکن اب یہ سند پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے روس کا مطالبہ رد کرنے کے لئے دلیلیں چاہئیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ بحث کرتے وقت برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر بیون کو بار بار غصہ آ جاتا اور وہ میز پر مکے مارنے لگتے۔ مگر مسٹر بیون کی عقل عاجز ہے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ روس کا مطالبہ مان لیا جائے گا۔ اٹلی کی نوآبادیوں پر برطانیہ کا قبضہ ہے، اور اگر روس ــ یا متحدہ اقوام ــ برطانیہ کو بے دخل کرنا چاہتی ہیں تو انھیں جنگ کرنا ہوگی۔ وہ لڑنے پر تیار نہ ہوئیں تو برطانیہ کے قبضہ کو کوئی قانونی شکل دینا ہوگی۔ غالباً ایسا ہی کیا بھی جائے گا۔ لیکن آخری فیصلہ ہونے تک جو بحثیں ہوں گی ان سے روس کو

بھی بڑا فائدہ ہوگا۔ ایک تو یہ بات صاف ہو جائے گی کہ برطانیہ کی سیاست سراسر اغراض پر منحصر ہے اور ان اغراض کو کوئی فضیلت یا تقدس حاصل نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ برطانیہ وعدہ کرے گا کہ جب دردانیال کا معاملہ حفاظتی کمیٹی یا متحدہ اقوام کی مجلس یا متحدہ اقوام کی مجلس یا معاہدہ مونسترو پر دستخط کرنے والی ریاستوں کے سامنے پیش ہوگا۔ تو وہ روس کی تائید کرے گا، ترکی کا ساتھ نہ دے گا۔

جنوب مشرقی یورپ کے مسائل کو روس کی کج بحثیوں نے بہت پیچیدہ کر دیا ہے۔ تجربوں سے کبھی تو معلوم ہوتا ہے کہ روس بعض ریاستوں یا خاص سیاسی پارٹیوں کا حامی ہے، کبھی یقین ہو جاتا ہے کہ یہ پھر کسی کا آشنا نہیں۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ جنوب مشرقی یورپ کا ایک جھگڑا طے کیا جائے تو دو نئے پیدا ہو جاتے ہیں، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر روس وہاں کی تحریکوں اور پارٹیوں میں اپنے حامی تلاش کرنے اور انھیں تقویت پہنچانے کے بجائے سب کو شطرنج کے مہرے سمجھے اور جو چال مناسب معلوم ہو چلے۔ اتحادیوں کے لئے اس دوسرے طریقے کو اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ برطانیہ یونان کو اپنے اثر میں رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن جو پارٹیاں اس کے موافق ہیں وہ رجعت اور تشدد پسند ہیں۔ اور ان کی سرپرستی کرنے میں بدنامی کے بڑے خطرے ہیں۔ یونان کا مطالبہ ہے کہ جنوبی البانیہ اور جزائر ڈوڈیکانیز اسے دے دئے جائیں، اور اگر برطانیہ چاہتا ہے کہ یونان اسے اپنا محسن سمجھے، تو اسے یہ علاقے یونان کو دلوانے ہوں گے۔ رومانیہ کے تیل کے کنوؤں اور ریلوں میں برطانیہ کا بہت سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اور اسے کوئی تدبیر کرنا ہے کہ یہ سرمایہ محفوظ ہو جائے یا واپس مل جائے۔ بلغاریہ سے برطانیہ کا کوئی خاص تعلق نہیں مگر بلغاریہ کا مطالبہ ہے کہ اسے جنوبی تھریس میں سمندر تک راستہ دیا جائے، اور بلغاریہ سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اس راستے کی خاطر لڑنے مرنے پر تیار ہو جائیں۔ خصوصاً اگر انھیں خیال ہو کہ روس ان کی مخالفت نہ کرے گا۔ بلغاریہ کی طرح یوگوسلاویہ بھی مقدمے کا ایک فریق ہو۔

جن سے برطانیہ کو کوئی تعلق اور ہمدردی نہیں۔ مگر مقدمہ بہت پیچیدہ ہے۔ یوگو سلاویہ کا مطالبہ ہے کہ اسے ٹریسٹ اور فیومی کی بندرگاہیں دے دی جائیں، اس لئے ان شہروں اور ان کے نواح کی آبادی بیشتر سلاف ہے۔ مارشل تیتو ان دونوں شہروں پر زبردستی قبضہ کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ اور اب وزیروں کی کانفرنس کو طے کرنا ہے کہ ان دونوں شہروں کے متعلق کیا سفارش کی جائے۔ اگر روسی مارشل تیتو کے ہم نوا ہو جاتے تو فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا، برطانیہ کو رومانیہ میں رعایتیں حاصل ہو جائیں اور ٹریسٹ اور فیوم یوگو سلاویہ کو مل جاتے۔ مگر روسی سیاست جذبات سے بالکل خالی معلوم ہوتی ہے۔ وہ مارشل تیتو کے حق کو بھی مانتی ہے آسٹریا کی نئی حکومت کی بھی سرپرستی کر رہی ہے، اور اس دلیل کو بحث سے خارج نہیں کرنا چاہتی کہ ٹریسٹ ۱۹۲۰ء تک آسٹریا کے قبضے میں تھا اور اٹلی نے اتحادیوں کی مرضی کے خلاف اُسے زبردستی حاصل کر لیا۔ اب اگر اتحادیوں کو اختیار ہے کہ وہ اس شہر کو جسے چاہیں دے دیں تو آسٹریا کے حق کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ روسیوں کو جو کچھ لینا تھا وہ لے چکے ہیں، ان کے مفاد کے لئے جو کچھ ضروری تھا وہ انھوں نے بحث کئے بغیر حاصل کر لیا، اب وہ ایسی منطق چھانٹ رہے ہیں کہ جن سے ان کا مطلب واضح نہیں ہوتا اور دوسرے اپنی غرض کو بے حجاب کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۸۹۲

اکتوبر

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم - اے

سالانہ چندہ صر فی پرچہ ۸/	بابتہ ماہ اکتوبر ۴۵ء	جلد ۱۴ نمبر ۱

فہرست مضامین

اکتوبر ۱۹۴۵ء
۱۷۱/۱

انگریز اور اُن کی تہذیب

براعظم یورپ کے شمال مغرب میں برطانیہ کا جزیرہ واقع ہے جس کا شمالی حصہ اسکاٹستان اور جنوبی حصہ انگلستان اور ویلس پر مشتمل ہے۔ انگلستان کم وبیش ایک مثلث کی شکل رکھتا ہے جو اوپر سے پتلا اور نیچے سے چوڑا ہے۔ شمالی انگلستان، اسکاتستان کی طرح پہاڑی علاقہ ہے۔ جنوب میں زیادہ تر سرسبز میدان اور جابجا چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کے سلسلے ہیں۔ بے شمار ندیاں اور چشمے زمین پر خاموشی سے بہتے ہیں۔ آب و ہوا شمالی یورپ کے اور سب ملکوں کے مقابلے میں معتدل مگر بے حد تغیر پذیر ہے۔ یوں تو نہ بہت سخت سردی پڑتی ہے نہ تکلیف دہ گرمی، نہ بہت بارش ہوتی ہے نہ شدید طوفان آتے ہیں۔ لیکن موسم اس قدر تیزی سے رنگ بدلتا ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا دم بھر میں کیا ہونے والا ہے، صبح کہر چھایا تھا، ہوا بند تھی اور دم گھٹ رہا تھا۔ دن چڑھے زور سے ہوا چل رہی ہے۔ دوپہر کو آسمان صاف تھا اور دھوپ ناگوار حد تک تیز، سہ پہر کو بارش ہونے لگی اور سردی سے انگیٹھی جلانے کی ضرورت پڑ گئی۔ ایسے ملک کے باشندوں کو بہت چست اور چوکس ہونا چاہیے۔ ہر سمت کی ہوا کے ساتھ چلنے اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھنا چاہیے۔ چنانچہ واقعی یہ صفات اہل انگلستان میں ہمیشہ سے پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ ملک میں ہر طرح کے جانور چرند پرند نہایت کثرت سے ہیں اور کسی زمانے میں درندے بھی بہت تھے اس لئے شکار ابتدا سے انگریزوں کا خاص مشغلہ رہا ہے اور اس نے ان کی سیرت پر بہت اثر ڈالا ہے اس نے اُن کے اندر جفاکشی، حزم و احتیاط صبر اور وہ مخصوص خصلت پیدا کر دی ہے جو ان کی اصطلاح میں وہ Sportman's Spirit شکاری یا کھلاڑی کی آن کہلاتی ہے یعنی جب تک کامیابی کی خفیف سی امید باقی ہو حریف کو پچھاڑنے کی دل و جان سے کوشش کرنا

لیکن جب ناکامی کا یقین ہو جائے تو کھلم کھلا ہار مان لینا اور اُسے پُروقار سکون کے ساتھ برداشت کرنا، اس کے لئے جو ہمت، دلیری، اخلاقی جرأت اور ضبط درکار ہے وہ انگریز قوم میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ خصوصاً ضبط کے معاملے میں تو دنیا کی کوئی قوم انگریزوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی لیکن اس ضبط میں ان کی جسمانی اور اخلاقی مضبوطی کے علاوہ اُن کی ذہنی اور جذباتی سُستی کو بھی بہت دخل ہے اور شمالی قوموں کی طرح ان میں بھی تخیل کی کمی ہے اور اُن کے احساس کی سوتِ قلب کی گہرائی میں خاموشی اور آہستگی سے بہتی ہے۔ وہ ہر محرک کا اثر دیر میں قبول کرتے ہیں اور یہ اثر خواہ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو دیکھنے والے کو خفیف معلوم ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انھیں قدرتی طور پر اپنے جذبات پر قابو حاصل ہے اور ان کے لئے قول و فعل میں ضبط سے کام کام لینا آسان ہے۔ اس ضبط کا اظہار سب سے زیادہ طنز اور مزاح کے ذریعے سے ہوتا ہے جو انگریز قوم اور اس کے ادب کی سب سے نمایاں خصوصیات سمجھی جاتی ہیں انگریزوں کا طنز عموماً بات کو بڑھا کر یا گھٹا کر کہنے پر مشتمل ہوتا ہے۔ جہاں دوسرے اپنی تکلیفوں اور مصیبتوں پر جھنجھلاتے یا روتے ہیں وہاں انگریز عام طور پر اپنے غم و غصّے کو طنز کے پردے میں چھپا کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذمت کے موقع پر وہ مبالغہ آمیز تعریف سے اور تعریف کے موقع پر بہت ہی خفیف اظہار ناپسندیدگی سے کام لیتے ہیں خصوصاً اپنی صفات یا کارناموں کے بیان کرنے میں انگریز کا حجاب، تامل اور طنز آمیز انکسار مشہور ہے غرض ان کے طنز کا مقصد عموماً دوسروں پر حملہ کرنا نہیں بلکہ اپنے جذبات پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے اور اگر کبھی اسے آلۂ حرب کے طور پر استعمال بھی کرتے ہیں تو نفرت کے زہر میں بجھا کر نہیں بلکہ مزاح کے چھینٹوں سے ٹھنڈا کر کے۔ مزاح کا بھی سب سے اہم مصرف انگریزوں کے ہاں یہی ہے کہ جو چیز ناگوار ہے اس کے مضحک پہلو کو نمایاں کر کے تلخی اور مایوسی کے جذبات کو دھیما کیا جائے۔ دوسرا کام اس سے یہ لیا جاتا ہے کہ جو شخص فکر و عمل کے بندھے ٹکے سانچے کا اخلاقی و معاشرت کے رسمی معیار سے انحراف کرے، خواہ وہ مجنوں ہو یا حکیم۔ مجرم ہو

یا مصلح، اسے تضحیک کی زنجیر میں جکڑ کر پھر پرانی ڈگر پر لانے کی کوشش کی جائے
غرض انگریزوں کا ضبط اپنی بہترین شکل میں حکیمانہ اعتدال اور درویشانہ صبر اور بدترین
شکل میں دہقانی جمود اور بے حسی بن کر ظاہر ہوتا ہے۔
حقیقت میں دہقانیت کا رنگ جو عہد وسطیٰ میں سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا انگلستان
میں اور ملکوں کے بہت بعد تک چھایا رہا، اس لئے کہ یہ الگ تھلگ جزیرہ ہونے کی وجہ سے
براعظم کی تہذیبی تحریکوں کا اثر بہت دیر کے بعد اور بہت کم قبول کرتا تھا بلکہ اب بھی ایک حد تک
دہقانیت کی بنیادی صفات انگریزوں کی طبیعت میں موجود ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں روایت
پرستی ہے، ان کی ریاست کا کوئی دستور اساسی لکھا ہوا موجود نہیں ہے۔ بلکہ بعض روایات
کی شکل میں ہے۔ اور یوں بھی امور عامہ کی تنظیم کے لئے تحریری ضوابط بہت کم ہیں۔ زیادہ تر
رواج عام اور روایات قدیم کی پابندی کی جاتی ہے اور ان بن لکھے قوانین کا انگریز دل سے
احترام کرتے ہیں۔ دہقانوں کی طرح نہ مذہبی اصول، اخلاقی ضوابط، معاشری رواج،
اور خاندانی دستوروں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ سب کو یکساں اور واجب التعمیل سمجھتے ہیں۔ ان کی
کم آمیزی، دیر آشنائی، اجنبیوں سے وحشت ان کا یہ خیال کہ ان کی ریاست دنیا کی واحد ریاست
اور ان کی تہذیب دنیا کی واحد تہذیب ہے، اور ان کا تصور حیات وہ معیار ہے جس پر
ساری دنیا کو پرکھنا چاہیئے، سب چیزیں دہقانی تنگ نظری کا ثبوت دیتی ہیں۔
یہ اہل انگلستان کی سیرت کے بنیادی عناصر ہیں جو طبیعی ماحول کے اثرات اور نسلی خصوصیات
نے ان میں عہد وسطیٰ کے شروع ہونے سے پہلے ہی پیدا کر دئے تھے۔ اس وقت تک یہاں کی آبادی
قدیم آئبیرین کیلٹ اور مختلف شمالی نسلوں اینگل، سیکسن، جوٹ، ڈین وغیرہ کا معجون مرکب تھی
جن میں سے کوئی نسل بھی ابتدائی تہذیب کے درجے سے آگے بڑھی ہوئی نہ تھی۔ پہلی مہذب قوم
جس سے اہل انگلستان کو سابقہ پڑا، رومیوں کی قوم تھی جو ان کے ملک کو فتح کر کے ایک مدت
تک اس پر حکومت کرتی رہی، رومیوں کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ سارے ملک میں سڑکیں

تعمیر کرکے آمدورفت میں آسانی پیدا کی اور لوگوں کو امن کی زندگی کا عادی بنایا لیکن اہل انگلستان کی مجموعی سیرت اور تہذیب پر وہ کوئی نمایاں اثر نہیں ڈال سکے۔ البتہ نارمن قوم نے جو عہد وسطیٰ میں آکر انگلستان پر قابض ہوگئی، تین سو سال کے تسلط میں انگریزی زبان معاشرت اور مجموعی تہذیب کو بہت کچھ متاثر کیا۔ نارمن بھی شمالی نسل تھے۔ مگر ایک مدت سے ہجرت کرکے شمال مغربی فرانس کے صوبہ نارمنڈی میں آباد ہوگئے تھے اور یہاں عہد وسطیٰ کی یورپی تہذیب کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔ ان کی بدولت انگریزوں میں کچھ نرمی، لوچ اور شائستگی پیدا ہوئی۔ یہ اپنے ساتھ بانکپن کا نظام لے کر آئے اور اس نے انگلستان کی قدیم دہقانیت کے ساتھ مل کر "جنٹلمین" کا تصور پیدا کیا۔ جو اس وقت سے آج تک انگریزوں کا اخلاقی نصب العین ہے، بانکپن کے سپاہیانہ اخلاق کا اصل اصول یہ ہے کہ حریف غالب سے عزت کا، برابر والے سے انصاف کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ کمزور جب تک مقابلہ کرے اسے بیدردی سے کچلنا چاہیئے اور جب ہتھیار ڈال دے تو اس کے ساتھ حقارت آمیز رحم سے پیش آنا چاہیئے۔ عہد وسطیٰ میں یہ ضابطہ اخلاق یورپ کے اور ملکوں کی طرح انگلستان میں بھی طبقۂ امرا تک محدود تھا، وہ ایک دوسرے سے حالت امن اور حالت جنگ میں ہمیشہ شریفانہ اور منصفانہ برتاؤ کرتے تھے۔ لیکن نیچے طبقوں کو اسی برتاؤ کا مستحق نہیں جانتے تھے۔ بلکہ اُن کے مقابلے میں طاقت کو حق سمجھا جاتا تھا۔ عہد جدید میں رفتہ رفتہ قومی اتحاد کے احساس نے طبقہ واری احساس کو کسی قدر کمزور کردیا اور قوم کا ہر فرد قانونی اور اخلاقی حیثیت سے مساوی قرار دیا گیا جہاں تک بیرونی اقوام کا تعلق ہے۔ امریکی اور یورپی قومیں جس حد تک وہ انگریزوں سے مشابہت رکھتی ہیں شرافت و انصاف کے سلوک کی مستحق سمجھی جاتی ہیں۔ مگر ایشیا اور افریقہ کی قوموں کے لئے دوسرا معیار ہے کمزور قومیں نیم مہذب یا غیر مہذب کہلاتی ہیں۔ اور ان کے ساتھ سختی اور ذلت کا برتاؤ ہوتا ہے۔ لیکن جو قومیں تلوار کے زور سے اپنا مہذب ہونا منوالیں وہ عزت کی نظر سے

دیکھی جاتی ہیں۔

کلاسیکی علوم کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کی تہذیبی تحریکیں جنھوں نے براعظم یورپ میں زندگی کی نئی روح پھونک دی۔ انگلستان تک پہنچتے پہنچتے اس قدر ہلکی ہوگئیں کہ وہ انگریزوں کی سیرت میں کوئی خاص تغیر پیدا نہ کرسکیں۔ اس میں شک نہیں کہ ملکہ الزبتھ کے زمانے میں ادب اور آرٹ کی ایک بڑی تخلیقی لہر شکسپیر کو اپنے دوش پر لئے ہوئے اُٹھی۔ لیکن جو ذہنی بیداری نشاۃ ثانیہ نے پیدا کی وہ ایک چھوٹے سے حلقے تک محدود رہی۔ پوری انگریزی قوم پر اس تحریک کا اثر ذہنی زندگی میں نہیں بلکہ عملی زندگی میں نظر آتا ہے اس نے انھیں جہازرانی اور بحری قزاقی کے بڑے بڑے کارناموں پر ابھارا۔ اور اپنی قومی آزادی کے برقرار رکھنے کے لئے اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور حریفوں سے ٹکر لینے کا حوصلہ دلایا۔ ان میں الزبتھ اڈریک ریلے جیسی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ جنھوں نے اسپین کی زبردست سلطنت کے دانت کھٹے کردئے اور ہنری ہشتم جیسا دبنگ بادشاہ جس نے یورپ کی دینی قیادت کی زنجیروں کو توڑ کر پھینک دیا اور انگلستان کا جداگانہ قومی کلیسا قائم کرلیا۔

تجدید تہذیب کی تحریک جرمنی سے اٹھی تھی۔ انگریزوں کے ذہن پر نشاۃ ثانیہ سے کہیں زیادہ اثر انداز ہوئی لیکن یہ اثر انگلستان کے سرکاری کلیسا کے ذریعے نہیں پڑا بلکہ آزاد فرقوں کے ذریعے جو لوتھر کے پروٹسٹنٹ مذہب کے مقابلے میں کیلون کے مذہب سے زیادہ قریب تھے۔ انگلستان کے سرکاری کلیسا نے حقیقت میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مذہب کے بین بین راستہ اختیار کیا یعنی انجیلی عقائد تو لوتھر سے لئے اور کلیسا کی تنظیم بالکل رومی کلیسا کے طرز پر رکھی۔ مگر یہ دونوں چیزیں عام انگریزوں کی طبیعت سے زیادہ مناسبت نہیں رکھتی تھیں۔ وہ سرکاری کلیسا کی پیروی محض ایک قانونی فرض سمجھ کر کرتے تھے اس سے وہ قلبی تعلق نہیں رکھتے تھے جو مذہبیت کی جان ہے۔ ان میں مذہبی روح کو بیدار کرنے والی حقیقت میں پیوریٹن تحریک تھی جو مختلف آزاد قوموں کے ذریعے ملک میں پھیلی اور عام انگریزوں

کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ یہ مذہبی تحریک کیلون کی تعلیم پر مبنی تھی اور ایک اکھڑ جفاکش اور جنگجو قوم کے لئے غیر معمولی کشش رکھتی تھی پیورٹین مذہب کے نقطۂ نظر سے اخلاقی زندگی حق و باطل مسیح اور شیطان کی کش مکش کا نام ہے۔ خدائے تعالےٰ اپنے خاص بندوں کو اس کام پر مامور کرتا ہے کہ شیطانی قوتوں کو شکست دے کر حق کی حکومت دنیا میں قائم کریں اس جدوجہد میں کامیاب ہونے کا انعام دولت اور حکومت ہے جو فضل الٰہی سے برگزیدہ قوموں کو عطا ہوتی ہے۔ پیورٹین عقیدے نے جہاں انگریزوں کی سخت کوشی، جفاکشی، ضبط نفس اور خشک مزاجی کو اور پختہ کر دیا وہاں ان کے کسب زر کے شوق ملک گیری کی ہوس کو بھی مذہبی تقدس کا جامہ پہنا دیا، ان کو یقین ہو گیا کہ ان کی قوم خدا کے برگزیدہ بندوں کی جماعت ہے جو دنیا پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے اور سیاست اور تجارت میں ان کی کامیابی خدا کی خوشنودی کی نشانی ہے۔

عقلی فلسفے کی لہر جو اٹھارھویں صدی میں جرمنی اور فرانس کو بہالے گئی تھی۔ انگلستان کے ساحل سے ٹکرا کر لوٹ گئی۔ عقلیت نے انگریزوں کو صرف اتنا متاثر کیا کہ ان کی تمدنی زندگی کے اصول جو پہلے مبہم تھے اب واضح ہو گئے اور ان سے ایک کم و بیش مربوط فلسفۂ حیات بن گیا۔ اس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس فلسفۂ زندگی کے تین اہم اجزاء تھے۔ تجربیت کا علمیاتی تصور، افادیت کا اخلاقی تصور اور انفرادی آزادی کا سیاسی تصور جس نے پیورٹین مذہب کے سائے میں مذہبی عقیدے کی شکل اختیار کر لی اور جس کی تبلیغ تشدد اور جوش و خروش کے ساتھ ساری دنیا میں کی جانے لگی۔

انیسویں صدی میں انگریزی تہذیب کے ان بنیادی تصورات میں اور زیادہ وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی۔ خصوصاً سیاسی آزادی کے تصور کا دائرہ اتنا پھیلا کہ ساری قوم کو محیط ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ عملاً ہر طبقے کے لوگوں کو مساوی سیاسی حقوق حاصل ہو گئے

اور معاشی آزادی نے نظام سرمایہ داری کی صورت اختیار کرلی جو انفرادیت کی آخری حد ہے۔ یہ نظام یوں تو صنعتی انقلاب کے بعد یورپ کے سبھی ملکوں میں پہلے سے زیادہ تیز رفتار سے پھیلنے لگا۔ لیکن جتنی کامیابی اُسے انگلستان میں حاصل ہوئی اور کہیں نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ یہ ہر لحاظ سے انگریزوں کے قومی مزاج کے موافق تھا۔ یہ نظام اُن کی قوت ارادی اور قوت عمل کو جولانی دکھانے کا اور اُن کے حب مال اور حب جاہ کو تسکین پانے کا موقع دیتا تھا۔ ملکیت ذاتی کے احترام اور حکومت وقت کے استحکام کی ضمانت کرتا تھا۔ مادیت کی قبیح شکل کو ظاہری مذہبیت کے خوش نما پردے میں چھپاتا تھا تجربیت کو اپنا فلسفیانہ طریق اور افادیت کو اپنا اخلاقی نصب العین مانتا تھا، اور اخبارات کے ذریعے عوام کے جذبۂ آزادی کو مجروح کئے بغیر ان کو حکمران طبقے کے اشاروں پر چلاتا تھا مختصر یہ کہ نظام سرمایہ داری انگریز قوم کی فطرت کے ہر تقاضے کو پورا کرتا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اس صدی میں انگلستان کے سیاسی نظام میں زبردست تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ طبقۂ امرا کی بلا شرکت غیرے حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ نہ صرف متوسط طبقے بلکہ نچلے طبقے نے بھی سیاسی حقوق میں برابر کا حصہ حاصل کرلیا۔ تہذیبی اور مادی دولت در اصل طبقۂ اشراف ہی کے ہاتھ میں رہی مگر اس میں سے بھی عوام کو اتنا تو دینا ہی پڑا کہ وہ جانوروں سے کچھ بہتر زندگی بسر کرسکیں اس کے لئے ضروری تھا کہ ریاست کے اختیارات میں اضافہ ہو اور انفرادی آزادی پر پابندیاں عائد کی جائیں۔ چنانچہ ریاست نے مزدوروں کی اجرت، اراضی کے استعمال مکانوں کی تعمیر کے قواعد وضوابط بنائے۔ نئے نئے محصول عائد کئے، مفت اور جبری تعلیم نافذ کی۔ غرض فرد کی زندگی کے مختلف شعبوں میں مداخلت شروع کردی۔ لیکن یہ تبدیلیاں آہستہ آہستہ نہایت احتیاط سے کی گئیں تاکہ ماضی سے رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔ انفرادیت کا نصب العین ترک نہیں کیا گیا۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو

قومی ریاست اور اس کے برتر حقوق کا تصور بھی پیدا ہو گیا اور دونوں میں مصالحت کی کوشش کی جانے لگی۔

یہ خارجی تبدیلیاں اس تغیر کا مظہر تھیں جو انگریزوں کے نفس کی گہرائیوں میں واقع ہو رہا تھا۔ پیوریٹن عقیدے کا تشدد اب اپنا رُخ بدل رہا تھا اور اپنے نقطۂ نظر اور دائرہ عمل کو وسیع کر رہا تھا۔ اس کا اظہار اب مذہبی زہد خشک کی شکل میں نہیں بلکہ سیاسی قومی جوش کی شکل میں ہو رہا تھا۔ اس کا مطمح نظر اب محض دیندار تاجر کی فلاح و بہبود نہیں تھا بلکہ برطانوی قوم کو آزاد و مہذب اور خوش حال بنانا، اس کی سیادت روئے زمین پر قائم کرنا۔ اس کی تہذیب کو اور اس کے مخصوص جمہوری اداروں کو دنیا میں پھیلانا۔ اس تحریک نے جو انگلستان کے اندر جمہوری قومیت اور باہر برطانوی سامراج کے روپ میں ظاہر ہوئی۔ درحقیقت اب انگریزوں کے مذہب کی حیثیت اختیار کر لی۔ عیسوی مذہب کو انھوں نے ترک نہیں کیا۔ مگر اس سے ان کو قلبی تعلق نہیں رہا۔ اذعانی عقیدے کو ماننے والے بہت کم اور اس کے عبادات و رسوم کو ادا کرنے والے اس سے بھی کم رہ گئے۔ یورپ کے اور ملکوں کی طرح انگلستان میں بھی اجتماعی زندگی کا مرکز مذہب نہیں بلکہ ریاست بن گئی۔ لیکن یہ جرمن ریاست کی طرح مطلق اور مستبد نہ تھی بلکہ مشروط اور جمہوری۔

مندرجہ بالا سطور کے مطالعہ سے واضح ہو گیا ہوگا کہ انگریزوں کی قوم بنیادی طور پر ایک عملی قوم ہے جس کی فطرت اور تقدیر کا اظہار برطانوی قومیت کی تشکیل اور برطانوی سلطنت کی تعمیر کے ذریعے سے ہوا۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ذہنی زندگی کی صلاحیتوں سے محروم رہے اور اس سے اس میدان میں کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ مجموعی حیثیت سے حکمت و فلسفہ اور فنون لطیفہ میں انگریزوں کا حصہ، اطالیوں، فرانسیسیوں اور جرمنوں کے برابر نہیں لیکن انفرادی حیثیت سے دیکھئے تو ان میں ایسے ایسے فلسفی اور فن کار پیدا ہوئے ہیں جن کو یورپ کی تاریخ میں نمایاں جگہ حاصل ہے۔ ان کے ادیبوں اور شاعروں کے بہترین کارنامے

نہ صرف یورپی تہذیب بلکہ تہذیب انسانی کے لئے مایۂ ناز سمجھے جاتے ہیں۔

انگریزوں کے ذہن کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کو نظری تصورات کے تابع رکھنے کے بجائے فکر و نظر کو عملی زندگی کی مصلحتوں کے تابع رکھتا ہے۔ اس حقیقت میں اس کے نزدیک علم کوئی مستقل قدر نہیں رکھتا بلکہ محض ایک ذریعہ ہے، دوسری اقدار مثلاً راحت یا قوت کے حاصل کرنے کا۔ اس لئے انگلستان میں علم و حکمت نے اپنا مطمح نظر تلاش حق کو نہیں بلکہ صلاح کار کو بنایا یعنی اس نے حیات و کائنات کی حقیقت کی جستجو کو مدنظر نہیں رکھا بلکہ صرف ان مسائل کے حل کرنے پر قناعت کی جو دنیائے عمل سے واسطہ رکھتے ہیں چنانچہ انگریزی فلسفے میں دراصل مابعد الطبیعیات کا وجود ہی نہیں، البتہ منطق، نظریہ علم فلسفۂ اخلاق اور فلسفۂ سیاست کو اس سرزمین میں بہت فروغ حاصل ہوا۔

مابعد الطبیعی فکر کے فقدان کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمیں ہابز اور اسپنسر کے سوا کسی انگریز فلسفی کے خیالات میں وہ اندرونی وحدت اور ربط نظر نہیں آتا جو فلسفے کے ایک اہم آہنگ نظام کی تعمیر کے لئے ضروری ہے۔ اگر انگلستان کی پوری ذہنی تاریخ کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انگریز فلسفیوں کی فکر و نظر کے چشمے مل کر دو الگ الگ دھاروں میں بہتے ہیں جن سے قومی طبیعت کے دو متضاد پہلوؤں کا اظہار ہوتا ہے۔ ان میں سے بڑا دھارا جو تجربیت اور افادیت کے فلسفے کا ہے جس کا سرچشمہ انگریزوں کی واقعیت پسندی اور ذوق عمل ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ تصوریت اور عقلیت کا ایک چھوٹا سا دھارا بھی ہے اور یہ انگریزی سیرت کے اس لاعقلی عنصر سے نکلا ہے جو ایک طرف مذہبی باطنیت اور دوسری طرف سیاسی قوت پسندی کا رنگ اختیار کرتا ہے۔

پہلے طرز خیال کا نقطۂ آغاز تجربہ ہے جسے علم انسانی کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ تجربہ یعنی وہ تصور جو کسی خارجی مہیج کی تحریک سے نفس میں پیدا ہوتا ہے علم کی اکائی ہے۔ یہ تصورات عمل اشتلاف کے یا کسی اور میکانکی عمل کے ذریعے جس میں ہمارے ذہن کو کوئی دخل

نہیں ایک دوسرے سے مل کر مرکب تصدیقات کی شکل اختیار کرتے ہیں جو علم کہلاتی ہیں جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اس تجربی نظریہ علم نے صرف مظاہر اور ان کے باہمی علاقوں کے معلوم کرنے کی کوشش کی اور علوم طبیعی کے میدان میں اسے بڑی بڑی کامیابیاں ہوئیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے۔ البتہ کائنات کی حقیقت دریافت کرنے یا حوادث طبیعی کی توجیہہ کا کام اس نظریے سے نہ لیا گیا اور نہ لیا جا سکتا تھا۔ صرف ایک مفکر ہابز نے تجربیت کے دائرے سے آگے بڑھ کر مابعد الطبیعات کے مادی اور مکانکی نظریے کی تائید کی اور اس پر اپنے نظام فلسفہ کی بنیاد رکھی۔ نیوٹن بھی مکانکی تصور کائنات رکھتا تھا مگر اس نے اپنی فکر کی جولانگاہ عام فلسفہ کو نہیں بلکہ صرف ریاضیات کو بنایا۔ اور سب جید انگریز مفکر لاک ہیوم، جان اسٹوارٹ مل اور اسپنسر تجربیت کی قدرتی حدود کے اندر رہے۔ اور انھوں نے مابعد الطبیعات کے میدان میں قدم نہیں رکھا۔

تجربیت کی بنیاد پر جو اخلاقی نظریات جو انگریز فلسفیوں نے قائم کئے ہیں ان سب میں یہ بات مشترک ہے کہ راحت کو اعلیٰ اخلاقی قدر قرار دیا گیا۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ قدر اعلیٰ فرد کی راحت ہے یا جماعت کی افادیت کے حامی مثلاً ہابز بنتھم جیمس مل وغیرہ، فرد کی راحت کو اور افادیت کے علم سے مراد زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ فلاح کو عمل اخلاق کا معیار قرار دیتے ہیں۔

تجربی طرز خیال کی بنیاد پر فلسفۂ سیاست کے متعدد نظریے تعمیر ہوئے۔ ایک طرف ہابز نے روسو کے معاہدہ اجتماعی کی یہ تعبیر کی کہ سیاسی معاشرے یا ریاست کے وجود میں آنے سے پہلے انسان جو فطری زندگی بسر کرتا تھا وہ سراسر جنگ وجدل پر مشتمل تھی اس سے نجات پانے کے لئے لوگوں نے ریاست قائم اور ایک شخص کو فرمانروا مقرر کیا۔ ان کی سلامتی اس پر منحصر تھی کہ فرمانروا کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہوں اور لوگ اس کی زیادہ سے زیادہ اطاعت کریں۔ چنانچہ اپنی جان کی حفاظت کی شرط

پر انھوں نے ملکیت اور آزادی کے حقوق فرماں روا کی نذر کر دئے، اور اسے اُن پر غیر محدود اختیار حاصل ہوگیا۔ دوسری طرف لاک نے فطری زندگی کے ایک مختلف تصور کی بنا پر معاہدۂ عمرانی کو بالکل دوسرے رنگ میں پیش کیا۔ اس کے نزدیک فطری زندگی آزادی اور امن کی زندگی تھی۔ قانونِ فطرت کے مطابق ہر انسان دوسرے سے وہی سلوک کرتا تھا جس کی وہ خود ان سے توقع رکھتا تھا۔ اسی قانون کو باضابطہ اور منظم شکل دینے کے لئے ریاست قائم کی گئی۔ جمہوریت جس کے اندر فرد کے فطری حقوق پوری طرح محفوظ رہتے ہیں، ریاست کی فطری شکل ہے

ہابز اور لاک دونوں کے سیاسی تصورات فرانسیسی فلسفی روسو کی تقلید ہیں انفرادیت پر مبنی تھے۔ سب سے پہلے ہیوم نے جو اجتماعی افادیت کے اخلاقی نظریے کا بانی تھا۔ اس نظریے کو سیاسیات پر عاید کیا اور فطری حقوق اور معاہدہ اجتماعی کے تصورات کو رد کرکے انفرادیت کا خاتمہ کر دیا۔ ہیوم کے نزدیک اخلاقی نصب العین یہ ہے کہ فرد کی اغراض اور مفاد عامہ میں مصالحت پیدا کی جائے۔ اور اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے حکومت قائم کی جاتی ہے بینتھم نے افادیت کے اخلاقی اور سیاسی نظریے کی تکمیل کرکے اسے انگلستان کے قومی فلسفہ کے درجے پر پہنچا دیا۔ اسی کے خیالات سے متاثر ہوکر رکارڈو نے معاشیات کو جیمس مل نے انگلستان کے دستور کو اور آسٹن نے قانون کو افادیت کے رنگ میں رنگنے کی کوششیں کیں۔ جان اسٹوارٹ مل نے جو انفرادی آزادی کا پرجوش حامی تھا۔ افادی نظریہ ریاست کی کھلم کھلا مخالفت تو نہ کی لیکن ریاست کے دائرۂ عمل کو محدود کرنے اور فرد کے دائرہ حقوق کو وسیع کرنے پر اتنا زور دیا کہ حقیقت میں اجتماعی افادیت کا محض نام ہی نام رہ گیا۔ ہربرٹ اسپنسر نے سیاسیات کی بنیاد حیاتیات پر رکھنے کی کوشش کی اور ریاست کو ایک جسم نامی فرض کرکے یہ ثابت کرنا چاہا کہ جس طرح جسم نامی کے مختلف اعضا کے وظائف کو حیاتی ارتقا نے رفتہ رفتہ معین کر دیا ہے اور ہر ایک کو ایک مستقل حیثیت دے دی ہے اسی طرح سیاسی

ارتقار کے ذریعے ریاست کے اعضار یعنی افراد کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ یہاں تک کہ ریاست کو ان کی زندگی میں کوئی دخل نہ رہے۔ آگے چل کر اسپنسر کو خود محسوس ہوا کہ نہ تو ریاست کو جسم نامی پر قیاس کرنا صحیح ہے اور نہ اس سے وہ نتیجہ نکلتا ہے جو وہ نکالنا چاہتا ہے۔ اس لئے مجبور ہو کر اُسے انفرادیت کی حمایت کے لئے حقوق فطری کے فرسودہ نظریے سے کام لینا پڑا۔ مل اور اسپنسر کے انفرادی نظریوں پر عینیت پسندوں کے علاوہ تجربی مفکروں نے بھی بہت کچھ تنقید کی، غرض انفرادیت اور اجتماعیت کا تضاد انگریزوں کی واقعی زندگی کی طرح ان کی اخلاقی اور سیاسی فکر پر برابر باقی رہا۔

اس تجربی طرز خیال کے مقابلے میں ایک تصوری اور عینی طرز خیال بھی انگلستان میں ابتدا سے اب تک اپنے آپ کو علمی فکر کے مختلف شعبوں میں ظاہر کرتا رہا ہے۔ نظریہ علم کے میدان میں اس کے علم بردار تجربیت کے مقابلے میں وجدانیت کو پیش کرتے ہیں۔ جس کی رو سے علم انسانی کا سرچشمہ "خلقی تصورات" میں جو ہر انسان کو قدرت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ تجربی مفکروں کے مقابلے میں عینیت پسند مابعد الطبیعی مسائل سے کہیں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت کم لوگوں نے اپنے خیالات کو فلسفیانہ نظم و ترتیب کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔ مثال کے طور پر برکلے کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس نے روحانیت یا عینیت کا ایک باضابطہ نظریہ پیش کیا۔ لیکن نظری فلسفے سے زیادہ اہم اور قابل قدر ان حضرات کے اخلاقی تصورات ہیں۔ جن کا انگریزوں کے اونچے طبقوں پر بہت گہرا اثر پڑا۔ یوں تو ان کے اخلاقی نظریے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں لیکن سب میں یہ بات مشترک ہے کہ وہ محض راحت یا افادے کو قدر اعلیٰ تسلیم نہیں کرتے، بلکہ کسی غیر ملموس ابدی قدر کو عمل اخلاقی کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ مثلاً گڈ ورتھ اشیار کے معنوی تصور کو کلارک کائنات کی منطقی ترتیب کو اور شیفٹسبری اس کی جمالی ہم آہنگی کو اخلاقی معیار سمجھتا ہے جس پر انسان کے عمل کو پرکھنا چاہیے۔

سیاسیات میں بھی عینی طریقۂ فکر کو خاصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ سب سے پہلے مشہور مدبر اور خطیب ایڈمنڈ برک کے خیالات میں عینیت کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ اس نے ریاست کا کوئی واضح علمی تصور پیش نہیں کیا ہے۔ البتہ خطیبانہ انداز میں اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ ایک مقدس فوق الافراد ادارہ ہے۔ اس کی ابتدا چاہے جس طرح ہوئی ہو، اب یہ جماعت کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی کے لئے ناگزیر بن گیا ہے اور افراد کی خواہش اور ارادے کا پابند نہیں رہا۔ در اصل عینیت کی تحریک انگلستان کی سیاسی فکر میں کانٹ اور ہیگل کے اثر سے شروع ہوئی۔ اس لئے اس کے سب سے ممتاز نمایندے گرین، بریڈلے اور بوزین کوئٹ تھے۔ ان کا انگلستان میں عام طور پر تو زیادہ چرچا نہیں ہوا، لیکن یہ آکسفورڈ میں بہت اثر رکھتے تھے اور اس طرح وہ طبقہ جس نے انگلستان کے مدبر اور اور قومی رہبر پیدا کئے ہیں۔ اُن کے خیالات سے متاثر ہوا اور اس نے علمی سیاسیات میں ان کے خیالات کے مطابق اصلاحیں کیں۔ انیسویں صدی میں انگلستان کے سیاسی نظام میں وہ زبردست تبدیلی جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں حقیقت میں انھی مفکروں کی تعلیم کی بدولت پیدا ہوئی۔ اسی نے پیورٹین عقیدے کا رُخ قومیت اور قومی ریاست کی طرف پھیر دیا۔ اسی کی بدولت ریاست غیر محسوس طور پر جمہور کی عقیدت اور احترام کا مرکز بن گئی اور اس کے اختیارات میں روز بروز توسیع ہونے لگی۔ بریڈلے اور بوزین کوئٹ نے زیادہ تر ہیگل کے سیاسی فلسفے تعبیر و تفسیر پر اکتفا کی۔ انھوں نے ہیگل کی طرح ریاست کو ہمہ گیر ذہن اور اختیار مطلق کا کامل اور افراد کی غیر مشروط اطاعت کا مستحق قرار دیا۔ برخلاف اس کے گرین نے ہیگل اور کانٹ دونوں کے خیالات کو سمونے کی کوشش کی اور ریاست کے عینی نظریے میں انفرادیت کے تصور کو معقول جگہ دے کر اسے انگریزی ذہن کے لئے قابل قبول بنا دیا۔ وہ ریاست اور معاشرے کی اہمیت اور عظمت کا قائل ہے لیکن اس کا مقصد اور اس کی کامیابی کا معیار یہ قرار دیتا ہے کہ اس کے اندر فرد کی شخصیت

کو پوری طرح نشو ونما کا موقع ملے۔ ریاست کے فرائض کے بارے میں بھی وہ اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ "ریاست کے ذریعے سیاسی نظام، قانون اور معاشرت کی ایک مخصوص شکل میں مجسم ہو جاتا ہے، اور ریاست ہی تعلیم اور معاشرتی اداروں کے توسط سے افراد میں اس قدر انضباط پیدا کر سکتی ہے کہ وہ اپنے معیار اخلاق کے مطابق عمل کرنے کے لائق ہو جائیں۔ لیکن اسی کے ساتھ گرین یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ریاست کا فرض صرف رکاوٹیں دور کرنا ہے۔ انسان کی اخلاقی ترقی اس کے اپنے ارادے سے ہوتی ہے۔ ریاست کا اس سے زیادہ حوصلہ کرنا ہر طرح سے مضر ثابت ہوگا۔"

اجتماعیت اور عینیت کا یہ معتدل تصور اس لبرل سیاسی تصور کا زبردست حریف ثابت ہوا ہے جو مل اور اسپنسر کی انفرادیت اور بنتھم کی افادیت پر مبنی تھا، اور اشتراکی خیالات کی نشو ونما سے اجتماعی رجحان کو اور تقویت پہنچی۔

لیکن انگریزوں کی منطقی فکر سے کہیں زیادہ اہم ان کی جذباتی اور تخئیلی فکر ہے۔ جو شاندار انگریزی ادب اور شاعری کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ یوں تو فنون لطیفہ میں بھی انگلستان بڑے بڑے نام پیدا کر سکتا ہے، مثلاً تعمیر میں رین، موسیقی میں پرسل، مصوری میں کانسٹیبل، ٹرنر، رینالڈس اور ہوگارتھ لیکن چند افراد کے کارنامے اس خیال کی تردید کے لئے کافی نہیں ہیں کہ انگریزی قوم کا ذہن فنون لطیفہ سے محض سطحی علاقہ رکھتا ہے۔ اور ان کی اتھاہ گہرائیوں میں اترنے سے گھبراتا ہے۔ دراصل ان کے تخیل شدید، سست رو مگر پائدار مبہم اور حجاب آگیں احساس کے اظہار کے لئے سب سے زیادہ موزوں شعر و ادب کا میدان تھا اور اسی میں انھوں نے بحیثیت قوم کے اپنے جوہر دکھائے۔ شکسپیر جن کا ذکر ہم عہد جدید کے ہراول کی حیثیت سے کر چکے ہیں۔ ڈراما میں دنیا سے اپنی عظمت تسلیم کرا چکا ہے۔ طنزیہ شاعری میں پوپ اور بائرن اپنے اپنے طرز میں بے نظیر ہیں، قصصی شاعری یا ایپک میں ملٹن کی فردوس گمشدہ، ہومر، ورجل، فردوسی

اور ڈانٹے کے شاہکاروں کے برابر جگہ پانے کی مستحق ہے۔ غنائی شاعری میں شیکسپیر، ملٹن بلیک، ورڈسورتھ، شیلے، کیٹس، ٹینی سن، اور سوئنبرن سے لے کر بعد کے شعراء تک آسمان شعر کے ستاروں کا ایک درخشاں سلسلہ ہے جس کا جواب شاید ایران کے سوا دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ملے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن جذبات کو انگریزوں کی زندگی میں اظہار کی راہ نہیں ملتی وہ ان کے شاعروں کے صدف دل میں پرورش پاتے رہتے ہیں اور ایک مدت کے بعد گوہر شاہوار بن کر نکلتے ہیں۔

ناول کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ انگریزی ذہن کی تخلیق ہے اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ اٹھارھویں صدی سے انیسویں صدی کے آخر تک یعنی روسی ناول کے اوج کمال پر پہنچنے سے پہلے انگریزی ناولوں کا سکہ سارے یورپ اور امریکا میں چلتا رہا۔ سچ پوچھئے تو انگریزی ناول جسے فیلڈنگ اسمالٹ، رچارڈس اور اسٹرن نے شروع کیا اور جین آسٹن، برانٹے، جارج ایلیٹ، تھیکرے، ٹرولوپ، میریڈتھ اور ہارڈی نے پروان چڑھایا۔ مشاہدۂ حیات کا ایک مخصوص طریقہ ہے جو انگریزوں کے حصے کی چیز ہے۔ زندگی کے مادی اور روحانی پہلو سے یکساں محبت جو ایک صحت مند قوم کی علامت ہے۔ اس کے گوناگوں حادثات اور تغیرات سے گہری دلچسپی، ایک خاص قسم کا مزاج جو ہمدردی اور دلسوزی، طنز اور تمسخر کا مجموعہ ہے اور وہ احساس تناسب جو جذبات پرستی اور مبالغہ سے بچاتا ہے۔ ان سب چیزوں نے مل کر اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے انگریز ناول نگاروں کی تصانیف میں کچھ ایسی دل کشی پیدا کر دی ہے جو کہیں اور نہیں پائی جاتی۔ اس کا مکمل نمونہ چارلس ڈکنس کے بہترین ناولوں میں نظر آتا ہے۔ شکسپیر کے بہترین ڈراموں کی جو فانی انسانوں کی زندگی میں ابدی زندگی کی جھلک دکھاتے ہیں، مضمون نگاری میں بھی ان اصناف ادب میں سے ہے جن میں انگریزوں نے خاص امتیاز حاصل کیا۔ سرٹامس براؤن اور چارلس لیمب جیسے استادان فن کے علاوہ جیمی بسٹلر

اڈیسن، ڈاکٹر جانسن، ہیزلٹ، کارلائل، رسکن میتھو آرنلڈ، پامدارشہرت کے مالک ہیں مجموعی طور پر یہ لوگ فرانسیسیوں کی سی وضاحت، سلاست اور روانی تو پیدا نہ کرسکے، لیکن دقت نظر، تازگیٔ خیال، جدت ادا، اور خصوصاً زور بیان میں جس کے اندر جوش اور ضبط سمویا ہوا ہے، ان سے بازی لے گئے۔

انگریزی تہذیب کی اس دھندلی اور نامکمل تصویر میں آپ کو اس قوم کی سیرت اور ذہن کی ایک جھلک نظر آگئی ہو گی جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں کل ہندوستان کی قسمت کی مالک بن گئی اور جس نے تقریباً ایک صدی کے عرصے میں ہندوستان کی تہذیبی زندگی پر نہایت زبردست اثر ڈالا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جو نئی لہریں انگریزوں کی ذہنی زندگی میں اٹھیں اور وہاں سے ہندوستان پہنچیں اُن کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

برطانیہ کی مزدور پارٹی

۲- ٹریڈ یونین کی تحریک

(بسلسلہ سابق)

ٹریڈ یونین کی ابتدا انگلستان میں ٹریڈ یونین کی ابتدار تو اٹھارھویں صدی کے شروع ہی میں ہوگئی تھی۔ جب صنعت نے واضح طور پر سرمایہ دارانہ رنگ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے پہلے مزدوروں کی ان انجمنوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ استادکاری کی پنچایتی پابندیوں کے ماتحت روائتی طریقے پر کام کرتے تھے۔ وہ پوری طرح خود مختار تھے۔ کام کی جگہ، کام کے اوقات، اوزار، کچے مال، مصنوعہ مال اور اس کی فروخت پر انھیں اختیار حاصل تھا۔ استاد کاریگروں اور ان کے مددگاروں اور شاگردوں میں وہ بُعد اور بیگانگی پیدا نہیں ہوئی تھی جو سرمایہ داری کی ترقی کے بعد رونما ہوئی۔ اس کے علاوہ مزدوروں کی اجرتوں اور ان کے کام کے حالات کو منصفانہ بنیاد پر قائم کرنا حکومت اپنے فرائض میں داخل سمجھتی تھی، اور آنریری مجسٹریٹ اس کام کو انجام دیا کرتے تھے۔ لیکن اٹھارھویں صدی کی ابتدار میں جب سرمایہ داری اور عدم مداخلت کی پالیسی کو ترقی ہونا شروع ہوئی تو مزدوروں کو اس بات کا احساس ہوا کہ سرمایہ داروں اور اُن کے درمیان بیگانگی پیدا ہوگئی ہے اور یہ دو جداگانہ طبقوں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔ سرمایہ دار طاقتور ہیں اور مزدور کمزور ہیں ان کی اس کمزوری میں حکومت نے ان کا ساتھ دینا ترک کر دیا ہے۔ انھیں اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کا ایک ہی طریقہ نظر آیا یعنی یہ کہ وہ اپنے آجروں کے مقابلے میں متحد ہو جائیں۔

قوانین اتحاد چنانچہ سب سے پہلی مزدوروں کی انجمنیں مغربی انگلستان کی صنعت میں بنائی گئیں، کیونکہ یہاں کی کپڑے کی صنعت میں سرمایہ داری نظام کی ترقی نسبتاً پہلے رونما ہوگئی تھی۔ اس علاقہ میں سترھویں صدی ہی میں

بڑے پیمانہ کی پیدائش مستقل بنیاد پر قائم ہوگئی تھی ایسے کارخانے جن میں سینکڑوں آدمی کام کرتے تھے بہت سے تھے۔ یہ ابتدائی انجمنیں بیماروں کی امداد کے لئے قائم ہوئی تھیں لیکن آجروں نے یہ کہہ کر ان کی مخالفت کی کہ انکے ذریعے امداد کا بہانہ کرکے دراصل کاروبار میں کاوٹ ڈالنے کی سازش کی جاتی ہے آجروں کے مفاد کی نمایندگی پارلیمنٹ میں چونکہ بہت مضبوط تھی اس لئے ۱۷۲۶ء میں قانون انحصار وضع کیا گیا جس کے ذریعے ایسے تمام اتحادات کو جن سے کاروبار میں رکاوٹ واقع ہو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود مزدوروں کے اتحاد کی تحریک تیزی کے ساتھ پھیلتی رہی۔ کپڑا بننے والوں میں سے یہ پارچہ بافی کے دوسرے کام کرنے والوں میں پہنچی اور وہاں سے کپڑا سینے والوں میں۔ ۱۷۲۰ء سے ۱۸۰۰ء تک آجروں اور مزدوروں میں اُجرت اور کام کے اوقات کے معاملے میں برابر کش مکش جاری رہی۔ حکومت کی مخالفت کے باوجود ٹریڈ یونین کی تحریک ختم نہیں ہوئی بلکہ یا تو پوشیدہ طریقے پر چلتی رہی یا دوستانہ منافع کی انجمنوں کے پردہ میں اس کو جاری رکھا گیا۔ جب صنعتی انقلاب کے زمانے میں فیکٹری نظام کو پوری طرح ترقی ہوگئی تو ٹریڈ یونین کی تحریک بھی بہت آگے بڑھ گئی۔ چنانچہ ۱۷۶۰ء اور ۱۸۰۰ء کے درمیان بہت سی ہڑتالیں ہوئیں جن میں تشدد سے بھی کام لیا گیا۔ اٹھارھویں صدی کے نصف ثانی میں یہ تحریک شیفیلڈ کے چھری کانٹے بنانے والوں۔ لیسٹر کے فریم پر کاڑھنے والوں اور سارے ملک کے ہیٹ بنانے والوں، کپڑا چھاپنے والوں، سوت کاتنے والوں۔ سواری گاڑیاں بنانے والوں، لوہاروں، بڑھیوں، کپی گروں میں پھیل گئی۔ اٹھارھویں صدی کے آخری زمانے میں اون کے دھنکنے والوں کی انجمن خاص طور پر بہت طاقتور ہوگئی تھی اور اون کے آجروں نے ۱۷۹۴ء میں یہ بات کہی تھی کہ وہ بالکل اپنے مزدوروں کے رحم وکرم پر ہیں۔ یارک شائر کے کندی گروں کی انجمن بھی بہت مضبوط تھی اور مختلف شہروں میں جو اس کی شاخیں تھیں، ان کی نگرانی ایک مرکزی کمیٹی کیا

کرتی تھی۔

حکومت جس پر سرمایہ داری کا غلبہ تھا، اس تحریک کی مخالف تھی۔ اس کا پتہ گلاسکو کے معاملے سے چلتا ہے۔ یہاں مزدوروں نے اجرت کی کمی کی مخالفت کی جس پر ایک قانون وضع ہوا جس میں آجروں کو پیمانے کے مطابق اُجرتیں ادا کرنے کا پابند بنایا گیا۔ مزدوروں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا اور روئی کی صنعت میں ایک ہڑتال کر دی جو کارلائل سے لے کر ابرڈین تک پھیل گئی۔ جب آجروں نے مزدوروں کے مطالبے کو منظور کرنا چاہا تو حکومت درمیان میں آگئی اور اُس نے ہڑتال کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ غرض مزدوروں کی طرفداری میں اجرت کو مقرر کرنے کا سلسلہ جو پہلے ہی کمزور ہو چکا تھا اب بالکل ختم ہو گیا اور ۱۸۱۳ء میں ایک قانون بنایا گیا جس سے آنریری مجسٹریٹوں کو اُجرتیں مقرر کرنے کا جو قانونی حق ملا ہوا تھا وہ بھی منسوخ کر دیا گیا اور پہلے جہاں عملی طور پر حکومت عدم مداخلت کے اصول کی پابندی کرتی تھی وہاں اب نظری طور پر بھی کرنے لگی۔

انقلاب فرانس نے بھی انگلستان کے مزدوروں کی تحریک پر اثر ڈالا۔ ٹامس پین نے ایک رسالہ "حقوق انسان" کے نام سے لکھا جس میں جمہوریت، مساوات، اور اخوت کی تبلیغ کی گئی تھی۔ اس کے زیر اثر مزدوروں نے بھی اصلاح کا مطالبہ کیا اور ۱۷۹۲ء میں ٹامس ہارڈی نے مزدوروں کی اولین سیاسی انجمن کی انگلستان میں بنیاد رکھی جس کا نام لندن کی انجمن مراسلت (لندن کرسپانڈنگ سوسائٹی) تھا۔ اس کے مطالبے یہ تھے کہ بالغوں کو حق رائے دیا جائے اور پارلیمنٹ کی اصلاح کی جائے۔ اسی قسم کی اور انجمنوں نے برطانیہ کے لوگوں میں تیزی سے ترقی کرنا شروع کی تو حکومت خوفزدہ ہو گئی، اور اس نے اسکاٹ لینڈ کے دو انتہا پسندوں (ریڈیکل) میور اور پالمر کو ۱۷۹۳ء میں لانبی مدت کے لئے عبور دریائے شور کی سزا دی۔ اس کے دوسرے سال اُس نے لندن کرسپانڈنگ سوسائٹی کے تین ممتاز رہنماؤں، ہارڈی، ہارن ٹک اور جان تھیلوال

کو بھی قید کر دیا اور سخت جبر و تشدد شروع کر دیا۔ ۱۷۹۹ء میں انجمن ہائے مراسلت کا قانون بنایا گیا جس کے ذریعے تمام ایسی مقامی انجمنوں کو جو باہمی مراسلت کے تعلقات رکھتی تھیں۔ غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ ۱۸۰۰ء میں قانونِ اتحاد بنایا گیا جس کے ذریعے ٹریڈ یونین کی تحریک کی تمام شکلوں کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ان قوانین کی وجہ سے مزدوروں کی تحریک کو انتہائی نقصان پہنچا۔

انیسویں صدی کے اول ربع میں مزدوروں کی تاریخ آجروں کی طرف سے تشدد۔ مزدوروں کی طرف سے انتقامی کارروائیوں اور عدالت کی طرف سے ظالمانہ سزاؤں کی ایک مسلسل داستان ہے۔ لیکن قانون اتحاد کے باوجود۔ ٹریڈ یونین کی تحریک کو مٹایا نہیں جا سکا۔ مزدوروں کے اتحاد خصوصاً لندن میں پوشیدہ طور پر جاری رہے اور ۱۸۲۴ء میں جب قانون اتحاد کو منسوخ کیا گیا تو مزدوروں کی انجمنیں تقریباً تمام اہم دستکاریوں میں موجود تھیں۔

<u>۱۸۲۵ء تا ۱۸۳۴ء</u> ۱۸۲۴ء میں فرانسیس پلیس، چیرنگ کراس، کے ٹیلر ماسٹر اور جوزف ہیوم ریڈیکل رہنما کی کوششوں سے قانون اتحاد کو پارلیمنٹ نے منسوخ کر دیا، اور مزدوروں کے اتحاد اور ان کی ہڑتالوں کے حق کو جائز قرار دیا۔ مزدوروں نے اس کو اپنی بڑی کامیابی سمجھا اور ہڑتالوں کی ایک وبا پھیل گئی۔ جن میں اکثر تشدد سے بھی کام لیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دوسرا قانون ۱۸۲۵ء میں بنایا گیا جس میں مزدوروں کے ان حقوق کو تو باقی رکھا گیا لیکن اُن پر کچھ ایسی پابندیاں لگا دی گئیں جس سے دوسروں کو کام سے روکنا اور انھیں دق کرنا جرم میں داخل ہو گیا۔

لیکن اتحاد اور ہڑتال کے ان حقوق کے ملنے سے مزدوروں کو جیسا اطمینان ہونا چاہیئے تھا وہ حاصل نہ ہو سکا۔ وجہ یہ تھی کہ آجروں نے بھی اپنی انجمنیں بنالی تھیں اور ان میں بہت زیادہ یک جہتی پائی جاتی تھی۔ اس کے مقابلے میں مزدوروں کی انجمنوں میں

باہمی اتحاد نہیں تھا جس کی وجہ سے ان کی ہڑتالیں اکثر ناکامی پر ختم ہوتی تھیں۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لئے مزدوروں نے ایسی انجمنیں بنانی چاہیں جن میں ملک کی ساری صنعتوں کے سب مزدور شریک ہوں اور انھوں نے ملک کے تمام مزدوروں کے مکمل اتحاد اور یک جہتی کو اپنا نصب العین قرار دے لیا۔ ۱۸۲۹ء میں ایک گرانڈ جنرل یونین بنائی گئی۔ یہ جلد ختم ہوگئی۔ لیکن اس نے آیندہ کے لئے راستہ کھول دیا۔ چنانچہ دوسرے سال ڈوہرٹی نے قومی انجمن برائے تحفظ مزدوران قائم کی جس نے جمہور کی آواز کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا، جس کا دعوےٰ تھا کہ اس کی اشاعت تیس ہزار ہے۔ اس کے بعد جنرل ٹریڈز یونین بنائی گئی۔ جس کا رویہ آجروں کے ساتھ بہت گستاخانہ تھا۔ اس لئے وہ اس سے ناراض ہوگئے اور انھوں نے اس کے ممبروں کو اپنے یہاں ملازم رکھنا ممنوع قرار دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بھی ختم ہوگئی۔

۱۸۳۳ء میں صرف آٹھ گھنٹے روزانہ کام کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اور اوون نے گرانڈ نیشنل کنسالی ڈیٹیڈ یونین قائم کی جس کی رکنیت چند ہفتوں میں پانچ لاکھ تک پہنچ گئی اور اس میں زراعتی مزدور بھی شامل کئے گئے۔ اس نے بھی ہڑتال کی پالیسی پر عمل کیا اور یہ بھی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد سے سارے ملک کی متحدہ ٹریڈ یونین کی تحریک ختم ہوگئی۔ اس قسم کی ہمہ گیر تحریکوں کا جن لوگوں کو شوق تھا۔ انھوں نے ٹریڈ یونین کی تنظیم کی جگہ اب سیاسی تنظیم کی طرف توجہ کی اور اس معاملے میں ولیم کابٹ جو جمہور کو سیاسی اقتدار دلانا چاہتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جب سیاسی اقتدار مل جائے گا تو معاشی بہتری کے لئے حالات خود بخود سازگار ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس خیال کے لوگوں میں چارٹزم کا زور رہا۔

۱۸۳۴ء تا ۱۸۵۵ء | لیکن جو لوگ ٹریڈ یونین سے دلچسپی رکھتے تھے انھوں نے اپنے میدان عمل کو محدود کر لیا۔ اب اگر وہ ملکی اتحاد کرتے تھے تو وہ ایک ہی صنعت کے لوگوں تک محدود ہوتا تھا۔ سارے ملک کی تمام صنعتوں کے تمام مزدوروں کو اس میں شامل کرنے

کی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے مقاصد اور کام کے طریقوں میں بھی ایک نئی روح پیدا ہوگئی تھی، اب وہ ہر مسئلے پر جداگانہ طریقے پر غور کرتے تھے جہاں قانون کو اپنے مخالف پاتے تھے۔ وہاں قانون بدلوانے کی کوشش کرتے تھے۔ یونین کے فنڈ میں بڑی رقمیں اکٹھی کی جاتی تھیں جن سے کچھ تو دوستانہ خدمات فراہم کی جاتی تھیں اور کچھ ہڑتالیں چلانے کا کام لیا جاتا تھا۔ تجربے سے یہ معلوم کرلیا گیا تھا کہ اعزازی سکریٹری کے مقابلے میں تنخواہ دار سکریٹری زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے بلکہ اس اصول کو پوری جماعت عاملہ پر منطبق کیا جانے لگا تھا۔ مزدوروں کے پورے طبقے کے مفاد کی انھیں فکر نہیں تھی بلکہ اب ہر صنعت کے مزدور اپنے ذاتی اور مخصوص مفاد کا جداگانہ طریقے پر مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ اس نئی تحریک کا سلسلہ ۱۸۳۰ء سے قبل کی تحریک سے ملایا جا سکتا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ اس درمیان میں مزدوروں کے علم اور تجربے میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ مزدوروں نے سرمایہ داری نظام کو ایک ناگزیر حقیقت کے طور پر تسلیم کرلیا تھا۔ اب وہ اس نظام کے اندر رہ کر اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔

نئی قسم کی ٹریڈ یونین | ۱۸۵۰ء کے بعد ٹریڈ یونین تحریک کی اس نئی روح نے اور واضح طور پر ظاہر ہونا شروع کیا۔ ہڑتالوں سے جو مالی نقصان پہنچتا تھا اور ان کے ذریعے جو مشتبہ کامیابی حاصل ہوتی تھی اسے دیکھتے ہوئے بعض معاملوں میں مفاہمت پسندیدہ خیال کی جانے لگی۔ چنانچہ اب ہڑتال صرف مجبوری کی حالت میں آخری حربہ کے طور پر اور مرکزی جماعت کے فیصلے پر جائز سمجھی جانے لگی۔ یونین کے مقاصد بھی واضح شکل میں پیش کئے جانے لگے خوش حال مزدور اپنی بہتر حالت کو قائم رکھنے کے لئے نئے امیدواروں کی تعداد کو محدود رکھنے کا مطالبہ کرنے لگے تاکہ مزدوروں کی رسد کے اضافے سے اجرت کی شرح کم نہ ہو۔ زائد وقت کام کرنا مذموم سمجھا جانے لگا اور کام کے اوقات کو کم کرنے کے لئے آجروں سے اپیل کی جانے لگی۔ نقل سکونت کا ایک فنڈ قائم کیا گیا تاکہ مزدوروں

کی تعداد کو کم کر کے اجرتوں میں اضافہ کرایا جا سکے۔

۱۸۵۹ء میں پارلیمنٹ میں قانون بنوایا گیا جس کے ذریعے ۱۸۲۵ء کی خرابیوں کو دور کیا جا سکا۔ اس قانون کی رو سے غدار مزدوروں کو پرامن اور معقول طریقے پر اپنا ہم خیال بنانا مداخلتِ بیجا میں شامل نہیں رہا۔

جنٹا اسی زمانے میں موجودہ لیبر پارٹی کا آغاز ہوا۔ اب تک مزدوروں کی حمایت میں پارلیمنٹ میں جو قانون بنوائے گئے تھے وہ سب مزدوروں کے ہمدردوں نے بنوائے تھے خود مزدور پارلیمنٹ کے رکن نہیں تھے۔ لیکن اب مزدوروں میں چند ایسے قابل آدمی پیدا ہو گئے جو مزدوروں کی طرف سے خود بول سکتے تھے۔ ان میں پانچ آدمیوں نے جو جنٹا کے نام سے مشہور ہوئے۔ بہت شہرت حاصل کی یہ لوگ اپنی باہمی دوستی اور سیاسی ہم خیالی کی وجہ سے نہایت قریبی طور پر ایک رشتے میں منسلک تھے۔ ان کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ یہ آجروں کے نقطۂ نگاہ کو سمجھ سکتے تھے۔ یہ انفرادیت پرست تھے۔ پارلیمنٹ میں یہ لوگ اپنی سیرت کی بلندی اپنی اعلےٰ صلاحیت اور طبقہ متوسط کے آداب و مراسم کی واقفیت کی وجہ سے عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے۔ وہ صنعتی معاملات میں بہت محتاط تھے اور اپنی بیشتر توجہ سیاسی معاملات پر صرف کرتے تھے۔ وہ ہڑتال کرانے سے جہاں تک ہو سکتا بچتے تھے۔ وہ سخت گیر آجروں سے ان منافع کو دباؤ کے ذریعے حاصل کرتے جنھیں اچھے آجر برضا اور خوشی مزدوروں کو عطا کر دیتے تھے۔ مزدوروں کا بھی انھیں ویسا ہی اعتماد حاصل تھا جیسا کہ آجروں کا تھا۔ یہ لوگ اپنے زیادہ تر کام لندن ٹریڈز کونسل کی معرفت انجام دیتے تھے جو لندن کی تمام صنعتوں کا ایک وفاق تھی۔

شاہی تحقیقاتی کمیشن اور ٹریڈ یونین کانگریس لیکن لندن کے علاوہ انگلستان کے دوسرے اضلاع میں اتنی معقولیت پسندی نہیں تھی اور اس زمانے میں ٹریڈ یونین کی تحریک کو بہت خطرہ درپیش تھا۔ ایک طرف آجروں نے مل کر اپنی انجمنیں بنالی تھیں

دوسری طرف شیفیلڈ میں ان مزدوروں کے خلاف جو یونین کے ممبر نہیں تھے - یونین کے ممبروں نے جو زیادتیاں کی تھیں، ان سے بہت برہمی تھی - سنہ ۱۸۶۶ء میں تحقیقات کے لئے پارلیمنٹ نے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا - ان معاملات پر ٹریڈ یونین کے نقطۂ نگاہ سے غور کرنے کے لئے ملک کی تمام ٹریڈ یونینوں کی ایک کانگریس منعقد کی گئی - اس وقت سے آج تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے - ٹریڈ یونینوں نے اپنی طرف سے خود تحقیقات کئے جانے پر زور دیا تاکہ وہ دہشت انگیزی کے الزام سے اپنے آپ کو بری کرسکیں - جن کی کوششوں سے ایک غیر جانب دار کمیشن مقرر ہوا - اور ان کی رپورٹ ٹریڈ یونین کی تحریک کے مخالف ثابت نہیں ہوئی - اسی سال پارلیمنٹ میں رفارم ایکٹ بھی منظور ہوا جس کے ذریعے شہر کے مزدوروں کو حق رائے مل گیا -

ٹریڈ یونین کا قانون

سنہ ۱۸۷۱ء میں ٹریڈ یونین ایکٹ منظور ہوا - جس کی رو سے مزدوروں کو تمام حقوق جو انھیں عملاً ملے ہوئے تھے قانوناً تسلیم کر لئے گئے لیکن اس کے ساتھ ہی ترمیم ضابطہ فوجداری کا قانون بھی پاس ہوا جس میں دھرنا دینے اور غدار مزدوروں کو اپنا ہم خیال بنانے کو جرم قرار دیا گیا -

پارلیمنٹ میں مزدوروں کے نمائندے

اس لئے سنہ ۱۸۷۱ء میں یہاں نے لندن میں ایک ٹریڈ یونین کانگریس طلب کی تاکہ اس مکروہ قانون کو منسوخ کرایا جاسکے - جب تمام معمولی ذرائع ناکامیاب ثابت ہوئے تو کانگریس نے سنہ ۱۸۷۴ء میں اس بات کی اجازت دی کہ اپنے تیرہ نمائندوں کو پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے کھڑا کیا جائے - ان میں سے دو منتخب ہوگئے یہ دونوں اولین مزدور ممبر تھے - اس انتخاب میں ایک نئی پارٹی برسر اقتدار آئی جس نے سنہ ۱۸۷۵ء کا ٹریڈ یونین ایکٹ منظور کیا - جس سے ہڑتال کرنا، دھرنا دینا وغیرہ قانونی فعل بن گئے -

۱۸۷۵ء کے بعد ٹریڈ یونین کا زوال اور سوشلزم کی ترقی

سنہ ۱۸۷۵ء سے برابر ٹریڈ یونین تحریک

کو ترقی ہو رہی تھی۔ ہڑتالیں بھی نتائج کے لحاظ سے کامیاب رہتی تھیں۔ اس لئے اس دور کو ٹریڈ یونین کی ترقی کے دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب ۱۸۷۳ء میں کساد بازاری شروع ہوئی اور مزدوروں کی اجرتیں کم ہوئیں اور ان کے کام کے حالات پہلے سے خراب ہوگئے تو اسے آئینی طریقوں سے مایوسی ہوگئی۔ انھوں نے سوچنا شروع کیا کہ سیاسی اصلاحات بھی ہو چکی ہیں۔ ان کی ٹریڈ یونین کی تنظیم بھی بہت اچھی ہے۔ آزاد تجارت بھی ہے۔ لیکن پھر بھی ہماری حالت خراب کی خراب ہے اس لئے انھیں لبرلزم سے مایوسی ہوئی اور ان میں کارل مارکس اور اس کے پیرووں کے اشتراکی خیالات تیزی سے پھیلنا شروع ہوئے۔ ملک بصورت مجموعی اس بدعت کے خلاف تھا۔ خود ٹریڈ یونین کی تحریک کے اندر بھی اس معاملے میں باہمی اختلاف تھا۔ اس لئے اس نئی تحریک کو ابتدا میں سخت جنگ کرنا پڑی۔ ٹریڈ یونینوں کے اندر امارت پسندی اور اجارہ داری آگئی تھی۔ یہ مزدوروں کی محدود اور مقررہ تعداد کے فائدے کے لئے کام کرنے لگی تھیں۔ جو مزدور تباہ حال تھے وہ ان میں داخلہ چاہتے تھے۔ لیکن ان کے لئے ٹریڈ یونین کے دروازے بند تھے۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۸۵ء تک ٹریڈ یونین کی تحریک صرف ماہر مزدوروں تک محدود رہی اور یہ گلیڈ اسٹن کی لبرل تحریک کی عدم مداخلت اور انفرادیت پرستی کو قبول کرتی رہی، اور اس نے اپنے مشاغل کو دوستانہ انجمنوں کی امداد و رفاقت تک محدود کئے رکھا۔ لیکن ۱۸۸۸ء میں جب سوشلزم نے پھیلنا شروع کیا تو ایک نئی روح بیدار ہوگئی اور غیر ماہر مزدوروں اور کم اجرت پر کام کرنے والی عورتوں کی توجہ مزدور تحریک کے اشتراکی عنصر کی طرف مائل ہوئی ہڑتال کی پالیسی کو پھر عروج ہوا۔ ٹریڈ یونین کے کام کو دو علیحدہ حصوں میں تقسیم کیا جانے لگا۔ ایک وہ کام تھے جو وہ دوستانہ امدادی انجمن کی حیثیت سے انجام دیتی تھیں اور دوسرے خالص ٹریڈ یونین کی حیثیت سے۔ اب ٹریڈ یونین کے چندوں کو صرف ہڑتال کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ اوون کے کمیونزم (اجتماعیت) کے مقابلے میں

کلیکٹویزم (اشتمالیت) کو جس میں مزدوروں کو ذرائع دولت آفرینی کا مالک بنانا تجویز کیا جاتا تھا۔ زیادہ لائق عمل سمجھ کر نصب العین کے طور پر اختیار کر لیا گیا اور اس کے حصول کا ذریعہ اس بات کو سمجھا جائے لگا کہ حکومت سے مزدوروں کی اجرت بڑھانے اور کام کے اوقات گھٹانے میں مداخلت کرائی جائے۔ ٹریڈ یونین تحریک کا رجحان عالمگیریت کی طرف ہو گیا۔ اور غیر ملکی یونینوں سے مراسلت کی خواہش کی جانے لگی۔ لندن میں ۱۸۸۸ء میں پہلی بین الاقوامی ٹریڈ یونین کانگریس منعقد کی گئی۔

۱۸۸۸ء میں دیا سلائی کے کارخانوں میں کام کرنے والی عورتوں نے ہڑتال کردی۔ اُن کے پاس روپیہ بالکل نہیں تھا، اور ان کی کوئی تنظیم نہیں تھی۔ لیکن رائے عامہ اس قدر ہمدرد ہو گئی تھی کہ آجروں کو ہار ماننا پڑی۔ اس سے طبقہ وارانہ جنگ کے اندر ایک نیا عنصر شامل ہو گیا یعنی مزدور اور سرمایہ دار دونوں رائے عامہ کو طرفدار بنانے کی کوششیں کرنے لگے۔ ۱۸۸۹ء میں گیس کے کارخانوں میں کام کرنے والوں کی یونین اور عام مزدوروں کی یونین بنائی گئی اور چند مہینوں کے اندر ہی گیس کے کارخانہ کے مزدوروں کا یہ مطالبہ کہ ان سے صرف آٹھ گھنٹے کام لیا جائے مان لیا گیا۔ اس کے فوراً بعد جنوب مغربی انگلستان کی ان گودیوں میں جہاں سے ہندوستان کو جہاز روانہ کئے جاتے تھے، یکبارگی ہڑتال کی گئی اور اس سے اس عظیم الشان گودیوں کی ہڑتال کی ابتدا ہوئی جس کی رہنمائی جان برنس، بین ٹلٹ اور ٹام من نے کی۔ دس ہفتہ کے لئے تجارت کا کام بالکل رکا رہا۔ ہر طرف سے یہاں تک کہ آسٹریلیا سے امداد کی بارش ہوتی رہی تا آنکہ مزدوروں کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ غیر ماہر مزدوروں کی پہلی شاندار کامیاب ہڑتال تھی۔

نئے قسم کی ٹریڈ یونین کی ترقی

اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ نکلا کہ ٹریڈ یونین تحریک کو نئے سرے سے خوب ترقی ہوئی اور ایک سال سے کم عرصے میں

۲۰ لاکھ مزدور ٹریڈ یونین کے حلقے میں شامل ہوگئے - مزدوروں میں یک جہتی کو خوب ترقی ہوئی اور ان میں اپنے طبقے کے حقوق کے لئے ایک مشترک جذبہ پیدا ہوگیا اور اس کے نتیجے کے طور پر سوشلزم کی تحریک کو بھی ترقی ہوئی - یہ نئی ٹریڈ یونینیں اور ... زمانے کی انجمنوں کی طرح صرف جنگ جو جماعتیں تھیں - ان کے چندے کم تھے اور یہ اپنے اراکین کے لئے دوستانہ امداد کا انتظام نہیں کرسکتی تھیں اس لحاظ سے یہ سابقہ انجمنوں سے بہت مختلف تھیں ... کے ساتھ ساتھ اتحاد کی تحریک بھی بڑے پیمانے پر پھیلنا شروع ہوگئی تھی اور کئی وفاق وجود میں آگئے تھے۔ اور ملک کے طول و عرض میں ٹریڈ کونسلز بن گئی تھیں۔

اب آجروں کی باری تھی کہ وہ بھی اپنے تحفظ کا انتظام کریں۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں مشین سازی کے کارخانوں کے آجروں نے ایک انجمن بنائی اور ایک بڑی ہڑتال کے موقع پر مشین سازی کے کاریگروں کی متحدہ انجمن کو شکست دی۔ ۱۸۹۹ء میں ٹریڈ یونینوں کا ایک عام وفاق بنایا گیا۔ ابتدا میں اس وفاق کی نگرانی ہر مرکز باری باری سے کرتا تھا اور سب واحدوں کو مساوی اختیار ملا ہوا تھا۔ لیکن بعد میں جب کاروبار بڑھا تو ایک مستقل مرکز میں تنخواہ دار عہدہ داروں کا تقرر کیا گیا اور بعض صورتوں میں شاخ کی انجمنوں کے نمائندوں کو بھی منتخب کیا گیا۔ اس عام وفاق کا مقصد یہ تھا کہ مشکل کے وقت یونینوں کی امداد کریں۔ پھر مزدوروں کے ان بڑے اتحادوں نے غیر ملکی یونینوں سے بھی تعلقات قائم کر لئے۔

ٹریڈ یونین اور سیاسی تحریک پارلیمنٹری لیبر پارٹی کی ابتدا ۱۸۹۲ء کے انتخاب میں ہوئی جب کیر ہارڈی، جان برنس، اور ہیولاک ولسن کو پارلیمنٹ کے لئے منتخب کیا گیا۔ ۱۸۹۳ء میں بریڈ فورڈ کے مقام پر کیر ہارڈی نے آزاد لیبر پارٹی کی بنیاد رکھی اور ۱۸۹۵ء کے انتخاب میں اپنے ۲۸ امیدوار کھڑے کئے جن میں سے کوئی بھی

کامیاب نہیں ہوا۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں ٹریڈ یونین کانگریس بھی ان کی ہم خیال ہوگئی اور پارلیمنٹ میں مزدوروں کا ایک جداگانہ گروپ بنا لیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کے مفاد میں قوانین بنوائے جائیں۔ سنہ ۱۹۰۰ء کے عام انتخابات میں مزدوروں کے لئے نمایندگی حاصل کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں ٹریڈ یونین کے حامیوں نے سوشلسٹ تحریک کے حامیوں کے ساتھ سیاسی معاملات میں اشتراک کر لیا۔ اس مشترکہ پارٹی کا سنہ ۱۹۰۶ء میں لیبر پارٹی نام رکھا گیا۔ اس کمیٹی نے سنہ ۱۹۰۰ء میں اپنے پندرہ امیدواروں کو نامزد کیا لیکن صرف کیر ہارڈی اور رچرڈ بیل کو کامیابی ہوئی۔

لیبر پارٹی کا عروج | بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ پارلیمنٹری لیبر پارٹی کو عروج ہونا شروع ہوا اور سنہ ۱۹۰۶ء میں انتیس امیدواروں کی ایک متحدہ جماعت منتخب ہوئی لیبر پارٹی کا سب سے اول کارنامہ "قانون صنعتی مناقشات" کی صورت میں ظاہر ہوا جس کے ذریعے ہڑتال اور دربندی کے قانون کو مزدوروں کے موافق بنا دیا گیا اور سنہ ۱۹۰۲ء میں ایوان امرا نے ٹیف ویل کے مقدمے میں فیصلہ سنا کر ٹریڈ یونین کو جس طرح خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ اس کا بڑی حد تک ازالہ ہو گیا

سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۱۴ء | سنہ ۱۹۱۰ء میں قیمتوں کے اضافہ تجارت کی ترقی اور امریکہ اور فرانس کے سوشلسٹ اثرات کی وجہ سے صنعتی بے چینی کی ایک نئی لہر اٹھی اور اشتراکیت کی نئی شکلیں ترقی پانے لگیں۔ ٹریڈ یونین کی رکنیت میں غیر معمولی تیزی کے ساتھ اضافہ ہونا شروع ہوا۔ بہت سی ہڑتالیں ہوئیں جن میں سے اکثر کامیاب ثابت ہوئیں۔ ان میں سب سے اہم سنہ ۱۹۱۱ء میں نقل و حمل کے مزدوروں اور سنہ ۱۹۱۲ء میں کان کھودنے والوں کی ہڑتالیں تھیں۔ صنعتی انجمن سازی، سنڈیکلزم اور گلڈ سوشلزم کے نئے خیالات کی اشاعت کی گئی اور ٹریڈ یونینیں یہ مطالبہ کرنے لگیں کہ صنعت کی نگرانی میں انھیں بھی حصہ ملنا چاہیے۔

جنگ عظیم اول اور ٹریڈ یونینز ۱۹۱۴ء میں جنگ کے شروع ہو جانے کی وجہ سے یہ تحریک یکبارگی ختم ہوگئی۔ لیکن جیسے ہی جنگ کے زمانے کی مزدوروں کی وجہ سے مزدوروں کو نئے نئے کاموں سے لگا یا گیا اور ان کی تنظیم کی گئی تو بہت سے جھگڑے رونما ہونے لگے۔ ۱۹۱۵ء میں سامان جنگ کے قانون کے ماتحت آجروں اور مزدوروں کو جبری مصالحت کا پابند کیا دیا گیا۔ لیکن جنگ کے زمانے میں بڑی ہڑتالیں نسبتاً کم ہوئیں لیکن صنعتی کاروبار کا بہت زور رہا۔ دوکان کے ملازمین کی تحریک کو ترقی ہوئی جنگ کے پورے زمانے میں ٹریڈ یونین کی رکنیت تیزی سے بڑھتی رہی۔

جنگ عظیم اول کے بعد جب جنگ عظیم ختم ہوئی تو صنعتی بے چینی بڑے پیمانے پر شروع ہوئی جس کو اُجرتیں بڑھا کر اور کام کے اوقات گھٹا کر دور کیا گیا۔ ٹریڈ یونینوں کی رکنیت اور زیادہ بڑھتی رہی یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء میں انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ اس کے بعد زبردست کساد بازاری شروع ہوئی اور ۱۹۲۱ء میں کان کنوں کے خلاف اور ۱۹۲۲ء میں مشین سازی کے مزدوروں کے خلاف دربندی کی گئی۔ مزدوروں نے اجرتوں میں کمی اور کام کے حالات کی خرابی کو روکنے کی انتہائی کوشش کی لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۳ء میں رکنیت بہت زیادہ کم ہوگئی۔ لیکن اس کے بعد ۱۹۲۶ء تک ۱۹۱۳ء کی تعداد کے مقابلے میں پندرہ لاکھ سے اوپر قائم رہی

ٹریڈ یونین کے اعداد و شمار ۱۸۹۲ء سے پہلے ٹریڈ یونین کے بارے میں کوئی اعداد و شمار نہیں ملتے۔ اس کے بعد حکومت نے ان کے بارے میں نقشوں کو شائع کرنا شروع کیا ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجموعی رکنیت ۱۸۹۲ء میں ۵ لاکھ ۷ ہزار۔ ۱۹۰۰ء میں ۲۰ لاکھ ۲۲ ہزار، ۱۹۱۰ء میں ۲۵ لاکھ ۶۵ ہزار، ۱۹۱۳ء میں ۴۱ لاکھ ۳۵ ہزار ۱۹۱۸ء میں ۶۵ لاکھ ۳۳ ہزار۔ ۱۹۲۰ء میں ۸۳ لاکھ ۴۷ ہزار۔ ۱۹۲۲ء میں ۵۶ لاکھ ۱۶ ہزار۔ ۱۹۳۵ء ۵۲ لاکھ ۲۲ ہزار تھی۔

ٹریڈیونین تحریک کی نمائندگی بصورت مجموعی ٹریڈیونین کانگریس کے ذریعے ہوتی تھی۔ یہ مستقل طور پر سنہ ۱۸۶۶ء میں شروع ہوگئی تھی۔ اس کی رکنیت کے اعداد وشمار سنہ ۱۸۶۹ء میں دو لاکھ ۵۰ ہزار تھے۔ سنہ ۱۸۷۴ء میں یہ بڑھ کر ۵ لاکھ ۹۴ ہزار ہوگئے۔ لیکن سنہ ۱۸۸۰ء میں گھٹ کر ۳ لاکھ ۸۱ ہزار ہوگئے۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں بڑھ کر ۱۵ لاکھ ۹۳ ہزار ہوئے لیکن سنہ ۱۸۹۳ء میں دوبارہ گھٹ کر ۷ لاکھ ۲۱ ہزار رہ گئے لیکن سنہ ۱۹۰۰ء میں دوبارہ بڑھے اور ساڑھے ۱۲ لاکھ ہوگئے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں ۱۶ لاکھ ۸۴ ہزار سنہ ۱۹۱۳ء میں ۲۲ لاکھ ۳۲ ہزار۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں ۴۵ لاکھ ۳۲ ہزار۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں ۶۵ لاکھ ۵ ہزار سنہ ۱۹۲۲ء میں ۵۱ لاکھ ۲۹ ہزار اور سنہ ۱۹۲۵ء میں ۴۴ لاکھ ۱۵ ہزار ہوگئے۔

ٹریڈیونین کی رکنیت زیادہ تر صرف چند صنعتوں تک محدود ہے چنانچہ سنہ ۱۹۲۵ء میں کان کنوں اور کھانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے ۹ لاکھ ۳۸ ہزار۔ دھات مشین سازی اور جہاز سازی کے مزدوروں کے ۶۵ لاکھ ۸۲ ہزار اور ریلوے اور نقل وحمل کے مزدوروں کے دس لاکھ ۸۴ ہزار پارچہ بافی کے مزدوروں کے ۶ لاکھ ۶۴ ہزار رکن تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے گروہ جن میں نسبتاً بہتر تنظیم پائی جاتی ہے وہ چھاپہ خانہ اور عمارت سازی کے مزدور اور سرکاری ملازم ہیں۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں ٹریڈیونینوں کی مجموعی تعداد ایک ہزار ۱۴۴ تھی۔ لیکن اس تعداد سے صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اول تو بہت سی یونینیں دراصل صرف شاخیں ہیں اور دوسرے مجموعی رکنیت کا بہت بڑا حصہ صرف چند بڑی یونینوں یا وفاقوں میں مجتمع ہے۔ اس قسم کی سب سے بڑی انجمنیں یہ ہیں۔ برطانیۂ عظمیٰ کے کان کنوں کا وفاق (تقریباً ۹ لاکھ رکن) عام اور میونسپلٹی کے کارکنوں کی انجمن (۳ لاکھ ۲۷ ہزار رکن) ریلوے ملازموں کی قومی یونین (۴ لاکھ رکن) نقل وحمل اور عام کارکنوں کی انجمن (۳۴ لاکھ) مشین سازوں کی متحدہ یونین (۲ لاکھ ۴۳ ہزار) ان سب کا اور تقریباً تمام بڑی یونینوں

کا تعلق اور کچھ چھوٹی یونینوں کا بھی ٹریڈ یونین کانگریس کے ساتھ ہے جس کے ساتھ ۲۰۵ انجمنوں نے الحاق کرار کھا تھا۔ ان میں سے بعض وفاق بھی جن کے اندر بہت سی بہ اسے نام جدا جدا یونینیں شامل نہیں۔

جنرل کونسل | پچھلے بیس پچیس سال میں ٹریڈ یونین کانگریس کے اختیارات تیزی کے ساتھ بہت وسیع ہو گئے ہیں۔ ۱۹۲۷ء تک کانگریس کی عاملہ وہ جماعت تھی جس کا نام "پارلیمنٹری کمیٹی" تھا، جس کے اختیارات بہت محدود تھے، لیکن اس پارلیمنٹری کو توڑ دیا گیا اور ایک جنرل کونسل وسیع اختیارات کے ساتھ مقرر کر دی گئی جس کے اختیارات اس کے بعد سے اور زیادہ وسیع ہو گئے ہیں۔ انھی اختیارات کی بنیاد پر اپریل ۱۹۲۶ء میں جنرل کونسل نے ٹریڈ یونینوں کی جماعت ہائے عاملہ کی ایک مخصوص کانفرنس طلب کی تھی جس نے کان کنوں کی حمایت میں "عام ہڑتال" کا فیصلہ صادر کیا تھا۔

(باقی)

علی گڑھ کی تالے اور دھات کی صنعت کا جائزہ[1]

(۱) تمہید علی گڑھ میں تالے کی کام کی ابتدا گورنمنٹ پوسٹل ورکشاپ نے کی۔ اس ورکشاپ میں تالے اور مہر، بیڈیٹ، آئرن اور براس اسکیل (ترازو) دھیٹ (باٹ) لیٹر بکس، پھلے، گھونگرو، کرمچ کے تھیلے، چمڑے کا پوسٹ مین کا تھیلہ، چھپائی کی سیخ اور سیاہ روشنائی، مہر مارنے کے پیڈ، پوسٹ آفس کی چیزیں چھاپنے کے لئے چھوٹا سا چھاپہ خانہ۔ بہت سی قسم کی پوسٹ آفس کی لالٹینیں، ٹین کی اور لوہے کی بنی ہوئی۔ لیگل اسٹامپ ڈیمپر، چراغ، چپٹیاں، قینچی، نوٹس بورڈ، پنسر، ٹین کے ٹرے، پوسٹل اسٹامپس کی صندوقچیاں۔ غرض یہ تمام کام پوسٹل ورکشاپ میں بنتا تھا۔

(۲) جانسن اور اس کا کارخانہ۔ یورپین لوگوں میں اس کام کو بڑے پیمانے پر چلانے والوں میں جانسن کا نام نہایت ممتاز نظر آتا ہے۔ جانسن پہلے چڑیوں والے صاحب کے نام سے مشہور رہا۔ یہ نہایت غریب آدمی تھا۔ یہ طوطے اور دوسرے پرندے مار کر ان کے پروں کو امریکہ اور یورپ بھیجا کرتا تھا۔ یہ بڑی خوبیوں کا آدمی تھا۔ جب اس کا کام کچھ چل نکلا تو اس نے اور شکاریوں کو ملازم رکھا۔ اور پرندوں کی قیمتیں پروں کے حساب سے مقرر کیں جب

---

[1] اس صنعت کے بارے میں معلومات فراہم کرنے میں عبدالعلیم صاحب مالک عبدالعلیم اینڈ سنز نے بہت امداد فرمائی جن کا میں ممنون ہوں۔ ان کے علاوہ للتا پرشاد صاحب تواری سپرنٹنڈنٹ علی گڑھ مٹل ورکنگ اسکول اور ان کے اسٹاف اور خصوصیت کے ساتھ ان کے نوجوان اور ہونہار انسپکٹر اعجاز احمد صاحب نے بہت سی ضروری معلومات فراہم کیں۔ یہ جائزہ نومبر ۱۹۵۲ء میں لیا گیا۔

سے اس کا کام کچھ چکا۔ یہ ہارٹ صاحب پولس سرکل انسپکٹر علی گڑھ کا داماد تھا جن کی دو
کوٹھیاں تھیں جن میں سے ایک فلر کے پاس ہے اور دوسری نیشل ایجنسی کے پاس ہے۔
ہارٹ کی بیوی لیڈی ڈاکٹر تھی، لیکن یہ باقاعدہ پریکٹس نہیں کرتی تھی۔ پروں کے کام کے
چلنے کے بعد جانسن میٹل کی لائن میں آیا اور سب سے پہلے تالے کا کام شروع کیا۔ اس نے
اس قدر عمدہ قسم کے تالے بنوانا شروع کئے کہ جب اس کے زمانے کے بنے ہوئے تالے اب کسی
کے ہاتھ لگ جاتے ہیں تو اب کے کام سے بہت بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ یہ باہر کے دوکانداروں
سے کاروبار نہیں کرتا تھا۔ صرف گورنمنٹ کو اور ریاستوں کو سپلائی کرتا تھا۔ پیتل کے تالوں
کے بعد جانسن نے سب سے پہلے گیلوا نائزڈ آئرن پیڈ لاک بنایا اور اس کی قلعی اسی کی ایجاد
کی ہوئی ہے۔ جب عام پبلک نے اسے استعمال کرنا شروع کیا تو جانسن نے مقدمہ لڑایا
پنڈت ٹیکارام جھا کے فرم سے مقدمہ بازی ہوئی۔ جانسن مقدمہ ہار گیا۔ بیان کیا جاتا
ہے کہ عدالت کا فیصلہ یہ تھا کہ پیٹنٹ کسی شکل کا ہو سکتا ہے، قلعی کے طریقے کا پیٹنٹ
نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اس کے بعد عام پبلک میں یہ طریقہ رائج ہو گیا۔

دوسرا کام جانسن نے پیتل بٹن کا شروع کیا اور اس کے لئے اس نے امریکہ اور
جرمنی سے کاریگر بلوائے۔ اسی کی وجہ سے بعد میں یہ کام علی گڑھ کے اور دوسرے
لوگوں میں پھیلا۔

اینمل (تام چینی) کا کام سب سے پہلے اسی نے انگلینڈ اور امریکہ سے ماہروں کو بلا کر
رائج کیا۔ اس کے بعد یہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں پھیلا۔

چوتھا کام آرا مشین کا ہے۔ جانسن پیکنگ کیس کے واسطے تختے چیرنے کے لئے
ان کا استعمال کیا کرتا تھا۔ دوسرے آدمیوں نے انھیں بعد میں استعمال کیا۔

پانچواں کام دھات کی چادروں کو موڑنے کی مشین کا ہے۔ یہ بھی جانسن بہت پہلے
اپنے یہاں لگا چکا تھا۔

تانبے وغیرہ کا کاروبار گورنمنٹ کے ساتھ کرنے میں یہ سب سے پہلا شخص تھا۔ پوسٹل ورکشاپ میں جتنا کام ہوتا تھا اس سے زیادہ کام جانسن نے کیا۔ جانسن کے زمانے میں اس کارخانے میں سترہ سو اٹھارہ سو آدمی کام کیا کرتے تھے۔

چھپا کام ٹکٹ نمبر کو اس نے جاری کیا۔

موٹر کی مرمت کے کام کا کارخانہ اپنے یہاں شروع کیا۔

منہ سے بجانے کے باجوں اور ہارمونیم باجوں میں جو پیتل کی باریک شیٹ لگی ہوتی ہے۔ اس کے بنانے اور رواج دینے کی اس نے بہت کوشش کی لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ سینگ کے بٹن بھی گورنمنٹ کو سپلائی کیا کرتا تھا۔

الیکٹرو پلیٹنگ کا کام سب سے پہلے جانسن نے شروع کیا اور اس کا کارخانہ اب تک اسی کام کے لئے مشہور ہے۔ بلکہ اس کی وجہ ہی سے چل رہا ہے۔

ڈیٹنگ مشین جانسن نے بنوائی۔ جانسن بہت صاحب دماغ آدمی تھا اور بہت سی چیزیں اسی کی نکالی ہوئی ہیں۔ علی گڑھ کے بہت سے لوگ اس کی ایجادوں کی وجہ سے روٹی کھا رہے ہیں۔

اپنے دفتر میں آٹھ بجے جاتا تھا۔ اخبار دیکھتا تھا۔ ڈاک آ جاتی تھی اور خود ٹائپ کرکے اپنے ہاتھ سے ڈاک کا جواب دیتا تھا۔ اتنے میں گیارہ بج جاتے تھے اور دفتر کے کلرک آجاتے تھے اور یہ ایک گھنٹہ کام کرتا رہتا تھا۔ پھر ایک گھنٹے کے لئے لنچ کے لئے جاتا تھا۔ پھر چار بجے دفتر چھوڑ دیتا تھا۔ باقی لوگ ۵ بجے تک کام کرتے رہتے تھے۔ اس کا یہ حکم تھا کہ دفتر کے بعد کارخانے کی کوئی خبر اس تک نہ پہنچائی جائے۔ ایک دفعہ آگ لگ گئی تب بھی وہ نہیں گیا۔

مزدوروں کے ساتھ اس کا برتاؤ بہت اچھا تھا۔ اُن کے ساتھ پیڑھی پر بیٹھ کر مکا کی روٹی اور مٹھائی کھایا کرتا تھا۔ جب لوگ مزدوروں کے ساتھ سختی کرتے تو کہتا تھا یہ ہماری

گائے ہیں ہم ان کا دودھ پیتے ہیں۔ ہمیں ان کو خوش رکھنا چاہیئے۔ جب کام مندا ہوجاتا تو مزدوروں کو چنے کھلایا کرتا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ دعا مانگو کہ آرڈر آئیں اور کام پھر سے شروع ہو۔

ابتدا میں پھوس کے چھپروں میں کام کرتا تھا، بعد میں پختہ مکانات اور کوٹھیاں تعمیر کرائیں۔ میسز اور چیز نام کی دو کوٹھیاں بہت بڑی اور خوب صورت ہیں۔

عام افواہ یہ ہے کہ شراب کے نشے میں رات کے کھانے پر اس نے اپنے کارخانے کا بیع نامہ ڈیڑھ لاکھ روپے میں لکھ دیا تھا۔ دوسرے دن صبح کو یہ اپنی کوٹھی کے ایک ایک درخت سے مل کر خوب رویا اور پھر ریل کی پٹری کے پاس کھڑے ہوکر اس نے اپنی جان دے دی۔ آخر زمانے میں اس نے دوسری شادی کرلی تھی اور یہ بات مشہور ہے کہ دوسری بیوی اس سے برابر کہتی تھی کہ کارخانہ فروخت کرکے باہر چلو۔ اب یہ کارخانہ نواب فضل اللہ خاں صاحب کی ریاست کے پاس ہے اور کورٹ آف وارڈز کے زیر انتظام ہے۔

(iii) **اسپارلنگ کا کارخانہ** جانسن کے بعد پرائیویٹ لوگوں میں دوسرا نام اسپارلنگ کا ہے۔ یہ بھی یورپین تھا اور پوسٹل ورکشاپ میں منیجر تھا۔ اسپارلنگ کا اس صنعت پر کوئی بڑا احسان نہیں ہے۔ اس نے صرف ایک تالا بنوایا اور اپنا تمام روپیہ صرف اسی ایک تالے سے پیدا کیا۔ پوسٹ آفس میں جو ایک انچ کا تالا استعمال ہوتا ہے، تھیلوں وغیرہ میں لگانے کے لئے وہ اسپارلنگ ہی کا ہے۔ اسپارلنگ بہت روپیہ چھوڑ کر مر گیا۔ اس کی میم بابو منالال کے ذریعے سے کاروبار چلاتی رہی۔ اس کی لڑکی انسپکٹر جنرل پولیس کی بیوی ہے۔ اس نے صرف ۲۳ ہزار میں بابو منالال کے ہاتھ عمارت اور پورا کاروبار فروخت کردیا۔ اسپارلنگ چونکہ پوسٹل ورکشاپ میں منیجر تھا، اس لئے وہاں کے اثر ورسوخ سے اس نے یہ کارخانہ قائم کیا تھا۔ اس کا تالے صنعت پر کوئی خاص احسان نہیں ہے۔

(iv) **استاد حسین بخش و رفیع الدین صاحبان** استاد حسین جانسن کے یہاں ملازم تھے۔ بٹن کے کام کو

سیکھ کر جب نکلے تو انھوں نے شہر میں اس کو بہت پھیلایا۔ شہر میں جو لوگ کام کر رہے ہیں ان میں ۹۵ فی صدی سے زیادہ اُن کے شاگرد ہیں۔ علیم اینڈ سنز کے کارخانے میں بھی یہ کام ان ہی کی وجہ سے رائج ہوا ہے۔ کیونکہ جب انھوں نے یہ کام چلایا تو ان کو ملازم رکھ لیا تھا۔ ۵۰ برس کی عمر ہے لیکن ابھی تک بالکل جوان معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے لڑکے نے بہت بڑا کارخانہ ضمیر آباد کے سامنے بنایا ہے۔

رفیع الدین صاحب علیم صاحب کے خالہ زاد بھائی اور بہنوئی ہیں۔ گیلوا نائزڈ کا تالہ معمولی قسم کا تھا اس کو اچھی صورت میں لانا اور اس کو ولایتی پالش کے مقابلے پر لانا ان ہی کا کام تھا۔ کسی وقت میں ان کا بہت اچھا کاروبار تھا، اور کاروبار میں ان کا دماغ بھی خوب چلتا تھا۔ انھوں نے کئی تالے نئے ایجاد کئے جن سے اب دوسرے لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ہندوستان کی چیزوں کو رواج میں پھیلانے کے سلسلے میں یہ سب سے بڑے کام کرنے والے تھے۔ ان کے پاس اشرفیاں تھیلیوں میں بند ہوکر ایڈوانس کی صورت میں آیا کرتی تھیں کسی کاروبار کرنے والے کو اتنی سہولتیں نہیں ملیں۔ لیکن بزنس کو کنٹرول نہیں کر سکے اس لئے نقصان ہوا۔ ان کے کارخانے میں علیم صاحب کا نام بھی ان کے نانا نے ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے علیم صاحب کو بھی ۱۴ ہزار کے نقصان کا بھگتان کرنا پڑا تھا۔

(۷) تالے والوں میں سرکار کے پسندیدہ ٹھیکے دار — ۱۹۲۶ء میں جب انڈین اسٹور پرچیز ڈیپارٹمنٹ قائم ہوا تو علی گڑھ پوسٹل ورکشاپ کا کام بہت محدود کر دیا گیا۔ اس کے پاس صرف ایک کام مہر بنانے کا رہ گیا اور باقی تمام کام ان ٹھیکہ داروں کے ذریعے جو ان کی فہرست میں پسندیدہ لوگوں میں درج کئے گئے لیا جانے لگا اور یہی صورت ابھی تک جاری ہے۔ علی گڑھ کا میٹل ورکنگ اسکول بھی ۱۹۲۶ء میں قائم کیا گیا۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے گورنمنٹ نے اسٹور پرچیز ڈپارٹمنٹ اور فوجی محکمے کے ڈائرکٹر آف کنٹریکٹس دونوں کو توڑ کر اور ملا کر چیف کنٹرولر آف سپلائی پرچیز کا فوجی عہدہ قائم

کیا اور اسی نام سے اب کاروبار ہو رہا ہے۔

انڈین اسٹور پرچیز نے کام خوب کیا۔ اس کے سرکل بنے ہوئے تھے۔ اس کی طرف سے انگریز مقرر ہوتے تھے۔ بڑا دفتر تھا اور نہایت عمدہ اور معقول افسر ہوتے تھے جو صنعت کے بہت ہمدرد ہوتے تھے۔ یہ محکمہ جیلوں اور گورنمنٹ کے اور سارے محکموں کی ضرورتوں کو پورا کیا کرتا تھا۔ صرف فوجی محکمہ ایسا رہ گیا تھا جو اس کی معرفت چیزیں نہیں خریدتا تھا، بلکہ ڈائرکٹر آف کنٹریکٹس آرمی ہیڈکوارٹرز کی معرفت سامان حاصل کرتا تھا۔

انڈین اسٹور پرچیز کے پسندیدہ ٹھیکہ داروں میں علی گڑھ کے تالے وغیرہ کا کام کرنے والوں میں ۱۳ حسب ذیل فرمیں تھیں۔

۱۔ جے ایچ جانسن اینڈ کو، علی گڑھ
۲۔ انڈسٹریل فیکٹری اینڈ لاک ورکس "
۳۔ ڈائمنڈ جبلی لاک ورکس "
۴۔ اسپارلنگ پٹینٹ لاک ورکس "
۵۔ عبدالعلیم اینڈ سنز "
۶۔ ایس ایس ڈی برادرز بالائے قلعہ "
۷۔ ایس وزیرالدین اینڈ سنز گوریا باغ۔ علی گڑھ
۸۔ الائنس لاک ورکس "
۹۔ پنڈت ہیرا لال جی "
۱۰۔ ہردلو پٹینٹ لاک ورکس "
۱۱۔ ڈے اے اینڈ سنز "
۱۲۔ پنڈت مصرلال جی "
۱۳۔ ٹیکارام اتم چند۔ علی گڑھ

ڈائرکٹر آف کنٹریکٹس آرمی ہیڈکوارٹرز کے نزدیک صرف پانچ حسب ذیل فرمیں پسندیدہ تھیں:۔

(۱) جے ایچ جانسن علی گڑھ
(۲) اسپارلنگ "
(۳) عبدالعلیم اینڈ سنز علی گڑھ
(۴) ڈائمنڈ جبلی "
(۵) انڈسٹریل لاک فیکٹری اینڈ آئرن ورکس

غرض صرف اوپر کی فرمیں گورنمنٹ کے ساتھ کام کرتی تھیں اور باہر کے دکاندار

کچا مال سپلائی کیا کرتی تھیں۔

میری تحقیقات کے زمانے میں جو فرم چیف کنٹرولر آف سپلائیز کو بڑے پیمانے پر لڑائی کا سامان تیار کرکے بھیج رہی تھیں اور جن کے کام کی تمام شہر میں دھوم مچی ہوئی تھی وہ دو تھیں۔ اول نمبر پر عبدالعلیم اینڈ سنز اور ان کے بعد انڈین اپلیمنٹ ورکس کا نمبر تھا۔ موخرالذکر کے مالک موہن لال بیرسٹر کھتری محلہ نورنگ آباد تھے۔ ان کے لڑکے بھی وکیل ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جنگ سے پہلے ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی لیکن برس ڈیڑھ برس کے اندر عام طور پر یہ مشہور ہے کہ انھوں نے آٹھ، نو لاکھ روپیہ کما لیا۔ انھوں نے بڑے نئے طریقے سے کام شروع کیا۔ انھیں اور اُن کے لڑکے کو گورنمنٹ سے پانچ سو، سات سو روپے تنخواہ ملتی ہے۔ ان کے سارے اسٹاف کو بھی تنخواہ ملتی ہے۔ مال کی سپلائی پر ۱۰ فی صدی منافع ملتا ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اس مقررہ نرخ کے مقابلے میں ان کو ۲۵ فی صدی منافع پڑ جاتا ہے۔ ان کے یہاں دو لاکھ کا کام مہینے میں ہو جاتا ہے۔ خود موہن لال صاحب سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کے یہاں ایک ہزار مزدور کام کرتے ہیں۔ مزدور سب علی گڑھ کے ہیں۔ جمعدار مزدوروں کی فراہمی کا ذمہ لیتا ہے۔ یہ اپنا سب مال اپنے ہی کارخانے میں تیار کراتے ہیں۔ ذیلی ٹھیکے داروں سے کام نہیں کراتے۔ کچا مال یعنی لوٹا پھوٹا پیتل (اسکریپ) کانپور، آگرہ اور ڈھاکہ سے آتا ہے۔

ان دو فرموں کے علاوہ سرکاری ٹھیکے دار کی حیثیت سے باقی اور دوسرے تمام فرموں کا کام دوسرے درجے پر تھا، البتہ سرکاری ضرورت کے لئے تالوں کے مہیا کرنے کا کام تقریباً سارے کا سارا گورنمنٹ مٹل ورکنگ اسکول کی معرفت انجام پا رہا تھا۔ اس کے افسران اپنی ذاتی انتظام ونگرانی میں بھی تالے تیار کراتے تھے۔ بڑے کارخانہ داروں کو بھی آرڈر دیتے تھے اور چھوٹے کارخانہ داروں اور کاریگروں کو بھی آرڈر دیتے تھے اور انھیں ضروری کچا مال بھی مہیا کرتے تھے۔

(باقی)

نئے علی گڑھ کے مکانوں کا جائزہ

اگر ای آئی آر لائن کو خط تقسیم قرار دیا جائے تو علی گڑھ شہر کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے ایک جنوب مغربی حصہ جس میں پرانا شہر ہے اور دوسرا شمالی مشرقی حصہ جس میں نیا شہر ہے جسے تین مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے، سول لائن، چھاونی، اور یونیورسٹی ٹاؤن۔ ذرا غور کرنے سے یہ بات فوراً معلوم ہو جاتی ہے کہ ناموں کا یہ اختلاف ایک حقیقی فرق کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ شہر علی گڑھ کی ساری نئی آبادی ہم آہنگ اور یکساں نوعیت کی نہیں ہے بلکہ تین مختلف عناصر پر مشتمل ہے، پہلا عنصر علی گڑھ کے خوش حال اور کامیاب لوگوں پر مشتمل ہے جو پرانے شہر سے دور ایک نئی اور زیادہ ترقی یافتہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرا عنصر سرکاری عہدہ داروں اور پولیس کے لوگوں کا ہے جن کا شہر کی زندگی سے محض ایک سرکاری تعلق ہے اور اس میں دیوانی، کلکٹری اور ریلوے کے عہدہ دار اور پولیس لائن کے لوگوں کو شامل کیا جا سکتا ہے، تیسرے عنصر کا علی گڑھ کی شہری زندگی سے کوئی راست تعلق نہیں ہے ان کا حقیقی تعلق مسلم یونیورسٹی سے ہے چونکہ مسلم یونیورسٹی کا مستقر علی گڑھ ہے اس لئے یہ لوگ علی گڑھ میں رہتے ہیں۔ شہر میں اجنبیوں اور غیروں کی طرح جاتے ہیں اور ضرورت کے سامان لے کر چلے آتے ہیں۔ اگر یہ سامان یونیورسٹی میں ملنے لگیں تو انھیں شہر جانے کی کوئی خواہش نہ ہوگی۔ اس میں شک نہیں اس آبادی کے ایک حصے نے یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔ اور اپنے ذاتی مکانات بنا لئے ہیں۔ لیکن زیادہ تر حصہ ایسا ہی ہے جن کا قیام غیر مستقل رہتا ہے اور جن لوگوں کی یہاں مستقل سکونت ہے انھوں نے بھی اپنی دنیا الگ رکھی ہے جس پر شہر علی گڑھ کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ ہم مندرجہ بالا تقسیم کو سامنے رکھتے ہوئے علی گڑھ شہر کی نئی آبادی کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ علی گڑھ کے کامیاب لوگوں کے مکانات | اتر دلی روڈ کے مکانات کو اس قسم کے مکانوں کا خالص

سمجھنا چاہیے۔ یہاں علی گڑھ کے کامیاب تاجروں، ساہوکاروں، زمینداروں، سرکاری ملازموں اور وکیلوں نے مکان بنائے ہیں۔ یہ مکان تقریباً تمام تر ہندوؤں کے قبضے میں ہیں۔ ان میں زیادہ مکان تو وہ ہیں جو شہر جیسے محلے بسا کر تعمیر کئے گئے ہیں۔ لیکن شہر کے مقابلے میں زیادہ کشادہ، ہموار اور باترتیب ہیں۔ علی گڑھ سے اتر دلی جانے والی سڑک پر ای، آئی، آر لائن کو عبور کرنے کے بعد دائیں ہاتھ پر بیکنٹھ نگر، سداما پوری، وشنو پوری اور نور رتن پوری اور بائیں ہاتھ پر پریم نگر اور شیام نگر کی بستیاں ملتی ہیں جو شہر کے محلوں سے بس تھوڑی ہی سی مختلف ہیں۔ ان بستیوں میں دوکانیں بھی ہیں، بازار بھی ہیں، کارخانے بھی ہیں۔ مکان پاس پاس ہیں اور تقریباً شہر کی وضع قطع کے ہیں۔ گو شہر کے مقابلے میں کچھ زیادہ صاف اور باترتیب ہیں۔ اس سڑک پر آگے چل کر البتہ کچھ کوٹھیاں ملتی ہیں۔ لیکن نواب سمیع اللہ خاں کی کوٹھی کو چھوڑ کر باقی سب کے مالک اور قابض ہندو ہیں، دائیں ہاتھ پر مکانوں، بنگلوں اور کوٹھیوں کے علاوہ ٹیکا رام گرلز اسکول اور پبلک موہن اسپتال کی بلڈنگس بھی ہیں۔ اسی طرح بائیں ہاتھ پر کوٹھیوں، بنگلوں اور باغوں کے علاوہ دی لائنس لاک ورکس (تالے کا کارخانہ) اور برف کا کارخانہ بھی ہیں۔ نئی بستیوں کے مکانوں کے علاوہ صرف کوٹھیاں پندرہ کے قریب ہوں گی جن میں ایک مسلمان کی تھی، جو اُجڑی ہوئی سی نظر آتی تھی۔ سب کوٹھیاں دس ہزار سے کم لاگت کی معلوم ہوتی تھیں۔

<u>ملے جلے مکانات</u> | ان کے نمونے میرس روڈ، ڈاک بنگلہ روڈ، ڈگی والی سڑک، دودھ پور والی سڑک، جیپرت کی سڑک اور جانسن کے کارخانہ والی سڑک پر نظر آئے۔ ان مقامات پر یونیورسٹی کے لوگوں، ضلع کے زمینداروں، شہر کے وکیلوں، ساہوکاروں اور دولتمند لوگوں کے مکانات اور ریلوے کوارٹرز باہم ملے جلے نظر آئے۔ ان مکانوں میں میرس روڈ کے تقریباً تمام مکان اول درجے کے تھے اور دوسری سڑکوں کے مکان اول اور دوم دونوں درجوں کے تھے۔

میرس روڈ کے مکانوں میں تعداد کے لحاظ سے تقریباً آدھے مکان ہندوؤں اور

ادھے مسلمانوں کے تھے۔ لیکن مالیت کے لحاظ سے مسلمانوں کے مکان بہت بڑھتے ہوئے تھے کیونکہ ہندوؤں کا غالباً کوئی مکان بیس ہزار سے زیادہ مالیت کا نہیں تھا اور مسلمانوں کے بہت سے مکان بیس ہزار تا لاکھ ڈیڑھ کی مالیت کے تھے۔ اس سڑک کے تمام وہ مکان جن کی حیثیت دس ہزار سے اوپر ہے تقریباً چالیس کے قریب ہیں۔

ڈاک بنگلہ روڈ پر مسلمانوں کا کوئی مکان نہیں ہے۔ یہاں ایک احاطہ میں کئی مکان ہیں۔ ہر مکان کو اگر علیحدہ شمار کیا جائے تو غالباً دس ہزار سے زیادہ حیثیت کا ایک مکان بھی نہیں نکلے گا۔ اس سڑک کے کل مکانوں کی تعداد بیس کے قریب ہوگی۔

ڈگی والی سڑک پر کسی ہندو کا مکان نہیں ہے۔ یہاں بھی ایک احاطے میں کئی کئی مکان ہیں اور مکانوں کی مالیت دس ہزار سے کم ہے، کل تعداد بیس کے قریب ہوگی۔

دودھ والی سڑک پر سوائے موضع دودھ پور کے کم حیثیت مکانوں کے کسی ہندو کا کوئی مکان نہیں ہے لیکن مسلمانوں کے مکان بہت بڑی مالیت کے ہیں۔

چھیرت کی سڑک پر تین چار ہندو ٹرسٹ کی کوٹھیوں کے سوا کوئی ہندو مکان نہیں ہے مگر گلزاری لال ٹرسٹ کی دو کوٹھیاں زیادہ مالیات کی ہیں۔ مسلمانوں کے سب مکان زیادہ مالیت کے ہیں۔ کچہری تا قلعہ کی سڑک پر سوائے دو تین ہندو مکانوں کے کسی ہندو کا مکان نہیں ہے۔ جانسن کے کارخانے والی سڑک پر بھی سوائے چار پانچ ہندو مکانوں کے کسی ہندو کا مکان نہیں ہے۔ جانسن کی بنوائی ہوئی کوٹھیوں کی مالیت جواب منزل اللہ خاں کے وارثوں کے قبضے میں ہے زیادہ ہے۔

عنوان نمبر ۲ کے کل مکانوں کا اگر شمار کیا جائے تو تقریباً سو کوٹھیوں میں سے ۳۰،۲۵ کوٹھیاں ہندوؤں کی نکلیں گی۔ لیکن ان کی مالیت مسلمانوں کی کوٹھیوں کے مقابلے میں صرف دس فی صدی ہوگی۔

۳۔ <u>یونیورسٹی ٹاؤن کے مکانات</u>۔ اس میں مسلم یونیورسٹی (جانب شرق) کی زمینوں پر تعمیر کئے ہوئے

جملہ مکانات موضع بھمولا کے پاس اور آر آر لائن کے قریب کے مکانات اور وقف عبدالرحمن کی زمینوں پر تعمیر کئے ہوئے مکانات شامل کئے جاسکتے ہیں - اس میں زیادہ تر اول اور کم تر دوم درجے کے مکانات ہیں- ان میں سے زیادہ تر دس ہزار سے زیادہ مالیت کے مکان ہیں یہ مسلم یونیورسٹی کے اسٹاف کے لوگوں نے بنائے ہیں یا ان لوگوں نے بنائے ہیں جو اپنی ملازمتوں سے پنشن لینے کے بعد اپنی اولاد کی تعلیم کی خاطر علی گڑھ میں بس گئے - ان کوٹھیوں کی تعداد بھی تقریباً سو کے قریب ہوتی ہے -

چنانچہ علی گڑھ کے نئے شہر کی محض کوٹھیوں اور بنگلوں کا اگر شمار کیا جائے اور اس میں ہندو اور مسلمانوں کا تناسب دیکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ہندوؤں کے پاس تعداد کے لحاظ سے تقریباً ۱۵ فی صدی اور مالیت کے لحاظ سے پانچ فی صدی کوٹھیاں اور بنگلے ہیں- مسلمانوں کی یہ کوٹھیاں ابھی تک قرض کے چکر میں نہیں پھنسی ہیں، تین چار کوٹھیوں کے بارے میں یہ بیان کیا گیا کہ وہ خیالی رام جاپان والوں کے یہاں جو سکنا کی جائداد پر روپیہ قرض دیتے ہیں اور میرس روڈ پر کئی کوٹھیوں کے مالک ہیں، رہن رکھی گئی تھیں لیکن اب کہا جاتا ہے کہ وہ بھی قرض کے بار سے سبکدوش ہوگئی ہیں- ان کوٹھیوں کا انجام آئندہ کیا ہوگا اس کا انحصار نئی نسل پر ہے- اگر موجودہ نسل کے لوگوں کی اولاد لائق ثابت ہوئی اور اتنا کما سکی کہ جس سے اس بلند معیار کو جو کوٹھیوں میں رہنے سے لازماً اختیار کرنا پڑتا ہے پورا کر سکی تب تو یہ جائداد ان کے پاس یا ان کے ہم مذہب مسلمانوں کے پاس ان کا پہنچنا لازمی ہو جائے گا -

مسلم یونیورسٹی ٹاؤن مسلمانوں کی ایک نہایت ستھری اور پاکیزہ آبادی بن سکتی ہے - جنگ نے اس کی ترقی میں فی الحال رکاوٹ ڈال دی ہے، لیکن جنگ کے خاتمہ پر امید ہے کہ یہ آبادی اور زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی کرے گی اس کی جماعتی زندگی کو مسلم یونیورسٹی کی سیاست اور ہندوستان کی سیاست سے علیحدہ رکھ کر

منظم کیا جا سکے تو شاید مسلمانانِ ہند کی معاشرتی اور تمدنی اور ترقی کا کام بہت کامیابی کے ساتھ انجام دے سکے گی۔ کیا وہ لوگ جو اس آبادی میں رہتے ہیں اپنے مواقع اور اپنی ذمے داریوں سے واقف ہیں۔

کتب موصولہ پر ایک نظر

ہندوستان کی معیشت اور جنگ

از محمد احمد خاں صاحب بی اے ایل ایل بی علیگ ۔ متوسط تقطیع، عمدہ جلد، اور گردپوش، کتابت، طباعت دیدہ زیب، صفحات ۲۹۶۔ قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ :۔ ادارۂ معاشیات، فاطمہ منزل، حمایت نگر، حیدرآباد دکن ۔

معاشی تالیفات کے سلسلے میں مولوی محمد احمد خاں صاحب اچھا نام پیدا کر چکے ہیں۔ اُن کی زیر نظر کتاب ایک نہایت کامیاب علمی کوشش ہے۔ اس میں ہندوستانی معیشت کے مختلف پہلوؤں پر، جنگ کے جو اثرات ہوئے ہیں، ان کا تجزیہ تازہ ترین اعداد و شمار کی روشنی میں کیا گیا ہے اور مشکل سے مشکل مفہوم کو اس طرح عام پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر پڑھا لکھا شخص اسے بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ کتاب کے نو باب ہیں جن میں جنگ کے زمانے میں ہندوستان کی زراعت، صنعت، تجارت خارجہ، وسائل نقل وحمل، زر، بنک، مالیات، قومی قرضہ کی جو کیفیت رہی ہے اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور آخری باب میں جنگ کے بعد ہندوستان کے جو معاشی مسائل ہوں گے ان کی وضاحت کی گئی ہے ۔ ہر موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ انھوں نے شستہ زبان اور شگفتہ انداز میں ایسا پیش کیا ہے جو آسانی سے کسی انگریزی کتاب میں بھی نہیں ملتا ۔

ہندوستانی معاشیات کے مبادی

از شرف الدین صاحب بی۔ اے ۔ بڑی تقطیع، غیر مجلد، کتابت، طباعت اچھی صفحات ۲۵۰۔ قیمت دو روپے ۔ ملنے کا پتہ :۔ دفتر طیلسانین، عثمانیہ باغ عامہ، حیدرآباد دکن ۔

اردو زبان میں معاسیات ہند کے موضوع پر بہت کم کتابیں موجود ہیں۔ شرف الدین صاحب نے اس کتاب کو تیار کرکے ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اس کتاب میں برطانوی ہند کے علاوہ مملکت آصفیہ کی معاشی زندگی سے متعلق بھی اجمالی حالات ایک جگہ جمع کردئے گئے ہیں۔ کتاب کی زبان سادہ اور عام فہم ہے، اُمید ہے کہ اردو داں طبقہ کے لئے عموماً اور معاشیات کے طلبار کے لئے خصوصاً یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔

نادراتِ شاہی

مرتبہ امتیاز علی خاں صاحب عرشی، بڑی تقطیع، خوب صورت جلد ٹائپ کی نہایت پاکیزہ طباعت بہت عمدہ کاغذ، صفحات ۲۴۲۔ قیمت درج نہیں۔

یہ شاہ عالم ثانی کے اردو، فارسی اور ہندی کلام کا مجموعہ ہے جو بادشاہ کے حکم سے ۱۱۹۷ھ میں مرتب کیا گیا تھا۔ اسے تصحیح کے بعد عرشی صاحب نے سلسلۂ مطبوعات کتاب خانہ عالیہ ریاست رامپور کے ماتحت حسب الحکم نواب صاحب ریاست رامپور شائع کیا ہے۔ اس کے لئے بشیر حسین صاحب زیدی چیف منسٹر نے تقریب لکھی ہے اور خود عرشی صاحب نے ۶۴ صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے۔ متن کتاب کو اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں لکھا گیا ہے اور کتاب کے آخر میں اشاریہ دیا گیا ہے جسے حسب ذیل موضوع پر تقسیم کیا گیا ہے، اشخاص و مقامات، آتش بازی و روشنی، پھول پھل، ساز اور رسمیں۔ یہ کتاب زبان اردو کے مؤرخوں اور محققوں کے لئے ایک بیش قیمت ماخذ ثابت ہوگی۔

دی مسلم لیگ

از ولفورڈ کانٹ اسمتھ، چھوٹی تقطیع صفحات ۷۰۔ بزبان انگریزی، طباعت اچھی، قیمت دو روپے، ناشر:- دی منروا ورکشاپ، لاہور۔

ولفورڈ اسمتھ نے اپنی کتاب "دی ماڈرن اسلام ان انڈیا" کو لکھ کر پڑھے لکھے مسلمانوں میں اور خاص طور پر ہندوستانیوں میں عام طور پر خاصی شہرت حاصل کرلی ہے مصنف موصوف کا اسلامی ہند کے بارے میں مطالعہ بہت اچھا ہے۔ یہ فورمن کرسچین کالج لاہور میں تاریخ اسلام کے لکچرر اور علی گڑھ کے ہنری مارٹن اسکول آف اسلامک اسٹڈیز کے رفیق خارجی ہیں۔ موصوف اشتراکی عقیدہ رکھتے ہیں اور اسی نقطۂ نگاہ سے انھوں نے اسلامی تحریک کا مطالعہ کیا ہے اپنی پہلی کتاب میں مسلم لیگ کو انھوں نے ایک رجعت پسند تحریک ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن زیر نظر رسالہ میں اُن کا نظریہ تبدیل ہوگیا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے تجزیہ حالات سے انھیں پورا اتفاق ہے، ان کی اس کتاب میں کوئی ندرت اور جدت نہیں پائی جاتی، ان تمام باتوں کو جن کی کمیونسٹ اپنے پلیٹ فارم اور پریس کے ذریعے خوب اشاعت کرچکے ہیں۔ اس کتاب میں بھی دہرا دیا گیا ہے۔

اشتراکیت اور اسلام

از مسعود عالم صاحب ندوی، تقطیع متوسط، صفحات ۸۰، غیر مجلد، طباعت وکتابت رسالہ معارف جیسی۔ قیمت عہ

یہ مطبوعات دار المصنفین کے سلسلے کی اڑسٹھویں کتاب ہے، اس کتاب میں پہلی مرتبہ مذہب اسلام کے حامیوں کی طرف سے اشتراکیت کو معقولیت کے ساتھ سمجھ کر اسی پر تنقید کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس اعتبار سے یہ کوشش مستحق ستائش ہے۔ لیکن ابھی اس قسم کی اور بہت سی کوششیں کرنے کی ضرورت ہے جب ہی تمام تنقیح طلب امور پوری طرح روشنی میں آسکیں گے اور مقابلہ اور مباحثے کے لئے ایک مشترکہ میدان تیار ہوسکے گا۔ اب تک مناظرہ کی صورت یہ رہی ہے کہ فریق مخالف کی طرف من ملنے خیالات وعقائد واعمال منسوب کئے جاتے رہے ہیں اور انھی کی بنیاد پر

صفائی اور مدافعت کا موقع دئے بغیر اس کے خلاف فیصلے صادر کئے جا رہے ہیں۔
اپنے مخصوص حلقہ اور گروہ میں یہ چیز چاہے کتنی ہی دل خوش کن اور اطمینان بخش
کیوں نہ نظر آتی ہو لیکن اس حلقے سے باہر یہ طریقہ مضحک اور ناقابل اعتنا سمجھا جاتا رہا ہے
اس لئے ہم مسعود عالم صاحب ندوی کی اس کوشش کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید
کرتے ہیں کہ خود وہ اور دیگر حضرات اشتراکیت کا اور زیادہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ
فرمائیں گے اور اسلام کے ساتھ اس کا جو بنیادی اختلاف یا مشابہت ہے اس کی وضاحت
کرتے رہیں گے تاکہ عامۃ المسلمین کی صحیح رہنمائی کی جا سکے۔

علماء اور اسلام

از مظہر الدین صاحب صدیقی، چھوٹی تقطیع، غیر مجلد قیمت ۱۲ ار، صفحات ۸۲
ناشر:۔ دارالاشاعت نشاۃ الثانیہ جدید، نامپلی، حیدرآباد دکن۔

یہ مولوی منظہر الدین صاحب کے رسالہ "علمائے کرام کا مستقبل" کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اسے مصنف نے بعض اجزاء کو حذف کرکے نئے اضافوں اور ترمیموں کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے۔ رسالے کے اول ایڈیشن پر رسالہ جامعہ میں تنقید کی جا چکی ہے۔ زیر نظر رسالہ میں مصنف کا نظریہ یہ ہے کہ موجودہ قومی اور بین الاقوامی تحریکات میں صرف اسلام اور اشتراکیت دو ایسی تحریکیں ہیں جو انسانیت کے عالمگیر امراض و مصائب کا علاج پیش کرتی ہیں اور مقامی یا قومی وطن پرستی سے مبرا ہیں۔ یہی دو مقابل اصول زندگی ہیں جن کی کشمکش پر بالآخر دنیا کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ لیکن اشتراکی تحریک کو جس خلوص اور جوش کے ساتھ قبول کیا گیا اور اس کے عملی نفاذ کی غرض سے اس کے پیرووں نے جو قربانیاں اور سرفروشیاں کیں اس کی مثال موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں نہیں ملتی ہیں۔ اس لئے مصنف کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے علماء بھی اگر اسلام کو اسی جوش و خروش خلوص اور اسی صداقت پسندی کے ساتھ لے کر اٹھیں اور اسے عبادات و ریاضیات کا ایک مجموعہ قرار دینے کی جگہ انسان کی اجتماعی فلاح اور تہذیبی ترقی کے ایک نظریے کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کریں تو یقیناً وہ اشتراکی تحریک کے مقابلے میں بہت جلد اسے کامیاب کرسکتے ہیں۔

۱۔ اسلام کا سیاسی نظریہ اور فلاح عالم
۲۔ اسلامی نظام

از حکیم محمد اسحٰق صاحب سندھیلوی۔ چھوٹی تقطیع۔ غیر مجلد۔ قیمت ہر دو آٹھ آنے

ناشر دار الاشاعت نشاۃ الثانیہ جدید نامپلی، حیدرآباد دکن۔

یہ دونوں رسالے بھی موجودہ سیاسی و اجتماعی تحریک کے مقابلہ میں اسلامی نظام کی برتری ثابت کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں اور لائق مطالعہ ہیں۔

رسول اللہؐ مرتبہ مولانا ایوب صاحب اصلاحی، غیر مجلد، چھوٹی تقطیع صفحات ۱۲۸ قیمت عہ۔ ناشر موتمر المصنفین کوچہ چیلان بیت السعید، دہلی۔

یہ سلسلہ موتمر المصنفین کی چوتھی کتاب ہے۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر مگر

مستند سیرت پیش کی گئی ہے۔

اسلامی نظمیں | از مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر۔ چھوٹی تقطیع۔ غیر مجلد صفحات ۲۷، ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

نیر صاحب نے بچوں کے شاعر کی حیثیت سے جو شہرت حاصل کی ہے وہ محتاج تعارف نہیں ہے۔ اس مجموعے میں اسلامی تعلیمات کو بچوں کے دل میں بٹھانے کے لئے جو نظمیں مختلف اوقات میں لکھی گئی تھیں ان کو یک جا کر دیا گیا ہے۔

۱۔ نئی کہانیاں ۲۔ گھی شکر | از جناب مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر۔ تقطیع کاپی سائز، ضخامت علی الترتیب ۴۴، ۴۵ صفحات، خوش نما ٹائٹل قیمت ہر دو نو ۲ آنے

ملنے کا پتہ ←———— مکتبہ جامعہ دہلی

نیر صاحب کی نظموں کے یہ دو تازہ مجموعے سات، آٹھ سال کی عمر کے بچوں کے لئے جنھوں نے اردو پڑھنا نیا نیا سیکھا ہو۔ بہت مفید ثابت ہوں گے، ان سے نہ صرف ان کی معلومات بڑھیں گی۔ ان کے اندر سوچ بچار کی عادت پیدا ہوگی۔ اظہار بیان پر قدرت حاصل ہوگی، بلکہ اپنے گرد و پیش کی اشیاء سے دلچسپی لینے کا بھی شوق پیدا ہوگا۔

موج نیل | مترجمہ قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی۔ چھوٹی تقطیع، عمدہ جلد اور گرد پوش، اچھی کتابت و طباعت، صفحات ۱۷۰۔ قیمت ۳؎ ناشر مکتبہ علمیہ قاضی واڑہ میرٹھ

یہ سلسلہ سید مصطفےٰ لطفی المنفلوطی کے عربی افسانوں اور افسانوی مضامین کا ترجمہ ہے جو سجاد صاحب میرٹھی نے نہایت خوبی کے ساتھ انجام کو پہنچایا ہے۔ شروع میں مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کا مقدمہ ہے۔ منفلوطی کو علامہ جمال الدین افغانی اور علامہ عبدہٗ کے فیض صحبت سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملا تھا، اس لئے دینی، اجتماعی اور اخلاقی مسائل میں اس کی نظر بہت گہری اور اس کی ہمدردیاں بہت وسیع ہو گئی تھیں۔ منفلوطی کا دل اپنے وطن مصر کی غلامی پر ہمیشہ سوگوار رہا، اور وہ اس کی آزادی کے لئے مساعی رہا۔ فکر و نظر کی ان

بلندیوں کے ساتھ افسانہ نگاری اور انشاء پردازی کے فن میں بھی اس کو کمال حاصل تھا۔ سعد زاغلول پاشا مرحوم منفلوطی سے کہا کرتے تھے۔ آپ کے مضامین کے آئینے میں جو عظیم شخصیت جلوہ گر ہے کاش اس کی جھلک دوسرے اہل قلم کی تحریروں میں بھی نظر آتی! اس پایہ کے ادیب کے لئے ایک قابل مترجم کی ضرورت تھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ سجاد صاحب میرٹھی نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ کسی جگہ یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کسی دوسری زبان کا ترجمہ پڑھا جا رہا ہے بلکہ اپنی زبان کا مٹھاس، زور، محاورہ فصاحت اور شوکت ہر جگہ فراوانی کے ساتھ جلوہ ریز نظر آتی ہے "عذاب" اور "نقاب اٹھ جانے کے بعد" خصوصیت کے ساتھ ایسے افسانے ہیں جن کی نظیر اردو ادب پیش نہیں کر سکتا اور مترجم نے واقعی ان کے ترجمے میں اپنا پورا کمال دکھلا دیا ہے۔

سُرخ افسانے | مترجمہ اسرار احمد صاحب آزاد، چھوٹی تقطیع، عمدہ جلد، مصور ٹائٹل اور گرد پوش، اچھی کتابت و طباعت صفحات ۲۰۸ قیمت تین روپے۔

ناشر:۔ نیا کتاب گھر اردو بازار، دہلی۔

اس مجموعے میں مختلف ہم عصر روسی افسانہ نگاروں کے انیس افسانوں کو یکجا کر دیا گیا ہے ان سب کا موضوع موجودہ جنگ ہے۔ اور ان کا مقصد دشمن کے خلاف نفرت کے جذبات کو برانگیختہ کرنا اور ملک کے لوگوں میں دلیری، ثابت قدمی، جان نثاری اور باہمی یگانگت اور محبت کو ترقی دینا ہے۔ ادب برائے ادب کے حامیوں کو یہ افسانے محض وقتی پروپگنڈا نظر آئیں گے جن کا زندگی کی ابدی قدروں سے کوئی رابطہ نہیں ہے، اور وہ پیشانی پر بل ڈال کر اس کتاب کو ردی کی ٹوکری میں پھینکنا چاہیں گے۔ لیکن اس کے باوجود افسانہ نگاروں نے اپنا محدود کام زبان کی سلاست اور شگفتگی کو اچھی طرح قائم رکھا ہے اور افسانوں کے انتخاب میں جس اصول کو پیش نظر رکھا ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں حسب ذیل طریقے پر بیان کیا جا سکتا ہے "ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ افسانہ کے نام سے اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے یا لکھا جا رہا ہے اس کا کوئی مدعا، مقصد اور مفہوم نہیں لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے ہمیشہ وہی افسانے پسند آئے جن کا مطالعہ ہمیں مجنوں منفعت اور ادبی لطافت

بنانے کی جگہ ہمارے قلوب میں ہمت، امنگ اور دلبری پیدا کرتا ہو، ہماری معاشرتی اور اخلاقی کمزوریاں اور برائیوں کی اصلاح پر توجہ دلاتا ہو، نیک مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے ایثار اور سرفروشی کا سبق سکھاتا ہو اور زندہ رہنے کے لئے ہمارے دل میں خود ملک الموت سے ٹکرا جانے کا جذبہ پیدا کرسکتا ہو" جن لوگوں کو مترجم کے اس نظریہ سے اتفاق ہے ان کے لئے یہ افسانے دلچسپی کا باعث ہوں گے ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ "یہ ان لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں جنھوں نے اشتراکی تہذیب کے سایہ میں پرورش پائی ہے"

صبح انقلاب تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۴۸ صفحات ۔ مجلد، مصور اور رنگین گرد پوش ۔ کتابت اور طباعت اچھی اور قیمت فی جلد عہ

ملنے کا پتہ :۔ سید محمد زکریا صاحب صہبا، نند کشور لال روڈ ۔ گیا، صوبہ بہار

زیر نظر کتاب مولوی محمد عباس صاحب سر یہ کابری کے افکار کا نتیجہ ہے۔ آپ نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل کے شاگرد، متعدد علمی کتابوں کے مصنف، ایک معمر کہنہ مشق شاعر ہیں غزل گوئی میں آپ کافی شہرت حاصل کرچکے ہیں۔ صبح انقلاب آپ کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اور بقول حضرت رضا علی صاحب وحشت کلکتوی "اس مجموعہ میں کلام کی پختگی کے ساتھ ایک دلکش انداز بھی ہے جو نہایت درجہ جاذب ہے" صبح انقلاب کی نظمیں پانچ حصوں میں منقسم ہیں: "نشر حیات" اس حصہ میں ملک کے اہم معاشرتی مسائل یعنی غربی قحط، غلامی اور جنگ پر پچیس نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ "پیکر جذبات" کا حصہ بارہ رباعی نظموں پر مشتمل ہے۔ "حسن تخیلات" کا حصہ تیرہ متفکرانہ نظموں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ اسلامیات کے ذیل میں آٹھ اور سیاسیات کے سلسلے میں تین بلند پایہ نظمیں ہیں۔ آپ نے ہر عنوان پر بڑی کامیابی سے طبع آزمائی فرمائی ہے۔ ملک کو ایسی ہی نظموں کی ضرورت ہے ہمیں یقین ہے کہ ہماری زبان کے شاعرانہ ادب میں صبح انقلاب بلند جگہ پائے گی۔

اشاعت کتب کے سلسلے میں صوبۂ بہار کو ابھی تک وہ آسانیاں حاصل نہیں ہیں جو شمالی ہند کے دوسرے صوبوں کو حاصل ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بزرگان بہار کے اکثر کارنامے تذر تغافل رہتے ہیں

ضرورت ہو کہ ان کارناموں کی ملک میں اشاعت ہو۔ یہ امر نہ صرف ترقی ادب کے لئے نیک فال ہوگا بلکہ جو حضرات ادبی مساعی میں سرگرم ہیں ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی۔ اس نقطۂ نظر سے بھی ضرورت ہے کہ نہ صرف اہل بہار بلکہ اہل ملک اس مجموعے کی قدر کریں۔

رسالہ نئی زندگی، الہ آباد سان فرانسسکو نمبر اگست ۱۹۴۵ء۔ ایڈیٹر سید انیس الرحمن۔

اس نمبر میں سان فرانسسکو کانفرنس سے متعلق نہایت عمدہ مضامین جمع کئے گئے ہیں مضامین کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں بین الاقوامی تنظیم کی تاریخ، جمعیتہ الاقوام اور اس کے زوال کی کہانی، واقعات عالم کی زبانی پیش کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں سان فرانسسکو کی شروعات ڈمبرٹن اوکس کے منصوبے اور تجویزیں، بین الاقوامی تنظیم اور بین الاقوامی مجلس امن کے بارے میں مضمون درج کئے گئے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر تارا چند اور پی سی جوشی کے مضامین خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ تیسرے باب میں سان فرانسسکو کانفرنس اور اس کے فیصلے اور چوتھے باب میں نیا نظام عالم اور ہندوستان پر مضامین درج کئے گئے ہیں۔ اور اخباروں کی راؤں کو نقل کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کوشش نہایت قابل تعریف اور مستحق مبارکباد ہے۔

رسالہ جدید اردو، کلکتہ بنگال نمبر ستمبر ۱۹۴۵ء۔ مدیر ساغر نظامی احسن صاحب قاضی و عبدالجلیل صاحب

عید کے موقع پر "جدید اردو" کا یہ تیسرا بنگال نمبر نکالا گیا ہے۔ اس کا مقصد بنگالہ میں اردو کی ترویج و ترقی ہے، رسالہ کو "مقالات"، "منظومات" اور "افسانے" "ڈرامے اور ادبی شہ پاروں کے عنوانوں کے ماتحت تقسیم کیا گیا ہے پہلے عنوان کے تحت نو مضامین اور دوسرے کے تحت انیس غزلیں و نظمیں اور تیسرے کے تحت گیارہ افسانے وغیرہ جمع کئے گئے ہیں۔ ملک کے مشہور مصنفوں نے اس کی تیاری میں شرکت کی ہے۔ رسالہ کی یہ ادبی خدمت مستحق تعریف ہے۔

رسالہ پریم، جموں کشمیر ایڈیٹر۔ گلزار احمد فدا اور اقبال تمنائی

جلد تین کے تین شمارے سامنے ہیں۔ اور تینوں اس رسالے کے بلند معیار کے شاہد ہیں۔ ملک کے مشہور مستند ادیبوں نے اپنے نتائج فکر سے رسالہ کو نوازا ہے اور یہ زبان اردو کی اچھی خدمت کر رہا ہے۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

حج سروس - کراچی و جدہ

جیساکہ حکومت ہند کے اعلامیہ میں جو ۲۶ر جولائی کو یا اس کے بعد بڑے بڑے انگریزی اور دیسی زبان کے اخبارات میں شائع ہوا تھا، حاجیوں کے جہاز کراچی سے جدہ کے لئے روانہ ہوں گے!

کرایہ اوّل درجہ

اوّل درجے کا کرایہ کراچی سے جدّہ اور واپسی مبلغ نوسَو (۹۰۰) روپے جس میں خوراک بھی شامل ہے، مگر جدہ کے محاصل، حفظانِ صحت، کشتی کا کرایہ اور کامران کے قرنطینہ فیس شامل نہیں ہے!

ڈک (تیسرا درجہ)

تیسرے درجے کا کرایہ کراچی سے جدہ کی آمد و رفت مع خوراک مبلغ دو سو پچاس (۲۵۰) روپے لیکن اس میں جدہ کے محاصل، حفظانِ صحت، کشتی کا کرایہ اور کامران کی قرنطینہ فیس شامل نہیں ہے!

مزید معلومات

حج بکنگ آفیسر کامن ویلتھ ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا نئی دہلی سے حاصل کیجئے

ٹرنر مارین اینڈ کمپنی لمیٹڈ
۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی

کراچی ایجنٹس
گراہمس ٹریڈنگ کمپنی (انڈیا) لمیٹڈ
میکلو روڈ، کراچی

مطبوعاتِ جامعہ

واردات منشی پریم چند ۱۲/۸
بیوہ " " " ۱۲/
انشار کی تعلیم مضمون نگاری پر ایک کتاب ۲/۸
تاریخ الامت حصہ ششم سلسلۂ تاریخ اسلام کی آخری کڑی اسلام اور تاریخ اسلام کے فلسفے پر ایک نظر۔ ۱۲/
بادشاہ میکیاولی کی شہرۂ آفاق کتاب "پرلنس" کا ترجمہ از ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب ۱۲/۸
عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی ۔ از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب اُستادِ قانون، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن ۸/

مکتبہ جامعہ دہلی

تعلیم و ترقی کی کتابیں

۴ر ۲۰۔ درس سبق ۴ر

۱۔ نماز ۴ر	۲۶۔ چار درویش چہارم ۴ر	۵۱۔ حالات قرآن مجید ۴ر	۷۶۔ امریکہ ۴ر
۲۔ حکایتیں اول ۴ر	۲۷۔ قصہ حاتم طائی اول ۴ر	۵۲۔ تعلیمات ۱ (عقائد) ۴ر	۷۷۔ جنوبی امریکہ ۴ر
۳۔ 〃 دوم ۴ر	۲۸۔ 〃 〃 دوم ۴ر	۵۳۔ 〃 ۲ (عبادات) ۴ر	۷۸۔ سرزمین ہند ۴ر
۴۔ حبیب خدا ۴ر	۲۹۔ 〃 〃 سوم ۴ر	۵۴۔ 〃 〃 (اخلاق) ۴ر	۷۹۔ صوبے ۴ر
۵۔ نظمیں ۴ر	۳۰۔ 〃 منصور موہنا ۴ر	۵۵۔ 〃 〃 معاملات ۴ر	۸۰۔ دیسی ریاستیں ۴ر
۶۔ میونسپلٹی ۴ر	۳۱۔ 〃 فردوس بریں ۴ر	۵۶۔ قصص قرآن مجید ۱ ۴ر	۸۱۔ داستان امیر حمزہ ۱ ۴ر
۷۔ صدیق اکبر ۴ر	۳۲۔ لیلیٰ مجنوں ۴ر	۵۷۔ 〃 〃 ۲ ۴ر	۸۲۔ 〃 〃 ۲ ۴ر
۸۔ خط کتابت ۴ر	۳۳۔ شکنتلا ۴ر	۵۸۔ کعبہ شریف ۴ر	۸۳۔ 〃 〃 ۳ ۴ر
۹۔ ضلع کا انتظام ۴ر	۳۴۔ تانگے والا ۴ر	۵۹۔ حدیث شریف ۴ر	۸۴۔ 〃 〃 ۴ ۴ر
۱۰۔ قومی گیت ۴ر	۳۵۔ بہشتی ۴ر	۶۰۔ عثمان غنی ۴ر	۸۵۔ 〃 〃 ۵ ۴ر
۱۱۔ غزلیں ۴ر	۳۶۔ صوبے کی حکومت ۴ر	۶۱۔ علی مرتضیٰ ۴ر	۸۶۔ کہاوتیں ۴ر
۱۲۔ ہمارا ہندوستان ۴ر	۳۷۔ حکومت ہند ۴ر	۶۲۔ صحابہ کرام ۱ ۴ر	۸۷۔ پہیلیاں ۴ر
۱۳۔ ماموں بھی پڑھنے لگے ۴ر	۳۸۔ جمہوریت ۴ر	۶۳۔ 〃 〃 ۲ ۴ر	۸۸۔ گرونانک ۴ر
۱۴۔ عمر فاروق ۴ر	۳۹۔ دوہے ۴ر	۶۴۔ 〃 〃 ۳ ۴ر	۸۹۔ مثنوی میر حسن ۴ر
۱۵۔ ڈسٹرکٹ بورڈ ۴ر	۴۰۔ دلچسپ شعر ۴ر	۶۵۔ 〃 〃 ۴ ۴ر	۹۰۔ گلستان ۴ر
۱۶۔ شہید کربلا ۴ر	۴۱۔ مرثیے ۴ر	۶۶۔ 〃 〃 ۵ ۴ر	۹۱۔ احمد خاں دکاندار ۴ر
۱۷۔ ہماری دنیا ۴ر	۴۲۔ مسدس حالی ۴ر	۶۷۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ۴ر	۹۲۔ عبدالرحمٰن راج ۴ر
۱۸۔ ایشیا ۴ر	۴۳۔ حالی کی نظمیں ۴ر	۶۸۔ حضرت غوث پاک ۴ر	۹۳۔ نصیب خاں حجام ۴ر
۱۹۔ یورپ ۴ر	۴۴۔ گنتی ۴ر	۶۹۔ اجمیری خواجہ ۴ر	۹۴۔ خدا خدمت گار ۴ر
۲۰۔ قصہ فسانہ عجائب ۴ر	۴۵۔ بڑی گنتی ۴ر	۷۰۔ نظام الدین اولیا ۴ر	۹۵۔ پیارے خاں درزی ۴ر
۲۱۔ مثنوی میر حسن ۴ر	۴۶۔ پہاڑے پیمانے ۴ر	۷۱۔ گوتم بدھ ۴ر	۹۶۔ حفیظ خاں خانساماں ۴ر
۲۲۔ گل بکاؤلی ۴ر	۴۷۔ اجرت کا حساب ۴ر	۷۲۔ کرشن کنھیا ۴ر	۹۷۔ [illegible] ۴ر
۲۳۔ چار درویش اول ۴ر	۴۸۔ تنخواہ کا حساب ۴ر	۷۳۔ رام کہانی ۱ ۴ر	۹۸۔ سمدھو حلوائی ۴ر
۲۴۔ 〃 〃 دوم ۴ر	۴۹۔ چاند تارے ۴ر	۷۴۔ 〃 〃 ۲ ۴ر	۹۹۔ میرا ننھا ۴ر
۲۵۔ 〃 〃 سوم ۴ر	۵۰۔ نرد کا کام ۴ر	۷۵۔ افریقہ ۴ر	۱۰۰۔ ہندوستان پانچ ہزار برس پہلے ۴ر

مکتبہ جامعہ دہلی

ENCE CAN PRODUCE
Cipla
REMEDIES
DUCTS OF INTERNATIONAL STANDARD & QUALITY
CHEMICAL, INDUSTRIAL & PHARMACEUTICAL LABORATORIES LTD., BOMBAY—8.
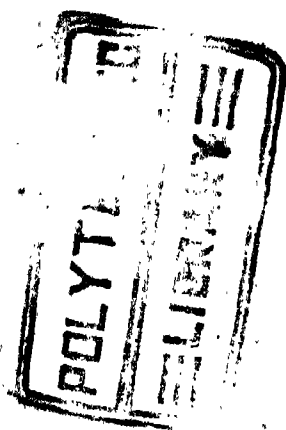
تاریخ الامّت (مکمل)

ازالحاج مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری پروفیسر تاریخ اسلام ۔ سیرت پاک سے لے کر خلافت عثمانیہ تک سات جلدوں میں ۔ آٹھویں جلد جو اسی سلسلے کی کڑی ہے ۔ قرآن اور اسلامی تاریخ کے فلسفے پر حاوی ہے ۔ قیمت مکمل سٹ ۱۵ ۹/۸ر

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
پردۂ غفلت (ڈراما) ڈاکٹر سید عابد حسین	عمر	نقش آخر (ڈراما) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی	عمر
انتخاب میر ۔ مولوی نورالرحمن	۸ر	باغبانی پروجکٹ (اسکولوں کے لئے)	۱۲ر
سیاسیات کی پہلی کتاب	۸ر	ہندوستانی کی پہلی کتاب	۸ر
بادشاہ (پرنس) کا ترجمہ	۸ر	عہد نبوی میں نظام مملکت	۸ر

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
ننھی مرغابی	۵ر	تا نبیل خاں	۵ر	سمندر کا عجائب خانہ	عمر
روٹی کس نے پکائی	۹ر	چتو متو	۵ر	عقائد اسلام	۴ر
جادو کا گھر	۸ر	لال مرغی	۸ر	ارکان اسلام	۶ر
لومڑی کا گھر	۸ر	دو بھائی	۸ر	ہمارے نبی	۸ر
بی مینڈکی اور کوا	۷ر	عقاب	۸ر	ہمارے رسول	۱۰ر
بندر اور نائی	۹ر	ایورسٹ کی داستان	۵ر	سرکار کا دربار	عمر
ہپو چپو	۸ر	تاریخ ہند کی کہانیاں ۱	۷ر	سرکار دو عالم	عمر
پان کھا کر طبلہ بجائے	۸ر	" " " ۲	۸ر	رسول پاک	۸ر
چل میرے مٹکے ٹمک ٹم	۸ر	ترکوں کی کہانیاں	۷ر	خلفائے اربعہ	عمر
پھر مچھلیوں کیا خاک ؟	۸ر	دنیا کے بچے	۱۰ر	دس جنتی	۸ر
پکڑو دم کے ڈکو	۸ر	دنیا کے بسنے والے	۱۰ر	نبیوں کے قصے	۱۰ر
تارا دھری تارا	۸ر	مقناطیس کی کہانی	۸ر	محاسن اسلام	۸ر
بچوں کی کہانیاں	۵ر	بجلی کی کہانی	۱۲ر	قومی نظمیں	۸ر
جنگو کی بلی	۵ر	بجلی اور مقناطیس کی کہانی	۸ر	بچوں کا کھلونا	۱۲ر
محنت ڈراما	۸ر	شریر لڑکا (ڈراما)	۸ر		

ہمارا مکمل پتہ :- **مکتبہ جامعہ دہلی**

جائزہ

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۱۱ - نمبر ۲ | بابتہ ماہ نومبر ۴۵ء | سالانہ چندہ صر فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب صاحب ایم اے (آکسن) [illegible]

اِسلامی تہذیب

پروفیسر محمد مجیب صاحب "ہندوستان میں اسلامی تمدن کی تاریخ" کے نام سے ایک کتاب تصنیف فرما رہے ہیں۔ صاحب موصوف نے ہماری درخواست پر اس کتاب کے حسب ذیل حصے کو رسالہ جامعہ میں اشاعت کے لئے عنایت فرمایا ہے۔ مضمون کے ربط و تسلسل کو بہتر طریقے پر سمجھنے کے لئے یہ بتلا دینا مفید ہوگا کہ اس سے پہلے صاحب موصوف اپنی کتاب میں اسلامی عقائد، شریعت اور تصوف کا ذکر تفصیل کے ساتھ فرما چکے ہیں کہ ان حقیقتوں کو ان مسلمانوں کی زندگی میں جو ہندوستان آئے اور یہاں آباد ہوئے کیا حیثیت حاصل تھی۔ "مدیر"

اسلامی تہذیب کی بہت سی دولت ان مسلمانوں کو نہیں ملی جو ہندوستان آئے اور یہاں آباد ہوئے کیونکہ وہ سیاسی اور ذہنی انقلابوں میں ضائع ہو چکی تھی۔ فلسفہ ان کے حصے میں اتنا ہی آیا جتنا کہ بارھویں صدی تک فقہ اور تصوف میں شامل ہو چکا تھا۔ اور اس وقت تک یہ خیال عام ہو چکا تھا کہ فلسفہ سے سروکار رکھنا عقائد کو کمزور کرنا اور زندگی کے نظام کو بگاڑنا ہے۔ علوم حکمیہ کے آخری چراغ حکیم بوعلی سینا اور حکیم البیرونی گیارھویں صدی میں گل ہو گئے۔ اور پھر ایسے چراغ جلے نہیں کہ ان علوم کی روشنی پھیلتی۔ علم طب کی مسلمانوں میں بڑی قدر تھی مگر اس کی ترقی دوسرے علوم خصوصاً کیمیا، عضویات اور نباتات پر منحصر تھی اور ان علوم میں تحقیق کرنے والے نایاب ہو رہے تھے۔ دراصل ہمیں جس دور سے بحث ہے وہ ذہنی اعتبار سے جمود اور معاشی نقطہ نظر سے انحطاط کا زمانہ تھا۔ خلیفہ متوکل کے وقت سے مرکزی حکومت پر ترک امرا کا تسلط ہو گیا اور اس کے بعد سے عراق، ایران اور خراسان

کی دولت قریب دو سو برس تک بیدردی سے لٹتی رہی۔ ادھر ایشیائے کوچک شام اور فلسطین پر گیارھویں صدی کے آخر سے صلیبیوں کے حملے شروع ہو گئے تھے۔ ایسی حالت میں جبکہ جان اور مال کا اعتبار نہ ہو، تجارت اور صنعت اہل حکومت کی پامال ہو جاتی ہیں، اور ان میں ترقی کا مادہ نہیں رہتا۔ اسلامی تہذیب ہندوستان میں نمودار ہوئی تو اس کی نشوونما کی تکمیل ہو چکی تھی اس کے حامل موجودہ ذہنیت ادارول اور آداب کو قائم رکھنا اپنا منصب سمجھتے تھے تحقیق اور تجربے کی طرف مائل نہ تھے، اور خارجی قدریں پیدا کرنے کی ان میں اتنی استعداد تھی جتنی کہ صدیوں کی بدنظمی اور طوائف الملوکی کے بعد کسی جماعت میں باقی رہ سکتی ہے لیکن یہی وہ زمانہ تھا جبکہ اسلامی تہذیب کی قدریں معین کی گئیں۔ اور زندگی کا ایک نقشہ بنا جو صحیح اور مکمل مانا جاتا تھا۔ اس نقشے کی تکمیل کرنے والوں میں امام غزالی بھی تھے۔ اور ہم ان کی کتاب احیاء العلوم کی بحثوں کو سامنے رکھکر اسلامی تہذیب کی خصوصیات کو واضح کریں گے۔

امام غزالی نے آداب زندگی سے متعلق بحث، کھانے کے آداب سے شروع کی ہے۔ کسی اگلے نیک بخت کا قول ہے کہ کھانا بھی دین میں سے ہے اور پروردگار عالم نے بھی اس مضمون پر آگاہ کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ "کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا"۔ اسی سلسلے میں وہ ایک کلیہ بیان کرتے ہیں جس سے ان کا نقطۂ نظر اور اسلامی تعلیمات کا منشا ظاہر ہوتا ہے: "ہر ایک نو ایجاد بدعت کی ممانعت نہیں ہے بلکہ ممانعت اسی بدعت کی ہے جس کے مقابل کوئی سنت قائم ہو اور باوجود کسی امر شریعت کے موجود رہنے کے اس امر کو دور کرے۔ بعض احوال میں جب اسباب بدل جاویں بدعت کا ایجاد کرنا واجب ہو جاتا ہے"۔ اسلامی تہذیب میں دوسروں کو کھانا کھلانا بڑی مستحسن بات تھی، جس کی اخلاقی مصلحت یہ تھی کہ اس سے سخاوت اور ایثار کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ ان اوصاف کی عام قدر اتنی تھی کہ امام غزالی نے اعتدال پر زور دینا مناسب سمجھا اور اسے ایک تکلیف یعنی مبالغہ قرار دیا کہ

جو کچھ اپنے پاس ہو سب کا سب (مہمان کے) سامنے لاکر رکھ دے اور اپنے عیال کے واسطے کچھ نہ رکھ چھوڑے اور ان کے دلوں کو آزار دے۔"

کھانے کی طرح نکاح کا مسئلہ بھی ان مادی ضروریات میں شمار ہوتا تھا جن کی دین میں بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ ان میں غلط رویہ اختیار کیا جائے تو اس سے دین میں خلل پڑ سکتا ہے۔ امام غزالی نے اس کے بارے میں بہت سی مختلف رائیں بیان کی ہیں کہ دیندار مسلمان کے لئے نکاح کرنا افضل ہے یا مجرد رہنا اور شیخ ابو سلیمان دارانی کا قول نقل کیا ہے کہ "عورتوں سے صبر کرنا اس سے بہتر ہے کہ ان کی عادات سے صبر کیا جائے" نکاح کے فوائد بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ اس سے نفس پر مجاہدہ اور ریاضت ہوتی ہے یعنی گھر رعایا اور ولایت اور گھر والیوں کے حقوق کو ادا کرنا اور ان کی عادتوں پر صبر کرنا اور ان سے تکلیف اٹھانی اور ان کی اصلاح میں کوشش کرنی اور ان کو طریق دین بتانا اور ان کی خاطر کسب حلال میں جاں فشانی کرنی اور بعد کو اولاد کی تربیت کرنی یہ سب امور بڑے مرتبے کے ہیں۔" امر مباح سے لذت حاصل کرنا دین کے لئے ایک قلعہ ہے۔ اور کہتے ہیں کہ عورت جس وقت خوب صورت خوش خلق، سیاہ چشم و سیاہ مو، بڑی آنکھ کی، رنگ میں گوری، شوہر دوست کہ اپنی نظر شوہر ہی پر منحصر کر دے، کسی کو میسر ہو، تو گویا اس کو حور مل گئی۔" ہمارے لئے اس بحث میں خاص طور پر قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ اس میں صرف مردوں کی مصلحتیں پیش نظر رکھی گئیں ہیں گویا شروع کے احکامات کو سمجھنا اور ان پر عمل کرنا انھی کا حصہ ہے۔ عورتوں کی تعلیم کا جو حال ہوگا اس کا اندازہ ہم احیاء کے مندرجہ بالا اقتباس سے کر سکتے ہیں جس سے کہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو اس قابل بنانا کہ وہ بھلے آدمی کے ساتھ رہ سکے اس کے شوہر کا فرض تھا۔ عورتوں کے لئے گھومنے پھرنے کی جتنی آزادی علماء کے نزدیک مناسب تھی وہ بھی کچھ زیادہ نہیں۔ "اس زمانے میں بھی پارسا عورت کو باجازت اپنے شوہر نکلنا مباح ہے مگر نہ نکلنے میں احتیاط [illegible] اور عورت

کو چاہیئے کہ بدون کسی امر ضروری کے نہ نکلے کیونکہ تماشوں اور غیر ضروری کاموں کے لئے نکلنا شرافت کا مخل ہے، اور بعض اوقات فساد بھی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ پھر اگر نکلے تو چاہیئے کہ مردوں اور عورتوں سے اپنی نگاہیں نیچی رکھے ؛" سلاطین اور امرا کی جو اخلاقی حالت تھی اسے دیکھتے ہوئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جس احتیاط کی امام غزالی نے تاکید کی ہے وہ بے محل تھی۔ دوسری طرف یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جو تہذیب امام غزالی کی نظر میں تھی وہ خالص مردانی تہذیب تھی اور سوائے غیر معمولی صورتوں کے اس میں عورتوں کا خاص حصّہ نہ تھا۔

نکاح کے بعد امام غزالی نے کسب اور معاش پر بحث کی ہے۔ اسلامی تہذیب میں یہ بہت برا سمجھا جاتا تھا کہ آدمی اپنی پرورش کا بار جماعت پر ڈال دے ؛" حضرت ابو سلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک عبادت اس کا نام نہیں کہ اپنے پاؤں جوڑ رکھو اور دوسرا شخص تم کو روٹی کھلاوے۔ اول دو روٹیوں کی فکر کر لو، تب عبادت کرو۔ اور حضرت معاذ بن جبل کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن ایک پکارنے والا پکارے گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جن سے تمام روئے زمین میں خدائے تعالےٰ بغض رکھتا تھا۔ اس وقت مسجدوں کے سوال کرنے والے بھی اُٹھیں گے۔ غرض کہ سوال کی مذمت اور دوسرے شخص کی خدمت پر بھروسا کرنے کی برائی شرع کے نزدیک وہ تھی جو بیان ہوئی، اور جس شخص کے پاس مال موروثی نہ ہو اس کو بجز کمانے اور تجارت کرنے کے چارہ نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ انسان دولت کمانے کی فکر میں پڑ جائے اور دین اور جماعت کے حق کو بھول جائے ؛" تاجر کو اپنے دین کا خیال رکھنا سات باتوں کی رعایت سے پورا ہوتا ہے۔ اول ابتدائے تجارت میں نیت اور عقیدے کو درست رکھنا کہ تجارت سے یہ نیت کرے کہ سوال کی ضرورت نہ پڑے، اور لوگوں کا دست نگر نہ ہو بلکہ حلال کی کمائی سے اُن سے غنی ہو جائے اور اپنے مال سے اپنے دین پر مدد لیوے اور اہل و عیال کے حقوق ادا کرے تاکہ مال سے جہاد کرنے والوں کے زمرے میں داخل ہو اور چاہیے کہ سب مسلمانوں

کی خیرخواہی کی نیت کرے اور دوسروں کے لئے وہی بات پسند کرے جو اپنے لئے چاہتا ہو۔ اور یہ نیت کرے کہ اپنے معاملے میں عدل اور احسان کے طریق کی پیروی کروں گا۔

اور یہ نیت کرے کہ بازار میں جو چیز دیکھوں گا اس میں اچھی بات میں حکم کرنے اور بری بات میں منع کرنے سے دریغ نہ کروں گا .... دوئم یہ کہ اپنی صنعت یا تجارت میں رہنے سے یہ قصد کرے کہ ایک فرض کفایہ ادا کرتا ہوں۔ کیونکہ اگر صنعتیں یا تجارتیں بالکل چھوڑ دی جاویں تو معاش کے کارخانے جلتے رہیں اور اکثر لوگ تباہ ہو جائیں کہ سب کا انتظام سب کی معاونت سے ہو رہا ہے اور اس سے ایک فریق ایک ایک کام کا ذمے دار ہے اگر سب کے سب ایک ہی صنعت کرنے لگیں تو اور صنعتیں چھوٹ جائیں اور سب کے سب ہلاک ہو جائیں .... پھر صنعتوں میں سے بعض تو نہایت کارآمد ہیں اور بعض ضروری نہیں کہ انجام کو آرام طلبی زینت دنیاوی اُن سے ہوتی ہے تو آدمی کو چاہیے کہ ایسی صنعت اختیار کرے جس سے مسلمان کو فائدہ ہو اور جن میں ضروری ہو اور جو پیشے کہ ظاہری زینت کے ہیں اُن سے احتراز کرے" مشرقی ملکوں کے حالات نے افراد اور جماعت کے درمیان (مغربی ملکوں کے مقابلے میں) بہت زیادہ قریبی اتحاد کا رشتہ قائم کر دیا۔ جو اصول رائج ہے (اور تھا) وہ مقابلے کا نہیں ہے۔ امداد باہمی کا ہے ان باتوں کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے تجارتی اخلاق کا یہ بنیادی اصول سمجھ میں آجاتا ہے کہ تاجر کو گاہک کے ساتھ بھائی کا سا سلوک کرنا چاہیئے "فائدہ کے بغیر تجارت ممکن نہیں اور جو شخص دنیا کے معاملوں میں صرف اصل قیمت پر اکتفا کرے اور نفع کا طالب نہ ہو وہ عاقل نہیں شمار ہوتا" ۔ لیکن چونکہ فائدہ اصل پر خرید ہوتا ہے تو چاہیئے کہ ایسی ہی چیزوں میں طلب کیا جائے جو مخلوق کی اصل ضرورتوں میں داخل نہ ہوں اور خلق کو اُن کی حاجت نہ ہو"

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ امام غزالی معاشی زندگی کی پوری وسعت اور اس کے امکانات نظر میں رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک بہت ہی نتیجہ خیز بات لکھی ہے کہ "یہ جو حدیث وارد ہے

کہ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم اس سے یہی غرض ہے کہ جس علم کی حاجت ہو اس کا سیکھنا فرض ہے اور پیشہ ور کو پیشے کے علم کی حاجت ہوتی ہے اس لئے اس کو سیکھنا اس علم کا درست ہے مگر انھوں نے کئی پیشوں کو مکروہ یا قابلِ احتراز قرار دیا ہے اور معلوم ہوتا ہے ان کی رائے یہ تھی کہ صرف دس پیشے ایسے ہیں جنھیں دیندار مسلمان بغیر کسی تامل کے اختیار کر سکتا ہے موزہ دوزی تجارت (سوائے غلہ اور جانداروں کی تجارت کے) پلہ داری کپڑا سینا، کپڑا دھونا جوتا بنانا، آہن گری، سوت کاتنا، خشکی اور تری کا شکار کرنا اور کتابت۔ ایسے پیشے جیسے کہ نقش و نگار کرنا سادہ کاری، زرگری، چونے کی استر کاری، لہو کی چیزیں اور ایسے کاٹھ بنانا جن کا استعمال حرام ہے۔ مردوں کے لئے ریشمی کپڑے اور زیورات بنانا سب ان کے نزدیک قابلِ احتراز ہیں۔ اس طرح کتابت کے سوا تمام پیشے جن کا فنونِ لطیفہ کا تعلق ہے مسلمانوں کے لئے مناسب نہیں رہتے اور وہ تمام صنعتیں جنھیں ترقی دے کر انھوں نے اپنی تہذیب کو مزین کیا مکروہ یا حرام ثابت ہوتی ہیں۔ علماء کی مخالفت نے ان صنعتوں کو بند نہیں کر دیا مگر ان کے برتنے والے نظروں میں گر گئے، اور اس طرح مساوات کی جو تعلیم اسلام میں دی گئی ہے اس کی صریح خلاف ورزی ہوئی۔ البتہ ایک کاروبار ایسا تھا جس کی سب بڑی عزت کرتے تھے۔ اور یہ کاروبار مسلمانوں ہی کی بدولت تمام دنیا میں پھیلا۔ یہ تھا کاغذ سازی، کتابت اور کتب فروشی کا کام۔ اس میں بھی کتابوں کو مطلا اور مذہب کرنا اور اس کی نفیس جلدیں بنانا ایک بدعت تھی جو علماء کو ناپسند نہ ہو گی، کتابوں میں جو تصویریں بنائی جاتی تھیں ان کے خلافِ شرع ہونے میں کلام ہی نہ تھا۔

احیاء العلوم کے چوتھے باب میں امام غزالی نے حرام اور حلال چیزوں کی تفصیل دی ہے۔ جو لوگ شرع کی پوری پابندی کرتے وہ اس معاملے میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ امام حنبلؒ کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ آپ بغداد میں رہتے تھے مگر چونکہ آپ کی رائے میں اس زمین کو حضرت عمرؓ نے نمازیوں پر وقف کیا تھا، آپ ہمیشہ موصل سے منگواتے تھے ایک

مرتبہ آپ کے ملازم نے آپ کے لڑکے صالح کے یہاں سے خمیرے کر آٹے میں ملا دیا۔ صالح ایک سال تک اصفہان کے قاضی رہ چکے تھے اور امام حنبل کو یقین نہ تھا کہ ان کے گھر کا کونسا مال حرام ہے کون سا حلال۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ آٹے میں صالح کے یہاں سے خمیر ڈالا گیا ہے تو آپ نے روٹی نہیں کھائی اور ملازم سے فرمایا کہ اسے باہر رکھ دو اگر کوئی فقیر مانگے تو اسے دے دینا مگر اُسے یہ بتا دینا کہ آٹا حنبل کے گھر کا ہے خمیر صالح کے گھر کا۔ کئی دن تک کسی فقیر نے بھی روٹی نہیں لی تو ملازم نے اُسے لے جا کر دجلہ میں پھینک دیا۔ امام حنبل کو یہ معلوم ہوا تو آپ نے دجلہ کی مچھلیاں کھانا چھوڑ دیا۔ دوسری طرف ایسے فقیہہ قاضی اور قاری تھے جو مقامی شرابوں کا پینا جائز سمجھتے تھے اور انھیں پیتے تھے عام مسلمانوں کا رویہ معقول اور شاید صحیح بھی تھا، وہ بغداد کے آٹے کو حلال اور شراب کو حرام سمجھتے رہے۔ ایک دوسرے کے عمل کو جانچتے وقت وہ امام شافعی کے اس کلیہ کو معیار مانتے ہوں گے کہ "مسلمانوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو خدائے تعالےٰ کی طاعت ہی کرے اور معصیت نہ کرے اور نہ ایسا کرے کہ معصیت ہی کرے اور طاعت نہ کرے، تو جس شخص کی طاعت معصیت پر غالب ہو وہی عدل ہے"۔

اسلامی اخوت کس طرح جماعت کی شیرازہ بندی کر سکتی ہے اس کا اندازہ اس بحث سے ہوتا ہے کہ جو امام غزالی نے دوستی اور صحبت کے آداب پر کی ہے۔ "ایمان کی رسیوں میں زیادہ مضبوط محبت فی اللہ اور بغض فی اللہ ہے۔ اسی حدیث کے باعث واجب ہے کہ آدمی کے کچھ دشمن ہوں اور کچھ دوست ہوں جن سے محبت فی اللہ رکھتا ہو" محبت کے ساتھ بغض کو لازمی قرار دینا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی قدر عصبیت کے بغیر جماعت میں قوت پیدا نہیں ہوتی۔ اب سوال یہ ہے کہ بغض کس سے کیا جاتا تھا، کیونکہ مسلمان ایک دوسرے سے اصولاً عداوت نہیں کر سکتے تھے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ مامون رشید کے زمانے میں معتزلہ فرقے کے عالموں نے مخالف عقائد رکھنے والے علما

پر سختیاں کیں اور متوکل کے ہاتھوں انھوں نے اپنی زیادتیوں کی سزا بھگتی۔ اسی وقت سے لوگ ان علماء سے [illegible] ہوگئے جو رائج عقیدوں کے خلاف فلسفیانہ نظریے پیش کرتے۔ لیکن عقائد کا ایسا اختلاف جو فلسفیانہ نظریوں اور موشگافیوں پر مبنی ہوتا عوام میں بغض پیدا کرنے اور ان کو برانگیختہ کرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ غیر مسلم مذہبی فرقوں میں مانوی اور مزدکی یا زندیق ایسے تھے جن سے مسلمانوں کو عداوت تھی، کیونکہ اس فرقے کے بعض عقائد اسلامی تعلیمات سے مشابہ تھے اور کچھ واقعات ایسے پیش آئے جنھوں نے یہ اندیشہ مسلمانوں کے دل نشین کردیا کہ زندیق دھوکے سے اقتدار حاصل کرکے اسلام اور مسلمانوں کو برباد کرنا چاہتے ہیں لیکن ممکن ہے زندیق بھی اپنے حال پر چھوڑ دئے جاتے اگر وہ سیاست سے الگ رہتے۔ ان کے خلاف جو کارروائیاں کی گئیں ان کا اصل مقصد سیاسی تھا اور مذہب سے بھی سیاسی اغراض کو پورا کرنے کا کام لیا گیا۔

قرامطی جو باطنی اور اسمٰعیلی بھی کہلاتے تھے قوت اولاد، تعداد میں زندیقیوں سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ قرامطیوں کے رہنماؤں میں سے بعض ایسے تھے جو عقائد اور نظام معاشرت میں اصلاح چاہتے تھے۔ بعض اس بہانے سے حکومت حاصل کرنا چاہتے تھے اس تحریک کی ابتدا نویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی۔ اس کا کچھ تعلق جنوبی عراق کے افریقی غلاموں کی بغاوت سے تھا جو ۸۶۹ء میں شروع ہوئی اور پندرہ برس تک جاری رہی۔ قرامطیوں کی تعلیمات اور ان کا مجوزہ معاشرتی نظام ان لوگوں کے لئے خاص کشش رکھتا تھا جن پر عباسی خلیفہ اور اس کے امرا اور عہدہ داروں کے اخراجات کا سارا بار پڑتا تھا اور قرامطیوں کی تبلیغ سب سے زیادہ کسانوں اور صنعت پیشہ لوگوں میں مقبول ہوئی۔ مصر میں فاطمی خلافت کا قیام (۹۰۹ء) قرامطیوں (یا اسمٰعیلیوں) کی سب سے بڑی سیاسی کامیابی تھی، لیکن وہ اس سے مطمئن نہ ہوئے بلکہ انھوں نے شام، عراق، ایران اور خراسان میں اپنے مرکز قائم کرکے سلجوقیوں کے خلاف ایک

مدت تک بڑی خوں ریز جنگ جاری رکھی۔ ان کی عداوت بے پناہ تھی۔ عباسی خلافت کے زوال کے بعد انھوں نے ممتاز مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کیا اور اس طرح مسلمانوں کو ایسا نقصان پہنچایا جس کی تلافی نہیں کی جا سکتی تھی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ عام مسلمانوں کے نزدیک قرامطی جاسوسوں اور داعیوں (یعنی مبلغوں) اور عالموں کا سراغ لگانا اور انھیں قتل کرانا یا کرنا بڑے ثواب کا کام ہو گیا۔ ان کی نسبت کوئی اچھی بات کہنا ملت اسلامی کے ساتھ غداری تھی اور اسی وجہ سے اُن کے عیب ہی بیان ہوتے رہے۔ اب تحقیق کرنے سے پتہ چلا ہے کہ قرامطیوں کے عقائد اور تصورات کا مسلمانوں کے فلسفے تصوف اور عقائد پر خاصا اثر پڑا اور صنعت پیشہ لوگوں کی جو تنظیم[۵] نویں صدی عیسوی میں کی گئی، اس کی پشت پر بھی قرامطیوں کی نیم مذہبی، نیم اشتراکی تعلیمات تھیں۔ امام غزالی نے ان عداوتوں کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے جنھوں نے مسلمانوں کی جماعت میں صدیوں تک فساد برپا

۵ پیشہ وروں کی برادریوں کو سب سے زیادہ فروغ مصر میں فاطمی خلافت کے زیر سایہ دسویں اور گیارھویں صدی میں ہوا۔ باقی اسلامی ملکوں میں بھی یہ دسویں سے بارھویں صدی تک ترقی پر رہیں مختلف برادریوں کے جو قاعدے اور رسمیں تھیں، انھیں "دستور" کہتے تھے۔ اور برادری میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ دستور کی پابندی کا عہد نہ کرتا اور اس کے داخلے کی رسم جسے شد کہتے تھے ادا نہ کی جاتی۔ برادری کا سردار "نقیب" کہلاتا تھا۔ اس کے ماتحت "معلم" یا "استاد" ہوتے تھے اور اس کے نیچے "خلیفہ" یعنی صنعت کو اچھی طرح جاننے والے کاریگر۔ "متعلم" یا "شاگرد" اور "صانع" یا فن سے ناواقف مزدور ہوتے۔ ہر برادری کے اراکین اس کا عہد کرتے تھے کہ اپنے فن کا راز کسی غیر کو نہ بتائیں گے اور معقول اُجرت پر اچھا کام کریں گے۔ بارھویں صدی کے بعد برادریوں کا نظام بہت کمزور پڑ گیا۔ اس وجہ سے کہ بادشاہ اسے اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے تھے اور علما کی نظروں میں وہ قرامطی بدعتوں کا نمونہ تھا۔ لیکن عثمانی سلطنت ایران، ترکستان اور پنجاب میں اس کے آثار انیسویں صدی تک موجود تھے بعض ملکوں میں یہ برادریاں پہلی جنگ عظیم کے بعد تک رہیں اور روس میں انقلاب ہوا تو یہ کومیونسٹ انٹرنیشنل سے ملحق ہو گئیں

رکھا۔ بعض فی اللہ کی تلقین سے معمولی سمجھ کے مسلمان یہ نتیجہ نکالتے ہوں گے کہ جماعت کے جو دشمن ہوں ان سے نفرت کی جائے اور جماعت کو ان کے فتنوں سے بچایا جائے۔ مشرک اور کافر سے بھی نفرت کی جاتی تھی مگر ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ دنیا میں وہ جہاں کہیں بھی ہوں ان کے خلاف جنگ کی جائے چاہے مسلمانوں کو ان سے کوئی خاص خطرہ یا نقصان نہ ہو البتہ یہ ممکن تھا کہ بادشاہ اپنے منصوبوں کی خاطر اس اصول عداوت کو بھڑکائیں اور اسے اپنی سیاست کا آلۂ کار بنائیں۔ بادشاہ اپنی غرض سے شریعت کے محافظ بھی بن جاتے تھے لیکن ایسے بادشاہ بہت ہی کم ہوئے ہیں۔ جن کا طرز عمل دیانت دار علماء کو بھی شریعت کے مطابق معلوم ہوا ہو، امام غزالی نے حاکموں تک کے خلاف ایک دوسرے کی حمایت کرنا افراد کے فرائض میں شامل کیا ہے " انیسواں حق یہ ہے کہ اپنے بھائی مسلمان کی عزت اور جان اور مال کو ظالم سے بچاوے۔ بشرطیکہ بچانے پر قادر ہو اور ظالم کو اس پر سے دفع کرے اور اس کی طرف ہو کر ظالم سے لڑے اور مظلوم کی ہر طرح سے مدد کرے۔ کہ اخوت اسلامی کے مقتضا سے یہ امر آدمی پر واجب ہے "

اچھی بات کا حکم کرنا، اور بری بات سے منع کرنا دین کا بڑا بدارہے کہ اس طرح جماعت اپنے آپ اصلاح کر سکتی ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ امر بالمعروف " یعنی صحیح بات کرنے کا حکم دینے اور نہی عن المنکر " یعنی بری بات کو منع کرنے کا اصول بادشاہو اور ان لوگوں کے ساتھ جنھیں شاہی سرپرستی حاصل تھی برتا نہیں جا سکتا تھا۔ امام غزالی نے ایسے لوگوں کی بہت سی مثالیں دی ہیں جنھوں نے خلیفہ کی اجازت کے بغیر اپنے آپ کو عام اخلاق کا نگراں سمجھ لیا اور شریعت کی خلاف ورزی کرنے والوں کی تنبیہہ کرنے لگے ایسے لوگ تعداد میں اور بھی زیادہ ہوں گے جو نرمی اور خاموشی سے تلقین کرتے تھے لیکن جو شخص صحیح صحیح بتانا چاہے کہ کیا منع ہے اور کیا منع نہیں ہے وہ زندگی کی تفصیلات میں الجھ جاتا ہے کہ اکثر ٹھیک فیصلہ نہیں کر سکتا اور جو تفصیلات کو نظر انداز کرے وہ

رہنمائی نہیں کرسکتا، اس لئے کہ پوچھنے والے تفصیلات کے بارے ہی میں سوال کرتے ہیں۔ امام حنبل نے اصولاً صحیح رویہ اختیار کیا۔ جس کے پاس ایک سرمہ دانی چاندی کی ہو اس کے پاس بھی نہ بیٹھنا چاہیے۔ لیکن جس زمانے میں مسلمانوں کے پاس دولت تھی، اور صنعتیں فروغ پر تھیں ایسی احتیاط وہی کرسکتا تھا جو دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھتا اور پھر علماء بہت سی باتوں پر متفق نہ تھے۔

صوفیوں میں گانا سننے (سماع) کا رواج ہوگیا۔ اور گانا سنتے سنتے انھیں حال آتا تھا جس میں وہ مضطرب ہوجاتے اور ہاتھ پاؤں ٹپکنے اور ناچنے لگتے تھے۔ بیشتر علماء کی رائے میں سماع شریع کے خلاف تھا۔ امام غزالی صوفیوں سے اتفاق کرتے تھے۔ "جیسے لوہے اور پتھر میں آگ مخفی رہتی ہے اسی طرح دلوں اور باطن کے جواہر اور اسرار ان میں پوشیدہ ہیں اور ان کے اظہار کی تدبیر راگ سے بہتر کوئی نہیں۔" "اول راگ ہوتا ہے اور اس سے دل پر ایک حالت ہوتی ہے جس کو وجد کہتے ہیں اور وجد کے سبب سے اعضاء کو حرکت ہوتی ہے اور اگر وہ غیر موزوں ہوتی ہے تو اس کو اضطراب کہتے ہیں، اور اگر موزوں ہوتی ہے تو تال اور ناچ نام ہوتا ہے۔" "راگ کی تاثیر دلوں میں محسوس ہوتی ہے اور جس شخص کو راگ سے حرکت نہ ہو وہ ناقص اور اعتدال سے ہٹا ہوا اور روحانیت سے دور اور اونٹوں اور پرندوں بلکہ تمام بہائم سے طبیعت میں کثیف ہے اس لئے کہ موزوں سے سب کو اثر ہوتا ہے راگ ...... پر مطلق اباحت یا مطلق حرمت کا حکم کرنا درست نہیں ہے بلکہ یہ امر احوال اور اشخاص کے اعتبار سے اور طریق نغمات اختلاف کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے"

راگ صوفیوں کے شوق کو ابھارتا ہے اور عشق ومحبت کو پختہ کرتا ہے اور دل پر کام چقماق کا کرتا ہے اور ان میں سے ان مکاشفات اور لطائف کو ظاہر کرتا ہے کہ خارج از حیطہ وصف ہیں جو ان کو چکھتا ہے وہی ان کو پہچانتا ہے اور جس کا حس ان کو چکھنے سے کند ہوتا ہے وہ فن کو کیا جانے اور ان حالات کا نام ارباب تصوف کے یہاں وجد ہے جو وجود سے ماخذ ہے یعنی اپنے نفس میں وہ احوال موجود پائے جو کہ پیشتر نہیں معلوم ہوتے تھے سننے والے کی نیت محض موسیقی سے لطف اٹھانا ہو یا کسی [illegible] صورت [illegible] کی طرف دیکھنا محال

نہ ہو اور اس کے راگ سننے سے فتنے کا خوف ہو تو گانا سننا جائز ہے۔ علما نے اس کلیہ سے کہ اسلام دین فطرت ہے یہ نتیجہ نہیں نکالا کہ انسان کو جمالیات اور فنون لطیفہ کا ذوق قدرت کی طرف سے ملا ہے اور جمال کی طلب انسان کا حق ہے وہ عورتوں کو بننے سنورنے اور زیور پہننے کی اجازت تو دیتے تھے مگر چاہتے تھے کہ اس میں بھی ان کی رائے مانی جائے کہ کون سے زیور کس طرح پہنے جائیں۔ سونے اور حریر سے عورتوں کو زینت کرنی بدون اسراف کے درست ہے اور ہمارے نزدیک لڑکیوں کے کان چھیدنے بالیاں پہنانے کے لئے جائز نہیں اس لئے کہ اس میں زخم ایذا رسانی کرنا پڑتا ہے اور ایسے زخم سے قصاص لازم آتا ہے تو بدوں حاجت ضروری کے جائز نہ ہوگا۔" اور بالیوں کی زینت کچھ بہت ضروری نہیں بلکہ اگر بندے باندھ کر کانوں کے اوپر سے لٹکا دئے جائیں کان کی زینت کو کافی ہیں۔ اور دوسرے زیور مثل چمپی یا چھلی یا کنگن کیا تھوڑے ہیں جو بالیوں کی حاجت ہو تو بالیوں کے لئے کان چھیدنا اگرچہ عادت ہو رہی ہے مگر حرام ہے اور اس سے منع کرنا واجب ہے اور کان چھیدنے پر اُجرت لینی .... حرام ہے"

زندگی کا اصولی نقشہ صحیح اور مکمل ہو سکتا ہے مگر یہ لازمی نہیں کہ وہ حالات کے مطابق ہو۔ شرعی عالم قومی "عادت" کے وجود کو تسلیم کرتے تھے اور اگر اس سے اسلام کے بنیادی احکامات کی خلاف ورزی نہ ہوتی تو قومی عادتوں پر قائم رہنے کی اجازت دیتے تھے گویا مذہب ایک تھا، شریعت ایک تھی، عادتیں مختلف ہو سکتی تھیں، عادتیں قومی طبیعت اور اس کی تاریخ کا عکس ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے ان دونوں کو تسلیم کرنا بھی ضروری ہو لیکن طبیعت اگر مردہ نہ ہو جائے تو وہ اپنے اظہار کے لئے نئی راہیں نکالیں رہتی ہیں اور اس وجہ سے اس کا اصول اور قانونوں سے برابر تصادم ہوتا رہتا ہے۔ اصولی شریعت اور عدالتوں کی تہذیب کبھی مرادف الفاظ نہ تھے اس لئے اب ضروری ہو

کہ ہم احیاء العلوم جیسی بصیرت افروز کتاب کا سہارا چھوڑ کر بعض تحریکوں پر ایک نظر ڈالیں جن کا اسلامی تہذیب پر خاصا گہرا اثر پڑا۔

عرب اسلام کا گہوارہ تھا، مگر صرف گہوارہ۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی ایسے لوگ تھے جو چاہتے تھے کہ اسلام اپنے گہوارے سے نکلے اور مسلمان اسی ماحول میں زندگی بسر کرتے رہیں جس میں ان کا دین پیدا ہوا تھا کیونکہ روم اور عجم کو تہذیب میں خرابی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا، بنو امیہ کی حکومت ان میلانات پر غالب آئی اور اس کے ساتھ عربوں نے ریگستانی معاشرت کا جامہ اتار کر تہذیب کے منجدھار میں غوطہ لگایا۔ بنو امیہ اور ان کے حامیوں کا قومی اور نسلی تعصب اُسے گوارا نہیں کرسکتا تھا کہ اسلام کی تبلیغ کی جائے اور ان ملکوں کی آبادی جن پر یہ حکومت کرتے تھے، اسلام قبول کرکے حکومت اور حیثیت میں برابری کا دعویٰ کرے۔ لیکن اسلام کی اشاعت بند نہیں کی جاسکتی تھی، خصوصاً جب محکوم خود مسلمان ہوجانے پر مصر تھے۔ عام طور پر یہ ہوتا کہ جو غریب غیر عرب مسلمان ہونا چاہتے۔ تو وہ کسی عرب سردار اور اس کے قبیلے سے متعلق کردئے جاتے جو ان کی نگرانی اور سرپرستی کرتا تھا، اس تعلق کی بنا پر یہ نومسلم موالی کہلاتے تھے۔ ہم محض نام سے عرب اور موالی کے درمیان تمیز نہیں کرسکتے اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شام اور عراق اور ان کی مسلمان آبادی سب ایک قسم کی تھی، لیکن عرب موالیوں سے خاصا تعصب کرتے تھے، وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ عرب اور موالی کا فرق مٹ جائے .... ان کے لئے یہ ایک مسئلہ تھا کہ عرب اور موالی کے درمیان شادی بیاہ ہوسکتا ہے یا نہیں۔ اور وہ ایک ہی مسجد میں نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں لیکن اسلام کی تعلیم پر عربوں کے تعصبات غالب نہیں آسکتے تھے اور موالی جن قوموں کے لوگ تھے۔ انھی کی تہذیب اختیار کرکے عرب اپنی فضیلت کو کیسے تسلیم کراسکتے تھے۔ ایک روایت ہے کہ خلیفہ عبدالملک کی علامہ الزہری سے ملاقات ہوئی خلیفہ نے دریافت کیا کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ علامہ الزہری نے جواب دیا کہ مکہ سے۔ خلیفہ

نے پوچھا کہ وہاں لوگوں میں کون سب سے افضل سمجھا جاتا ہے۔ الزہری نے جواب دیا کہ عطا ابن رباح۔ وہ عرب ہے یا مولا) مولا۔ تو اس نے ملکیوں میں اتنا اثر کیوں کر پیدا کرلیا اپنے تقوے اور علم و حدیث کی بنا پر اس کے بعد عبدالملک نے یمن، مصر، شام، عراق خراسان بصرہ کوفہ وغیرہ کے متعلق پوچھا اور معلوم ہوا کہ ہر جگہ کسی مولا کو علمی اور دینی قیادت حاصل ہے، اس پر خلیفہ کو تعجب ہوا، اور اس نے کہا کہ اگر یہی حالت رہی تو موالی عربوں پر غالب آ جائیں گے اور ان کو محکوم بنا لیں گے۔ علامہ الزہری نے کہا کہ اے امیر المومنین صورت یہی ہے یہ خدا کے حکم اور اس کے دین کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ جو اس کی طرف توجہ کرتا ہے اسے اقتدار حاصل ہوتا ہے، جو اس سے غفلت کرتا ہے، وہ مغلوب ہو جاتا ہے۔

دوسری اور تیسری صدی ہجری (آٹھویں اور نویں صدی عیسوی) میں ایک تحریک فروغ پر تھی جو شعوبیہ کہلاتی ہے۔ اس کا مقصد یہ تسلیم کرنا تھا کہ اسلامی تعلیم کی بنا پر عرب اور عجم میں کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی آدمی سب آدم کی اولاد اور خدا کے بندے ہیں۔ در اصل یہ عربوں کے قومی تعصب کے خلاف ایک تحریک تھی اور اس کے دعوے اسلامی تعلیمات کی صحیح تشریح کرتے ہیں۔ لیکن سیاسی اختلافات اور نسلی تعصبات نے اس کو انتہا پسندی کی طرف مائل کر دیا اور یہ ایک ایسے قومی جذبات کا مظہر بن گئی جو عرب اور اسلام کے تاریخی تعلق کو نظر انداز کرنا ہی نہیں بلکہ قومی عظمت کی یادگاروں میں اسلامی تاریخ کے کارناموں کو محو کر دینا چاہتے تھے۔ ایران، شام اور مصر میں قومیت نے ایک شکل اختیار کی جو ملت کے سیاسی اور تہذیبی اتحاد کو بہت کمزور کر سکتی تھی اور اسی قومیت اور عرب دشمنی نے مذہبی فرقوں کو انتہا پسند بنا دیا۔ عام تہذیب پر اس کا اثر یہ ہوا کہ ایسی تاریخی شخصیتیں جن کا عرب سے تعلق تھا پس پشت ڈالی جانے لگیں اور خسرو اور قیصر، نوشیرواں اور سکندر اعظم کی مثالیں ذہنی اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ بن گئیں۔ عباسی خلفا کے عہد میں ایرانی لباس اور ایرانی آداب اختیار کیے گئے اور ایران کی بنی ہوئی چیزوں کو دوسری جگہ کی مصنوعات

پر ترجیح دی جانے لگی۔ خلیفہ ماموں رشید کے زمانے میں ایک خاص قسم کے عقیدہ کے علماء پر سختیاں کی گئیں تو دوسری طرف ایسی روا داری برتی گئی جس نے نئی داخلی قدروں اور نئے تصورات کو اسلامی تہذیب پر اثر ڈالنے کا موقع دیا۔ ان سب باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی تہذیب کا اپنا الگ معیار قائم ہو گیا جو عربی یا عجمی نہیں تھا، بلکہ بین اقوامی اور اس میں وہ تمام نسلی اور قومی اختلافات محو ہو گئے۔ جنھیں مٹانا اسلام کا ایک بنیادی منصوبہ تھا،

ہر تہذیب پر سیاسی حالات، حکومت کے طریقے اور سیاسی اقتدار کے حامل بہت اثر ڈالتے ہیں اسلامی دور کی تہذیب کے ایک دور میں حکومت مرکزی تھی اس کے بعد اسلامی دنیا چھوٹے بڑے سیاسی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی، کبھی کبھی یہ ٹکڑے اتنے چھوٹے ہو جاتے کہ ان کا قائم رکھنا خود ان کے لئے محال اور ملت اسلامی کے لئے مضر ہوتا۔ مگر عباسی خلافت کے زوال کے بعد مرکزیت کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش بڑے پیمانے پر نہیں کی گئی۔ جماعت کو اپنی مذہبی اور تہذیبی وحدت کا یقین تھا مگر اپنی سیاسی قوت اور حق کا احساس نہ تھا یعنی اسلامی تہذیب میں ان اوصاف کی کمی تھی جن کا مجموعی نام شہریت ہے، اسی وجہ سے جماعت یہ جانتے ہوئے کہ سیاسی حکمت عملی پر عافیت اور خوش حالی کا مدار ہے، اپنے سیاسی حاکموں کو قابو میں نہ کر سکی۔ بادشاہ علم اور ہنر کی سرپرستی کرتے تھے، نہ کرتے تو بدنام ہوتے لیکن حکومت خدمت کا ذریعہ نہ تھی۔ بادشاہ رعایا کی پوری حفاظت بھی نہیں کر سکتے تھے سفر میں قافلوں کے لٹ جانے کا خطرہ رہتا تھا، شہروں میں بھی لوگ بے فکر نہیں رہ سکتے تھے ظالم بادشاہوں اور ان کے عاملوں جرائم پیشہ گروہوں اور ذاتی دشمنوں سے جان اور عزت کو محفوظ رکھنے کے گر، فن زندگی کے ابتدائی سبق تھے، جان سلامت رکھنا دشوار ہو تو لوگ قدرتی طور پر قناعت کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ مگر مسلمانوں میں ایسے لوگ افراط سے تھے جو جان پر کھیل کر دولت اور اقتدار حاصل کرتے ان کے اوصاف کی قدر کی جاتی اور ان کی سرگذشت عبرت اور اخلاقی تربیت کے لئے مواد فراہم کرتی۔ دنیاوی حوصلہ مندی کے مقابلہ میں وہ مسلک تھا جسے درویشی کہہ سکتے ہیں۔ درویش سے مراد یہاں صوفی ہی نہیں ہے بلکہ وہ شخص جو مادی

قدروں پر اخلاقی اور روحانی قدروں کو ترجیح دیتا جس میں قوت فکر اور قوت عمل ہوتی
اور جو بغیر تکلف اور خوف کے اجتماعی زندگی کی آزمائشوں کو قبول کرتا۔ شیخ سعدی
نے ایک پیرزادے کے متعلق رائے دیتے ہوئے فرمایا "وہ تو پہاڑ میں ساکن ہو گئے ہیں
اور یہ کوئی جواں مردی نہیں۔ مرد ایسا ہونا چاہئے کہ بازار میں رہ کر حق تعالےٰ کے ساتھ ایسا
مشغول ہو کہ اس سے کبھی غافل نہ ہو" اس درویشی کو جو بازار کے غل غپاڑے اور سیاست
کے انقلابوں کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ ایسے لوگوں نے بہت رسوا کیا جو خانقاہوں میں بیٹھ کر
گداگری کرتے تھے۔ پھر بھی خوددار درویش کا مرتبہ ایسا تھا جس کے سامنے امارت اور
حکومت نوبت چندروزہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک لمحہ بھر کا تماشہ جیسے کہ گھر کے چراغ کے
مقابلے میں بجلی کی چمک۔ درویش سے بہت ملتا جلتا تہذیب کا وہ نمونہ تھا جسے
"صاحب دل" کہتے تھے۔ یعنی ایسا شخص جس کی طبیعت میں دنیا کے حادثوں نے پختگی پیدا کردی
ہو مگر سختی نہ ہو جسے اپنی داخلی قوت پر اعتماد ہو جو ایک خاص طریقہ اختیار کرے اس یقین
کے ساتھ کہ وہ اس کے لئے سب سے زیادہ مناسب ہے اور دوسروں کو گمراہ نہ سمجھے کہ وہ
بھی اپنی طبیعت کے مناسب عمل کرتے ہیں۔ جو دنیا کی نعمتوں کی قدر کرتا ہو اور ان کے بغیر
بھی خوش رہ سکے ایسا شخص قانون اور مصلحت دنیاوی حوصلے اور اخلاقی قدر "زہد"
اور "رندی" سب کے حالات اور مقام کو سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے کہ وہ "دل" کا مالک ہوتا
"قلب" یا "دل" تصوف کی اصطلاح ہے جس سے تہذیب کے نقطۂ نظر سے کامل شخصیت کے
تصور کو پیش کرنے میں بڑی مدد لی گئی۔ تصوف میں قلب روح اور جسم کا نقطۂ اتصال
تجلی کا مقام قوت مدرکہ اور تمام روحانی قوتوں کا مرکز تھا۔ تہذیب میں یہ شوق ذوق
وحق شناسی حقیقت یعنی غرض تمام لطیف جذبات کا حامل اور نفس انسانی کا جوہر
تھا۔ جس کے دل نہ ہوتا وہ تمام انسانی صفت سے محروم سمجھا جاتا۔ قلب کی طرح عشق
"سکر" (یعنی نشہ خمار) "صحو" یعنی ہوش" "جمع" (یعنی وصل) "معشوق" ایسے

سکتے تھے جو تصوف کے دار الضرب سے نکلے اور تہذیب کا سرمایہ بن گئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تصوف کی ان اصطلاحوں کے رواج سے پہلے لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ عشق کیا ہے یا نشہ کیا۔ صوفیوں نے پرانے الفاظ لے کر انھیں نئے تصورات کا حامل بنا دیا، اور اس طرح عام انسانی جذبات اور لطیف روحانی اُمنگوں مذہب اور جمالیات میں ایک ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کردی جو دنیا کی اور کسی تہذیب کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔

صوفی کا شاعر ہونا بھی ایک خصوصیت ہے جو صرف اسلامی تہذیب میں نظر آتا ہے اس کی وجہ سے شاعری انفرادیت کے مبالغوں اور مغالطوں اور اس تخریبی میلان سے بڑی حد تک بچی رہی جو شاعروں میں اکثر پایا جاتا ہے، اور اس پر کوئی ایسی پابندیاں عائد نہیں ہوئیں جو جذبے کو اظہار سے یا تخیل کو پرواز سے روکتی ہیں۔ وہ آزادی جو شاعر چاہتا ہے تصوف نے اس طرح دے دی کہ علمائے ظاہر یعنی موروثی مذہب کا منصب مقرر کر دیا، اور قلبی واردات کو کمال بے پروائی کے ساتھ بیان کرنے کی رسم قائم کر کے شاعر کے لئے ایک آڑ بن گیا شاعر اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا تھا جو کہ منصور نے کہا تھا کہ "میں خدا ہوں" اور وہ اپنا الگ مذہب رکھنے کا دعوے کرتا تو اس سے زیادہ کیا کہتا جو شیخ فریدالدین عطار نے فرمایا ہے۔

کفر کافر را و دیں دار را ذرۂ دردت دل عطار را

اسلامی تہذیب میں شاعری اور فن تعمیر کی پوری رونق نظر آتی ہے۔ مصوری کا چرچا بہت کم تھا اور مورت سازی بالکل رائج ہی نہ ہوئی۔ مسلمانوں میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان فنون کو برتنا مذہب نے منع کیا ہے۔ یورپی مستشرق اسے نہیں مانتے۔ تصویریں بنانے کی صریحی ممانعت قرآن میں نہیں ہے، اور وہ حدیث جس کے مطابق تصویر بنانے والے سے قیامت کے روز کہا جائے گا کہ اس میں جان ڈالے مستند نہیں ہے۔ دراصل مسلمانوں میں مصوری اور مورت سازی سے پرہیز کرنے کا خیال ایک بحث کی بدولت پیدا ہوا جو

آٹھویں صدی کے وسط میں بازنطینی قیصر کے ایک حکم کی بدولت عیسائیوں میں جاری ہوئی اس میں ایک فریق کا دعویٰ یہ تھا کہ تصویروں اور مورتوں کی پرستش کرنا بت پرستی ہے اور اس لئے جائز نہیں دوسرا فریق رائج طریقے کی حمایت کرتا تھا۔ اس بحث سے مسلمان علمار نے بھی اثر لیا۔ تصویروں اور صلیبوں کا بنانا غلط تھا تو صرف عیسائیوں کے لئے نہ تھا۔ مسلمانوں کو بھی ایسی تصویریں اور مجسم شکلیں نہ بنانا چاہیے جن کی پرستش کی جا سکے غالباً علمار کی اس رائے پر عمل نہ کیا جاتا اگر مسلمانوں میں مصوری یا مورت سازی کا شوق عام ہوتا، تصویریں نہ بنانا ایک عادت تھی جو شریعت بن گئی۔ بنو امیہ کے جن محلوں کی دیواریں سلامت رہی ہیں۔ ان پر جانوروں کی آرائشی تصویریں بنی ہیں اور برتنوں اور قالینوں پر بھی جانوروں کی شکلیں اور شکار کے منظر بنائے جاتے تھے۔ ان کا شمار ان تصویروں میں نہ ہوتا جن کو بت کہا جا سکتا اگرچہ محتاط علمار جاندار چیزوں کی شکلیں بنانا غلط سمجھتے تھے۔ بنانے کا مقصد خواہ کچھ بھی ہو مسلمانوں نے مصوری اور مورت سازی کی طرف توجہ اس لئے نہیں کی کہ ان کی طبیعت اور ان کا ماحول اس سے مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ ان میں وہ مذہب رائج ہی نہیں ہوا، جس میں آرٹسٹ کی شخصیت احترام کے لائق سمجھی جاتی ہے اس بنا پر کہ وہ ایک نئی چیز تخلیق کرتا ہے یا ماحول کے اثرات کو جذب کر کے اسے ایک نئی شکل میں پیدا یا پیش کرتا ہے۔ ان میں کسی ایک انسان کی شخصیت باقی تمام مخلوق کے مقابلے پر نہیں آتی بلکہ کل وجود کے ایک غیر مشخص یا قانون کے ماتحت ہونے کا احساس بہت قوی اور دوسرے احساسات پر بالکل حاوی نظر آتا ہے اسی وجہ سے وہ ایسی شکلیں بنانے سے جھجکتے تھے، جن میں انفرادیت ہوتی یعنی وہ صفت جو کسی چیز کو اپنی قسم کی چیزوں اور باقی مخلوق سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے یہاں حسن کا معیار مناسبت نہیں تھی بلکہ اقلیدسی تناسب اور اس کی بدولت انھوں نے آرائش کے فن میں کمال حاصل کیا۔ مسلمانوں کی حیاداری نے اس برہنگی کو بھی گوارا نہ کیا تو جو تہذیب کے قدیم دور

میں ہر جگہ حسن کی شان سمجھی جاتی تھی اور حسن پر کوئی پردہ ڈال دیا جائے تو گویا مصور کی آنکھ پر پٹی باندھ دی جاتی ہے۔

موجودہ زمانے میں علوم فکریہ اور علوم صحیحہ نے جو ترقی کی ہے اس کے لئے مسلمانوں نے صرف زمین تیار کی تھی۔ صنعت اور صنعتی نظام میں جو انقلاب ہوئے ہیں وہ مغربی قوموں کی اپنی جدوجہد کا نتیجہ ہیں لیکن اسلامی تہذیب میں ایک خصوصیت تھی جو اسے مغربی تہذیب سے ممتاز کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں وحدت کے تصور نے علم اور عقیدے اصول اور عمل میں پورا ربط قائم رکھا۔ یہ ربط اس نظری تکمیل سے بالکل مختلف ہے جو قدیم ہندوستانی تہذیب کا نصب العین تھی کہ اس کا دار مدار سراسر عقل اور فکر پر تھا اور ہندوستان میں نظری تکمیل ذاتوں کی تقسیم کی بنیاد پر کی گئی تھی۔ مغربی علوم میں اجتماعیات کے ذریعے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن علم اور عقیدہ ابھی تک ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں۔ مسلمانوں میں علم عقیدے کے ماتحت نہ تھا اور اس سے الگ اور بے پروا بھی نہ تھا۔ مسلمان مفکر برابر یہ محسوس کرتے رہے کہ علم کا معیار الگ ہے اور دین کا الگ انھوں نے دونوں میں کوئی فرضی ہم آہنگی قائم نہیں کی نہ عقل کو اس پر مجبور کیا کہ وہ عقیدے کے سامنے سر جھکائے۔ علم اور عقیدے کے درمیان ربط ان واردات قلبی کی بنیاد پر کیا گیا جس کی ایک نمایاں مثال امام غزالی کی روحانی سرگزشت ہے۔ یہی قلبی واردات شخصی جذبہ دینی اور اجتماعی مذہب کو مربوط کرنے کا ذریعہ تھیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو اس سرچشمہ تک پہنچایا جہاں علم اور عقیدہ مل کر ایک وحدت بن جاتے ہیں اور جیسے وہ تفریق جو مادی وجود میں نظر آتی ہے توحید کی ایک دلیل تھی۔ علم اور عقیدے کی وحدت علوم دینی اور دنیادی کی تقسیم سے ثابت کی گئی ہے۔ بہت ممکن ہے نوع انسانی زیادہ لمبے رستے سے پھر اسی حقیقت تک پہنچے جس کی طرف مسلمان مفکر اشارہ کر گئے ہیں اور یہ بات بھی زیادہ وثوق اور یقین کے ساتھ کہی جائے کہ زندگی کا مرکز دین ہے اور انسان کے سارے علم اور عمل کی غرض عبادت ہونا چاہیے۔

سہارنپور کا معاشی جائزہ

آبادی کے مختلف عناصر کا باہمی مقابلہ

تمہید سہارنپور کے مطالعے کے سلسلے میں زیادہ تر سوال نامہ عـ(۱۱) یعنی برادریوں کے بارے میں جوابات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور اس میں خاصی کامیابی ہوئی۔ دوسرا بڑا کام یہ کیا گیا کہ سہارنپور کی سکنائی جائداد میں مسلم اور غیر مسلم اقوام کا نسبتی حصہ معلوم کرنے کے لئے شہر سہارنپور کے مکانات کی ملکیت اور حیثیت کا ایک جائزہ لیا گیا اور اس کام میں بہت زیادہ مدد ان اعداد و شمار سے ملی جو میونسپل کمیٹی نے ہاؤس ٹیکس لگانے کے لئے جمع کرائے تھے۔ اس کے علاوہ ایک سرسری جائزہ شہر کی تجارت و صنعت کا بھی لیا گیا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر اور بندوبست کی رپورٹوں میں جو اعداد و شمار سہارنپور کی تاریخ، یہاں کی آبادی کی تقسیم، یہاں کی معاشی اور معاشرتی حالت کے بارے میں مل سکے۔ ان سے بھی تھوڑا بہت کام لیا گیا۔

برادریوں کا مطالعہ صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اس میں غیر مسلم برادریوں کو بھی مقابلہ کے لئے شامل کیا گیا۔

سہارنپور کے ڈسٹرکٹ گزیٹر سے اقتباسات اپنے جائزہ کے نتائج بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سہارنپور کے ڈسٹرکٹ گزیٹر (مطبوعہ سنہ ۱۹۲۱ء) میں جو امور اس سلسلے میں موجود ہیں ان کا اقتباس درج کر دیا جائے

(الف) ضلع سہارنپور میں آبادی کی مذہبی تقسیم سنہ ۱۹۲۱ء کے گزیٹر میں سنہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے کام لیا گیا ہے اور آبادی کی مذہبی تقسیم کو حسب ذیل الفاظ

میں بیان کیا گیا ہے۔

"گذشتہ مردم شماری (۱۹۰۱ء) کے مطابق ضلع سہارنپور کی مجموعی آبادی میں سے ۶ لاکھ ۸۲ ہزار ۶ سو ۱۹ ہندو اور ۳ لاکھ ۵۱ ہزار تین سو ۱۳ مسلمان، ۵۰ ہزار ۶ سو ۸۸ جین، ۲ ہزار ۹ سو ۷۲ عیسائی، ۲ ہزار ۳ سو ۲۹ آریا، ۴ سو ۷۷ سکھ ۱۲ پارسی، ایک بدھ متی تھے۔ یعنی ۶۵ر۳۱ فی صد ہندو اور ان کے بالمقابل ۳۲ر۹۹ فی صد مسلمان تھے، اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ دوسرے بہت سے اضلاع کی طرح یہاں بھی مسلمانوں کی تعداد میں اپنے پڑوسیوں کے مقابلہ میں زیادہ تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے مجموعی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۱۸۷۲ء میں ۶۱ر۳۱ فی صد تھا۔ ۱۸۹۱ء میں یہ بڑھ کر ۴۱ر۳۲ فی صد ہو گیا، اور ہندوؤں کی تعداد میں اسی نسبت سے کمی واقع ہوتی رہی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نسبتاً بہتر غذا کھانے کی وجہ سے مسلمانوں کی شرح پیدائش اور شرح عمر ہندوؤں کے مقابلے میں بڑھ جاتی ہے۔ اور اس کا یہ بھی سبب ہے کہ مسلمانوں کی مالی حالت بھی مقابلتہً بہتر ہے اور غریب ترین طبقہ میں ان کی کم تر تعداد شامل ہے۔ ضلع کے مختلف حصوں میں مسلم عنصر کی تقسیم اور اس کے نتیجے کے طور پر مجموعی آبادی کے مقابلے میں اُن کی نسبتی تعداد مختلف ہے۔ سہارنپور کی تحصیل میں تقریباً ۴۰ فی صد لوگ مسلمان ہیں۔ اس کے مقابلے میں دیوبند میں ان کا تناسب ۲۴ فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔ نکڑ اور رڑکی کی تحصیلوں میں ان کی تعداد ضلع کے عام اوسط کے مساوی ہے۔ دوسرے مذاہب کو ان دونوں کے مقابلے میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے ۱۹۲۱ء میں ضلع سہارنپور کی کل آبادی ۳ لاکھ ۷۷ ہزار ۶ سو ۵۴ تھی جس میں دو لاکھ ۱۱ ہزار ۵ سو ۷۲ ہندو، ایک لاکھ ۲۵ ہزار ۳ سو ۶۱ مسلمان اور ۱۰ ہزار ۶ سو ۱۰ دیگر لوگ تھے۔

(ب) <u>شہر سہارنپور</u> | سہارنپور شہر کے بارے میں روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس

کی بنیاد ایک بزرگ شاہ ہارون چشتی نے رکھی، جن کی قبر کی زیارت کے لئے اب بھی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آتی رہتی ہے۔ یہ بزرگ محمد بن تغلق کے زمانے میں مشہور ہوئے، اور اس کے تھوڑے عرصے بعد اس جگہ نے اس حیثیت سے کچھ اہمیت اختیار کرلی کہ یہاں ایک فوج رکھی جانے لگی تاکہ وہ مغلوں کے ان حملوں کو روک سکے جو وہ شمال کی جانب سے دوآب پر کرتے رہتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں یہ شہر خاصا بڑا ہوگیا تھا۔ لیکن اس کی اہمیت اس وقت تک زیادہ نہیں ہوئی جب تک کہ روہیلہ نواب ضابطہ خاں ولد نجیب خاں پدر غلام قادر خاں نے اس کو اپنی راج دھانی نہیں بنایا۔ جب برطانیہ نے بالائی دوآب پر قبضہ کیا تو اس شہر کو ضلع کا صدر مقام بنا دیا گیا اور اس وقت سے برابر اس شہر کو اس وجہ سے کہ وہ میرٹھ اور پنجاب کے درمیان ایک تجارتی مرکز تھا تیزی سے ترقی ہوتی رہی۔ اس شہر کی آبادی کی ترقی ذیل کے اعداد سے ظاہر ہوگی۔

سنہ				
۱۸۴۷ء	۳۲	ہزار	۲ سو	۹۴
۱۸۵۳ء	۳۱	"	۶ "	۴۸
۱۸۶۵ء	۴۴	"	۱ "	۱۹
۱۸۷۲ء	۴۳	"	۸ "	۴۴
۱۸۸۱ء	۵۹	"	۱ "	۹۴
۱۸۹۱ء	۷۳	"	۱ "	۹۴
۱۹۰۱ء	۶۱	"	۲ "	۵۲

سنہ ۱۹۰۱ء میں مسلمانوں کی تعداد ۳۷ ہزار ۶ سو ۴۶، ہندوؤں کی ۲۵ ہزار ۸ سو ۳۵، جینیوں کی ایک ہزار ۳ سو ۵۲، عیسائیوں کی ۹ سو ۱۱، جس میں یورپین اور یوریشین بھی شامل تھے، اور دیگر (آریا اور سکھ) کی ۴ سو ۳۲ تھی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں

سہارنپور شہر کی کل آبادی ایک لاکھ ۵ ہزار ۹ سو ۲۲ ہوگئی تھی جس میں مسلمانوں کی تعداد ۵۰ ہزار سات سو ۱۸، ہندوؤں کی ۴۹ ہزار ۸ سو ۸۲ اور بقیہ کی ۵ ہزار ۲۲ تھی۔

(ج) ضلع سہارنپور میں مسلمانوں کی ذاتیں: اس ضلع کے مسلمان زیادہ تر سُنی ہیں۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ۴۲ر ۹۷ فی صد مسلمانوں کا تعلق سنی فرقہ سے تھا اور شیعہ صرف ۱۹ر۱ فی صد تھے اور لال بیگی جو مہتر ہیں اور صرف نام کے مسلمان ہیں ۹۵ر فی صد تھے۔

"مسلم آبادی کی ساخت مختلف نوعیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اگر ایک طرف کچھ لوگ مسلم حملہ آوروں کی اولاد سے ہیں تو دوسری طرف اُن کی اکثریت کا تعلق ان ہندو ذاتوں سے ہے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ موروثی پیشوں سے لگے ہوئے لوگوں میں بھی ایک جُداگانہ ذات بننے کی طرف رجحان پایا جاتا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ماضی قریب میں ذاتوں کا ایک پیچیدہ اور مصنوعی نظام وجود میں آگیا ہے گذشتہ مردم شماری (سنہ ۱۹۰۱ء) کے موقع پر ۹۷ ذاتوں کا شمار کیا گیا تھا اور اس میں وہ ۸۸۲ اشخاص شامل نہیں تھے جن کو کسی ذات میں نہیں رکھا جا سکتا تھا لیکن جن ذاتوں کو اہمیت حاصل ہے ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ۴۲ ذاتوں میں لوگوں کی تعداد ۱۰۰ سے کم تھی۔ اس کے علاوہ ۲۳ ذاتوں میں لوگوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہیں تھی اور آبادی کے ۸۰ فی صد حصّہ کا تعلق صرف گیارہ ذاتوں سے تھا۔

"تیلی:۔ ان ذاتوں میں تعداد کے لحاظ سے اول نمبر تیلیوں کا تھا جن کی تعداد ۴۸ ہزار ۹ سو ۴۲ یا مسلمان آبادی کا ۸۵ر۱۳ فی صد تھی۔ یوپی کے کسی دوسرے ضلع میں ان کی تعداد اتنی نہیں تھی۔ آبائی پیشہ کے لحاظ سے یہ لوگ تیل نکالنے کا کام کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد کا بڑا حصّہ دوسرے پیشوں خصوصاً زراعت سے لگا ہوا ہے۔ سہارنپور اور دیوبند کی تحصیلوں میں ان کی تعداد دوسری تمام ذاتوں سے زیادہ ہے اور ان کی تقریباً نصف تعداد سہارنپور میں آباد ہے۔

جولاہے:۔ ان کے بعد دوسرا نمبر جولاہوں کا ہے۔ ان کی تعداد ۴۴ ہزار ۷ سو ۴۸ یا مسلم آبادی کا ۰۵، ۷، ۱۲ فی صد ہے۔ ان کی زیادہ تر آبادی سہارنپور اور رڑکی کی تحصیلوں میں ہے لیکن دوسری جگہوں میں بھی یہ لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان کی داڑھی مختصر سی ہوتی ہے اور گال تقریباً صاف ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے انھیں آسانی کے ساتھ پہچانا جا سکتا ہے اور یہ لوگ تقریباً ہر گاؤں میں ملتے ہیں، ان کی بیشتر تعداد پارچہ بافی کے آبائی پیشے سے لگی ہوئی ہے۔ لیکن کساد بازاری نے انھیں کھیتی کا کام اختیار کرنے کے لئے مجبور کر دیا ہے اور اس کام میں انھیں خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ ان نے قریبی طور پر شاید اور اصل کے لحاظ سے ایک، بنیہا یا روئی دھنکنے والے لوگ ہیں لیکن ان کی تعداد اس ضلع میں زیادہ نہیں ہے۔

گاڑا:۔ یوپی کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں سہارنپور میں گاڑوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یوپی میں گاڑے میرٹھ کمشنری اور آگرہ اور روہیلکھنڈ کی کمشنریوں کے بعض حصوں میں محدود ہیں۔ صوبہ کی مجموعی تعداد ۵۳ ہزار ۹ سو ۵۲ کے مقابلے میں ان کی تعداد ضلع سہارنپور میں ۴۴ ہزار ۹ سو ۴۶ تھی اور کل مسلمانوں کے مقابلے میں ان کا مجموعی اوسط ۰۸، ۶، ۱۲ فی صد تھا۔ یہ مساوی طور پر منقسم تھے اور نکڑ کی تحصیل میں دوسری ذاتوں کے مقابلے میں ان کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ ان کی اصل کے بارے میں کچھ اپنے آپ کو مغل کہتے ہیں، کچھ سید۔ اگرچہ اکثر صورتوں میں یہ لوگ اپنے آپ کو ان راجپوتوں کی اولاد کہتے ہیں جنھوں نے مسلم حکومت کے ابتدائی زمانے میں اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کا بیان ہے کہ ان کے نام کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ مسلمان ہونے کے بعد انھوں نے اپنے مردوں کو گاڑنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں کئی شکمی ذاتیں پائی جاتی ہیں جن کے نام راجپوتوں کی شکمی ذاتوں سے ماخوذ ہیں۔ گاڑے اعلیٰ درجے کے کاشتکار ہوتے ہیں لیکن اپنے کام میں محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں مقدمہ بازی کی بڑی لت ہے۔ اور قانون کی چھوٹی باتوں سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے زمیندار ان سے گھبراتے ہیں۔

چنانچہ یہ کہاوت مشہور ہے "گاؤں میں گاڑا، کھیت میں جھاڑا" یعنی گاؤں کے اندر گاڑا اتنا ہی پریشانی کا باعث ہوتا ہے، جتنا کھیت میں جھاڑ کانٹے ہوتے ہیں۔

"شیخ:- شیخوں کی تعداد ۲۷ ہزار ۹ سو ۶۳ یعنی مسلم آبادی کا ۶ر۷ فی صد تھی۔ ان میں ۵/۱ کا تعلق سہارنپور تحصیل سے تھا اور باقی ضلع کے مختلف حصّوں میں مساوی طور پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں بہت سے اپنی اصل کے لحاظ سے باہر کے ہیں لیکن ان میں سے کم ایسے ہیں جنھوں نے کوئی امتیاز یا شہرت حاصل کی ہو اور اُن کی ملکیت میں زمینیں بھی نسبتاً کم ہی ہیں۔ ۹ ہزار ۸ سو ۲۸ کا تعلق صدیقی نسل سے تھا اور ۶ ہزار ۵ سو ۲ ۵ کا قریشی سے اور ان دونوں نسلوں میں ضلع کی اور تمام دوسری نسلوں کے مقابلے میں زیادہ شیخ پائے جاتے تھے۔ ۳ ہزار ۴ ۹ انصاری تھے جو ضلع کے سب حصوں میں رہتے تھے لیکن ان کی زیادہ تعداد دیوبند اور نکڑ کی تحصیلوں میں تھی، ایک ہزار ۳ سو ۹۸ فاروقی تھے جو زیادہ تر نکڑ تحصیل میں تھے اور ۹۰۷ عثمانی تھے جو تقریباً تمام کے تمام دیوبند میں تھے دوسری اور نسلیں بھی موجود تھیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی جنھوں نے کسی نسل کا اظہار نہیں کیا یہ عام طور پر وہ لوگ تھے جو ان ہندوؤں کی اولاد تھے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنے آپ کو شیخ کہنا شروع کر دیا تھا۔

"رانگڑ یا مسلم راجپوت:- ان کی تعداد ضلع سہارنپور میں بہت زیادہ تھی یعنی ۲۳ ہزار ۸ سو ۵ ۸ یا مُسلم آبادی کا ۶ر۱۵ فی صد۔ انھوں نے بہت ابتدائی زمانے میں اسلام قبول کر لیا تھا لیکن دوسری نو مسلم ذاتوں کی طرح ان میں بھی بڑی حد تک اپنی اصلی نسل کی خصوصیات اور رسم و رواج ابھی تک باقی ہیں۔ یہ زیادہ تر صدر مقام کی تحصیل میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس جگہ اور نکڑ کی تحصیل میں ان کی اکثریت خالص راجپوت نسل سے نہیں ہے۔ بلکہ چوہان نسل سے ہے۔ مؤخر الذکر کی مجموعی تعداد ۸ ہزار ۲ سو ۸۷ ہے باقی ماندہ میں سے ۸ ہزار ۷ ۴ کا تعلق کتھاسکے علاقے کے پنڈیروں سے ہے اور یہ لوگ خاص طور پر شمال کی دو تحصیلوں میں رہتے ہیں۔ دوسری نسلوں میں جادوں، بھٹ، تو

اور راوت شامل ہیں جن میں سے تقریباً تمام سہارنپور تحصیل میں رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ پنوار، بڑگوجر اور دوسری اور نسلوں کے راجپوت بھی ہیں جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔

"**گوجر**:- مسلمان گوجروں کی تعداد بھی اس ضلع میں غیر معمولی ہے یعنی ۲۰ ہزار ۲ سو ۳۲۔ اس سے زیادہ تعداد یوپی کے کسی دوسرے ضلع میں نہیں ہے۔ ان کی بیشتر آبادی نکڑ اور سہارنپور کی تحصیلوں میں ہے۔ رڑکی کی تحصیل میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ یہاں یہ لوگ اپنے پرانے مذہب پر قائم ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی خاص بات لائق ذکر نہیں ہے کیونکہ ان میں اپنے ہندو بھائیوں کے مقابلے میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اسلام کی صرف ظاہری شکل کو اختیار کیا ہے۔ اس کی روح کو قبول نہیں کیا ہے

"**پٹھان**:- اس کے بعد پٹھانوں کا نمبر ہے۔ ان کی مجموعی تعداد ۱۶ ہزار ۹ سو بارہ ہے۔ خاص طور پر سہارنپور تحصیل میں پائے جاتے ہیں لیکن ویسے پورے ضلع میں مساوی طور پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس خاصی بڑی زمینداری ہے۔ لیکن ایسے خاندان جن کی تعداد بڑی ہو بہت کم ہیں۔ ان کی قدیم املاک برطانوی حکومت کے قائم ہونے کے فوراً بعد ختم ہو گئی تھیں۔ پٹھانوں میں بہت سی نسلوں کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر لائق ذکر یوسف زئی ہیں۔ جن کی تعداد ۵ ہزار ۷ سو ۲ ۸ ہے۔ ان کے بعد ککڑ زئی جن کی تعداد سب سے زیادہ نکڑ اور دیوبند میں ہے۔ ان کے علاوہ لودی سہارنپور اور رڑکی کی تحصیلوں میں اور محمد زئی، دارک زئی، بنگش، خلیل اور آفریدی ہیں

"**فقیر، قصاب، جھوجا، حجام**:- فقیروں کے بارے میں جن کی تعداد ۱۳ ہزار ۸ سو ۸۲ ہے، کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہر جگہ ملتے ہیں۔ ان میں سے بہت کو محض فقیر کہا جاتا ہے۔ اگرچہ ایک خاصی تعداد سائیں اور جوگیوں کی بھی ہے۔ اسی طرح قصاب یا قصائیوں کے بارے میں بھی کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جماعت میں ان کی حیثیت کم سمجھی جاتی ہے اور ان کی شناخت کسی نسلی خصوصیت کی بنا پر نہیں بلکہ پیشہ کی بنیاد پر

کی جا سکتی ہے۔ یہ چاروں تحصیلوں میں پھیلے ہوئے ہیں، اور قدرتی طور پر شہروں میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جھوجھوں کے بارے میں البتہ کچھ باتیں خاص طور پر بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ یوپی کے دوسرے تمام اضلاع کے مقابلے میں سہارنپور میں سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد ۲۱ ہزار ۴ سو ۴۶ ہے۔ سہارنپور کے علاوہ ان کی بڑی تعداد صرف مظفر نگر اور بجنور میں پائی جاتی ہے۔ ان کی ملکیت میں زمینیں کم ہیں۔ لیکن کاشتکار کی حیثیت سے ان کا درجہ بہت ممتاز ہے اور ضلع کے بہترین کاشتکاروں میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ یہ سب تحصیلوں میں ملتے ہیں لیکن ان کی اکثریت رڑکی تحصیل میں پائی جاتی ہے۔ یہ اپنی اصل کے لحاظ سے واضح طور پر ہندو ہیں، اور اپنے آپ کو راجپوت کہتے ہیں۔ اگر اس بات کی رانگڑ اور دوسرے لوگ سختی سے تردید کرتے ہیں۔ اور انھیں ادنیٰ درجے کا سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ غیر معمولی جفاکشی اور ہنر کے مالک ہیں اور اپنی زمین کو بہت توجہ اور جزئی تفصیل کے ساتھ جوتتے ہیں اور اپنے کھیتوں کو اس طرح جز در جز تقسیم کرتے ہیں کہ پٹواری کو خسرہ کے تیار کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ ان کے بعد صرف نائیوں یا حجاموں کی ایسی ذات رہ جاتی ہے جس کی تعداد دس ہزار سے زیادہ ہے۔ ان کی مجموعی تعداد ۱۲ ہزار ۲ سو ۵۹ ہے اور تمام ضلع میں مساوی طور پر منقسم ہے۔

"سید":۔ باقی ماندہ ذاتوں میں صرف سید ایسے ہیں جن کی تعداد ۵ ہزار سے زیادہ ہے۔ ان کی مجموعی تعداد ۷ ہزار ۵ سو ۲۵ ہے۔ اور ان کی اکثریت نکڑ اور سہارنپور کی تحصیلوں میں ملتی ہے۔ ان کی ملکیت میں زمین کی ایک خاص بڑی مقدار ہے۔ لیکن ان کے پرانے خاندان اکثر صورتوں میں زوال زدہ ہیں۔ صرف انبیٹھے کے پیرزادے شاید اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ ایک زمانے میں مظفر نگر کے بارہ سیدوں کے خاندان کی زمینداری اس ضلع میں ممتاز مرتبہ رکھتی تھی لیکن جانسٹھ خاندان کے زوال کے بعد

ان کی زمینداری ان سے لی گئی تھی۔ سیدوں میں نصف سے زیادہ کا تعلق حسینیؑ نسل سے ہے۔ اس نسل کی تعداد یو۔پی میں سب سے زیادہ ہے۔ نکڑ تحصیل میں بخاریوں کی بھی ایک بڑی آبادی ہے اور رڑکی تحصیل میں جعفریوں کی بھی خاصی تعداد ہے۔ باقی ماندہ کا تعلق مختلف نسلوں سے بیان کیا جاتا ہے۔ خاص نسلیں ترمذی اور ہاشمی ہیں۔

دوسری ذاتیں:۔ مسلمانوں کی باقی ماندہ ذاتیں اپنے نام یا پیشے کے لحاظ سے بالکل ہندو ذاتوں جیسی ہیں۔ دھوبی، بہشتی، لوہار، کمہار کی ذاتوں کی تعداد چار ہزار فی کس سے زیادہ ہے۔ ان کے بعد نمبر بہنیا، فقیگی، بنجارا، درزی، تگا، بڑھئی، علوائی مغل اور گھوسیوں کا ہے جن میں سے ہر ایک کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے۔ مسلم کمہاروں کی تعداد غیر معمولی ہے۔ لیکن یہ بات غالباً مقامی حالات کی وجہ سے ہے کیونکہ بعض زمانوں میں اس ضلع میں لوگوں نے وسیع پیمانے پر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ مغل زیادہ تر نکڑ اور سہارنپور کی تحصیلوں میں آباد ہیں۔ نصف کا شمار چغتائیوں میں کیا گیا ہے اور ان کی اکثریت ترکمان ہے۔ مؤخر الذکر شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کا صدر مقام لکھنوتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ یہاں بابر کے زمانے سے آباد ہیں۔ گھوسی، گلہ بان ہیں، اور ہندو اہیروں سے بہت مشابہ ہیں اور زیادہ تر شمال کی تحصیلوں میں رہتے ہیں۔ چھوٹی ذاتوں میں سنار، کمبوہ، صیقل گر یا زرہ ساز اور کھٹیک صوبے کے دوسرے اضلاع کے مقابلے میں یہاں زیادہ تعداد میں آباد ہیں۔ لیکن انھیں کسی طرح محض اس ضلع کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھا جا سکتا۔ بنگالیوں کا بھی یہاں ذکر کرنا ضروری ہے ان کی تعداد صوبے کی مجموعی تعداد ۱۹۴ کے مقابلے میں اس ضلع میں ۸۴ تھی۔ باقی لوگ اودھ میں ملتے ہیں۔ ان کا تعلق آوارہ گرد ذات سے ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ ان کا سلسلہ نسب بنگال کے لودی پٹھانوں سے ملتا ہے۔ لیکن بظاہر یہ لوگ نٹ یا اسی قسم کے دوسرے لوگوں سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) ضلع سہارنپور میں ہندو ذاتیں | سہارنپور کے ہندو عنصر کی ساخت بھی بہت مختلف النوع ہے۔ سال ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں ۷۶ مختلف ذاتوں کے نمائندے دریافت کئے گئے تھے ان میں وہ ایک ہزار ۲ سو ۹۳ افراد شامل نہیں تھے جنھوں نے اپنی کوئی ذات درج نہیں کرائی تھی۔ ان میں سے اکثر کی اہمیت بہت کم تھی۔ صرف ۱۶ ذاتیں ایسی تھیں جو ہندو آبادی کے ۸۸ر۳۹ فی صد پر حاوی تھیں۔ اور ان میں سے ہر ایک میں ۱۰ ہزار سے زیادہ اشخاص شامل تھے اس کے بعد پانچ ذاتیں ایسی تھیں جن میں ۵ ہزار سے زیادہ اشخاص شامل تھے اور ان کا مجموعہ کل ہندو آبادی کا ۲۳ر۵ فی صد ہوتا تھا۔ ۴۱ ذاتیں ایسی تھیں جن میں ۱۰۰ سے کم لوگ شامل تھے۔

چمار:- تعداد کے لحاظ سے سب سے اہم نمبر چماروں کا تھا۔ ان کی حیثیت بہت ادنیٰ سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ضلع کے ہر حصہ میں اُن کی تعداد دوسری ذاتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی اور سہارنپور اور رڑکی کی تحصیلوں میں ان کا غلبہ بہت نمایاں تھا۔ اُن کی مجموعی تعداد ۲ لاکھ ۵ ہزار ۱۶۷ یا کل ہندو آبادی کا ۳۰٫۰۶ فی صد تھی۔ یوں تو یوپی کے اکثر ضلعوں میں چمار ملتے ہیں۔ لیکن ایسے ضلع کم ہیں جن میں ان کی تعداد کی برتری اتنی زیادہ ہو جتنی کہ سہارنپور میں تھی۔ ان کی بیشتر تعداد دیہات کی مزدور پیشہ آبادی پر مشتمل ہے۔ ان کی ملکیت میں کچھ زمینیں بھی ہیں لیکن کاشتکار کی حیثیت سے ان کی جوت میں رقبہ نسبتاً مختصر ہی رہتا ہے کیونکہ اپنے طور پر کھیتی کا کام کرنے کی جگہ یہ زیادہ تر مزدور کی حیثیت سے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ جہاں یہ لوگ کھیت پر کام نہیں کرتے وہاں اپنے پیشہ کے مطابق یہ لوگ اپنے نام بھی بدل لیتے ہیں، مثلاً بیلدار، موچی، راج، مستری جولاہا وغیرہ۔

گوجر:- ان کے بعد، لیکن ان سے بہت پیچھے گوجروں کا نمبر ہے۔ ان کی تعداد ۱۰ ہزار ایک سو ۹۱ یا ہندو آبادی کا ۵ر۷ فی صد ہے۔ یہ ضلع میں غلبے مساوی طریقے پر منقسم ہیں۔ لیکن نکوڑ اور دیوبند کی تحصیلوں میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور سہارنپور

میں نسبتاً کم ہیں۔ یہ ذات زیادہ تر مغربی اضلاع خصوصاً میرٹھ کی قسمت میں محدود ہے
یوپی میں سہارنپور کی مجموعی تعداد سے زیادہ تعداد صرف میرٹھ کے ضلع میں پائی جاتی ہے
گذشتہ زمانے میں سہارنپور کے ایک بڑے حصے کا نام گجرات تھا اور موجودہ زمانے میں
اس ضلع کو لوگ تین مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ مشرق میں گنگا کا نشیبی علاقہ،
کھادر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جمنا کے نشیبی علاقہ کو راؤ ٹولہ کہا جاتا ہے اور
مرکزی حصے کو گجرات کہتے ہیں۔ جس میں گنگوہ، رامپور اور نکڑ کے پرگنے اور مظفر نگر کے
ملحقہ علاقے شامل ہیں۔ اس ضلع میں زمینوں کے سب سے بڑے مالک گوجر ہی ہیں۔ ان کی
زمینداری میں لنڈھورا کی ریاست بھی شامل ہے۔ کاشتکار کی حیثیت سے بھی دوسری
تمام ذاتوں کے مقابلے میں ان کے پاس زمینیں زیادہ ہیں۔ اگرچہ دیوبند کی تحصیل میں چوہان
کاشتکاروں کے پاس ان سے زیادہ رقبہ ہے۔ کاشت کے کام میں یہ زیادہ اچھے نہیں ہیں
اور ابھی تک یہ لوگ اپنی سرکشی اور فتنہ خیزی کی وجہ سے بدنام ہیں۔ یہ لوگ چوری بھی کرتے
رہتے ہیں۔ ان کی تاریخ سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ لوگ پانچ صدیاں
گذرے مغرب سے ترک وطن کرکے یہاں آئے تھے اور یہ ہر جگہ اپنے آپ کو راجپوت نسل سے
کہتے ہیں۔ اس دعوے میں شاید کچھ اصلیت بھی ہے۔ کیونکہ یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ یہ گوجر اپنے
اپنے زمانے کے ان گوجروں سے تعلق رکھتے ہیں جو موجودہ زمانے کے پریہار راجپوتوں
کے اسلاف تھے۔ سنہ ۱۵۴۲ء میں انھوں نے اپنی طاقت دوآب میں بڑھانا شروع کر دی تھی
جس کی وجہ سے شیر شاہ ان کے خلاف سخت کارروائی کرنے کے لئے مجبور ہو گیا تھا لیکن ان کے
سیاسی اثر نے اٹھارھویں صدی کے وسط تک کوئی اہمیت اختیار نہیں کی تھی۔ اس وقت البتہ
رام دیال اور نائن سنگھ نے لنڈھورا اور پریشن ہٹ کی ریاستیں حاصل کیں۔ اس ضلع کے
گوجروں کا تعلق بہت سی نسلوں سے ہے جن کے نام راجپوتوں کی کو نسلوں سے ماخوذ
ہیں۔ ان میں سے خاص طور پر لائق ذکر کھوبر ہیں، جن سے لنڈھورا کے خاندان

سے بھی تعلق ہے۔

"راجپوت":۔ گوجروں کے بعد راجپوتوں کا نمبر ہے ان کی تعداد ۵۴ ہزار ۹ سو ۰۴ یعنی کل ہندو آبادی کا ۳۷ر۶ فی صد تھی۔ سہارنپور تحصیل میں ۱۹ ہزار ۴ سو ۴، دیوبند میں ۱۳ ہزار ۲ ۷، رڑکی میں ۶ ہزار ۴ سو ۴۷، نکڑ میں ایک ہزار ۹ سو ۶۰، دیوبند میں ایک ہزار ۹ سو ۵۴۔ چوہان اگرچہ اپنے آپ کو چھتری کہتے ہیں اور اپنی نسل کا سلسلہ دہلی کے حکمرانوں سے ملاتے ہیں، لیکن ان کا تعلق ایک جداگانہ ذات سے ہے جس کی حیثیت کچھ زیادہ بلند نہیں سمجھی جاتی۔ صحیح راجپوتوں میں سب سے بڑی تعداد پنڈیروں کی ہے۔ ان کا علاقہ وہ ہے جسے کھتا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس میں پرگنہ دیوبند، ناگل اور رامپور کے ۳۶ گاؤں شامل ہیں۔ یہ ایک مضبوط اور مغرور نسل کے لوگ ہیں اور شروع زمانے میں ان کی لوٹ مار کی شہرت گوجروں سے بھی زیادہ تھی۔

"برہمن":۔ ان کی تعداد ۳۴ ہزار یعنی ۶ر۳۰ فی صد ہے یہ خاصے بڑے زمیندار ہیں اور کاشتکار کی حیثیت سے بھی ان کے پاس بڑا رقبہ ہے۔ لیکن ان کی کھیتی کا معیار کم درجے کا ہوتا ہے اور یہ اپنا کام زیادہ تر مزدوروں سے کراتے ہیں ان کی اکثریت کا تعلق گوڑ ذات سے ہے۔

"کہار":۔ پانچواں نمبر کہاروں کا ہے۔ اُن کی تعداد ۱۴ ہزار چار سو ۱۶ یعنی ۷ر۰۶ فی صد ہے، ان کا پیشہ کاشتکاری، پانی بھرنا، گھر کی ملازمت اور ڈولی پالکی اٹھانا ہے۔

"مالی اور سینی":۔ مالی جنھیں باغبان بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا درجہ کھیتی کے کام میں اول ہے۔ ان کی تعداد ۲۹ ہزار چھ سو ۱۱ ہے۔ اس تعداد میں سینی شامل نہیں ہیں جو تقریباً بالکل ان ہی جیسے ہیں ان کی تعداد ۱۵ ہزار ۷ سو ۲۹ ہے۔ یہ دونوں مل کر

کل ہندو آبادی کا ۰۵, ۶ فی صد ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ۹۱۶ کچھی اور ۸۰۱ مراؤ بھی تھے سب کو ملانے کے بعد ان کی تعداد سہارنپور تحصیل میں ۱۳ ہزار ۴ سو ۳۰، رڑکی کی تحصیل میں ۱۱ ہزار ۷ سو ۹۱، دیوبند تحصیل میں ۱۱ ہزار ۲ سو ۹۳ اور نکڑ تحصیل میں ۹ ہزار ۶ سو ۰۴ ہوتی تھی، ضلع کی بیشتر تعداد کا تعلق گوے، بھاگیرتی اور بھنیا گوت سے تھا۔ گوے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ یہ زمیندار بھی ہیں۔ ان میں سے بعض وکیل بھی ہیں ان کا خاص کام پھول ترکاری وغیرہ کی کاشت ہے۔ ویسے تو یہ کھیتی کا ہر طرح کا کام کرتے ہیں لیکن یہ اپنی خاص توجہ زیادہ قیمتی فصلوں کے بونے کی طرف کرتے ہیں۔

بھنگی:۔ بھنگی کے بارے میں جنھیں اس ضلع میں عام طور پر خاکروب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی تعداد ۲۹ ہزار ۴ سو ۵۵ تھی

بنیئے:۔ اپنی دولت اور اپنی اس زمینداری کی وجہ سے جو انھوں نے پیدا کی ہے۔ اس ضلع کی نہایت اہم ذاتوں میں سے ہیں۔ ان کی تعداد مجموعی طور پر ۲۸ ہزار ۹ سو ۴۲ ہے۔ یہ سہارنپور اور رڑکی کی تحصیل میں سب سے زیادہ ہیں لیکن ان کی تقسیم کل ضلع میں خاصی مساوی ہے۔ ان کی بیشتر اکثریت اگروال کی مشہور گوت سے تعلق رکھتی ہے ان کے اس نام کے بارے میں بہت قیاس آرائی کی گئی ہے۔ لیکن اس ضلع کے لوگوں کا بیان ہے کہ یہ لوگ چودھویں صدی کے خاتمہ پر ہریانا کی سرحد کے ایک مقام اگروہہ سے آئے تھے۔ دوسرے گوت، رستوگی، مہیشری، بارہ سینی اور کندو کے ہیں، مگر اکثر صرف سہارنپور اور رڑکی کی تحصیلوں تک بنیوں کی ایک بڑی تعداد کا تعلق وشنوی فرقہ سے ہے، اور لوگوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اکثر جین متی لوگوں کا تعلق بھی اسی ذات اور خصوصاً اگروال گوت سے ہے۔

بڑھئی:۔ پیشہ کے اعتبار سے لکڑی کا کام کرتے ہیں، ان کی تعداد ۲۱ ہزار ۱ سو ۹۳ ہے۔

کوری :- یہ ہندو جلاہے ہیں۔ ان کی تعداد ۱۱ ہزار ۲۴ ہے۔ اور ان کی بڑی تعداد دیوبند کی تحصیل میں پائی جاتی ہے۔

کمہار :- یہ مٹی کے برتن بناتے ہیں۔ اُن کی تعداد ۱۶ ہزار ۸ سو ۴۹ ہے اور ان کی نصف تعداد رڑکی تحصیل میں ہے۔

جاٹ :- اُن کی تعداد ۱۵ ہزار ۱۹۱ ہے اور ان کی ایک تہائی تعداد رڑکی میں ہے۔ یہ لوگ بہت اعلیٰ قسم کے کاشتکار ہیں۔ وسیع پیمانے کی کھیتی کرتے ہیں اور بڑی صبر اور جانفشانی سے کام کرتے ہیں۔ ان کی جوت میں سب سے زیادہ رقبہ پرگنہ منگلور میں پایا جاتا ہے۔

تگا :- محنت میں جاٹوں کے برابر ہیں، لیکن کھیتی کے کام میں ان جیسی مہارت نہیں رکھتے۔ یہ زیادہ تر دیوبند کی تحصیل میں ہیں۔ ان کی تعداد ۱۵ ہزار ۵۱ ہے۔

فقیر :- فقیر........ ۱۳ ہزار ۹ سو ۲۵، جوگی :- ۹ ہزار ۳ سو ۶۶۔ گوشائیں :- ایک ہزار ۷ سو ۳۳۔ بیراگی :- ایک ہزار پانچ سو ۱۳۔ سنیاسی ۵ سو ۳۳۔ ان کے علاوہ اور بھی مثلاً سنیاسی، اداسی اور غیر مشخص تیاگی۔

گڈریا :- ان کی تعداد ۱۲ ہزار ۲ سو ۵ ہے۔ یہ بھیڑوں اور بکریوں کے گلے پالتے ہیں۔ اکثر یہ بھیڑوں کا اون بھی بنتے ہیں۔ دیوبند اس صنعت کا مشہور مرکز ہے۔

نائی وغیرہ :- نائیوں کی تعداد ۸ ہزار ۷ سو ۹۴، لوہاروں کی ۷ ہزار ۶ سو ۹، اہیروں کی ۶ ہزار ۸ سو ۱۱، سناروں کی ۴ ہزار ۴ سو ۴۲، بنجاروں کی ۲ ہزار ۰۴، بنجاروں نے عام طور پر مذہب اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ لوگ پیشے کے اعتبار سے مال ڈھونے کا کام کرتے ہیں اور خاص طور پر یہ شمال کے جنگلی علاقوں میں آباد ہیں جہاں ان کی ملکیت میں بہت سے مویشی اور ٹٹو رہتے ہیں۔

اُس کے بعد دھوبیوں، لودھوں، چھیپیوں، کمبوہوں، اوڈھوں، کھٹیکوں کائستھوں، بھڑبھونجوں اور درزیوں کا نمبر ہے جن کی تعداد ۲ ہزار اور ۵ ہزار کے درمیان ہے۔

ہندو مذہب کے ماننے والے کمبوہوں کی تعداد یوپی کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں اس ضلع میں سب سے زیادہ ہے اور یہ لوگ یہاں پنجاب سے آئے تھے۔ یہ لوگ کھتریوں سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن عام طور پر زراعت پیشہ ہیں اور بعض صورتوں میں انھوں نے زمینداری بھی پیدا کر لی ہے۔ تقریباً تمام لوگ سہارنپور کی تحصیل میں رہتے ہیں اس ضلع کے کائستھوں کا تعلق زیادہ تر بھٹناگر اور سکسینہ گوت سے ہے اور ان کو بہت کم اہمیت حاصل ہے، اگرچہ ان کے پاس تھوڑی سی زمینداری پائی جاتی ہے

اروڑ:۔ اُن کی تعداد ایک ہزار ۲۰ ہے اور صرف رڑکی تحصیل میں رہتے ہیں

بوہرہ:۔ یہ ذات بھی اس قسمت میں خاص طور پر ملتی ہے اور سہارنپور میں اس ذات کے لوگوں کی تعداد ۷، ۳۸ تھی۔ ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ یہ مارواڑ سے آئے تھے اور یہ لوگ تجارت اور لین دین کا کام کرتے ہیں۔ بوہرہ کی اصطلاح کو عام طور پر مہاجن کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔

"جرائم پیشہ یا آوارہ گرد ذاتوں کی نمائندگی بھی اس ضلع میں اچھی تھی مثلاً ہبوڑہ سانسیا، نٹ، کاپر اور ڈگوت، اگرچہ ان میں سے اکثر لوگ پولیس کے شبہ پیدا کے سوال کرنے پر اپنی ذات کچھ اور بتلاتے ہیں۔

جین مت:۔ جین مذہب کے ماننے والے لوگ بھی اس ضلع میں ایک اہم اور با اثر فرقے کی حیثیت سے پائے جاتے ہیں اور ان میں بہت سے دولت مند اور صحرائی جائداد کے مالک ہیں۔ ان کی تعداد میرٹھ کی کل قسمت میں بہت زیادہ ہے اور

ان کو عام طور پر سردگی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان میں سے قریب قریب
سب لوگوں کا تعلق بنیا ذات سے ہے اور چند مستثنیات کو چھوڑکر باقی سب اگروال
گوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ضلع کے ہر حصے میں ملتے ہیں۔ لیکن سہارنپور اور نکوڑ
کی تحصیلوں میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ان کا تناسب تجارت اور ساہوکار
کا کام کرنے والے لوگوں میں بہت زیادہ ہے اور غلہ کی برآمد کی تجارت پر بھی بڑی
حد تک یہی لوگ حاوی ہیں۔

(باقی)

علیگڈھ کے تالے اور دھات کی صنعت کا جائزہ

(مسلسل)

(۷) علیگڈھ میں دہات کے سامان کے فرموں کی مجموعی تعداد| علیگڈھ میں تالے اور دھات کے سامان بنانے والے کتنے فرم ہیں اس بات کا پتہ چلانے کے لئے میں نے سپرنٹنڈنٹ صاحب گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول علی گڈھ سے رجوع کیا۔ ان کے پاس ایک فائل میں اس جائزہ کی نقل موجود تھی جو حکومت یوپی نے ۱۹۳۹ء میں اضلاع کی مقامی صنعتوں کے جائزہ کے سلسلہ میں علیگڈھ کی دھات کی صنعتوں کا کرایا تھا۔ اس جائزہ میں ۳۱۹ فرموں کے نام نام درج کئے گئے تھے اور مندرجہ ذیل باتوں کی صراحت ہر فرم کے بارے میں کی گئی تھی اس کا محل وقوع یعنی شہر کے کس محلہ میں واقع ہے۔ اس کے مزدوروں ملازموں، کلرکوں اور ایجنٹوں کی تعداد اکثر صورتوں میں ان کے نام کی صراحت کے ساتھ، ان کے مالکوں کے نام اور فرم کے کام کی نوعیت۔

اس جائزے کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ ۳۱۹ فرموں میں سے ۱۹۵ کے مالک ہندو اور ۱۲۴ کے مسلمان تھے۔ ہندو مالکوں کے یہاں ہندو ملازمین کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی اور مسلمان مالکوں کے یہاں مسلمان ملازمین کی۔ لیکن ہندوؤں کے یہاں مسلمان بھی ملازم تھے اور مسلمانوں کے یہاں ہندو بھی۔ بعض کام مخصوص طور پر ہندو یا مسلمان کرتے ہیں اور ان کے کرانے کے لئے انھی لوگوں کو ملازم رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً ڈھلیا تقریباً تمام تر ہندو کولی تھے۔ مسلمان ڈھلائی والے بہت کم ہیں مشکل سے پانچ فی صدی نکلیں گے یہاں کی صرائے میں ڈیڑھ سو ڈھلیوں میں سے صرف دو مسلمان ہیں۔ ڈھلیے سب گوشت (خاص طور پر بکرے کی سری) کھاتے اور شراب پیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں قلعی کا تقریباً

تمام تر کام مسلمان کاریگروں کے ہاتھ میں ہے۔ استاد کریم بخش نے یہ کام مسلمانوں ہی کو زیادہ سکھلایا۔ اس لئے قلعی کے کاریگروں میں ہندو صرف ایک دو فیصدی ہوں گے اور قلعی کا کام کرانے والے ہندو مالک بھی مسلمانوں سے کام لینے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ لوہے کا گرم کام (بھٹی کا) زیادہ تر مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ محنت کا کام ہے۔ بھٹی کے سامنے بیٹھنا اور لوہے کو کوٹنا پڑتا ہے۔ گرم کام کرنے والوں میں سارے ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ملے گی۔ سندھ، سرحد، بلوچستان ریلوے کے تمام بڑے کارخانوں میں۔ تالے کے کام میں مسلمان گھیر بنانے والے تقریباً سو فی صدی۔ اسی طرح چابی اور کڑے بنانے والے بھی سو فی صدی۔ سروتا قینچی چاقو بھی شہر علیگڈھ میں زیادہ تر مسلمان ہی بناتے ہیں۔ سیٹیاں بنانے کا کام بھی تقریباً سو فی صدی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اور اس کا موجد ننھے خاں کو سمجھنا چاہئے۔ ٹرنک کے کاریگر بھی مسلمان ہی ہیں۔ دہلی آگرہ اور الہ آباد میں بھی یہ کام مسلمان ہی کرتے ہیں۔ لیٹر بکس بنانے والے بھی مسلمان ہیں۔ ٹین کے کام میں بھی مسلمان زیادہ ہیں۔ سب سے زیادہ ہوشیار استاد عبدالغفور ہیں۔ ٹنکی، بڑے کنستر وغیرہ بناتے ہیں۔

لیکن مہر کھدائی کے کام میں ہندو زیادہ ہیں۔ اس جائزہ میں ۳۱ فرموں میں صرف تین مسلمان فرموں کو دکھلایا گیا ہے۔ تالے کے کام میں بھی ہندو زیادہ ہیں۔ چنانچہ ۱۶۹ تالے کے فرموں میں سے ۱۰۵ فرمیں ہندوؤں کی دکھلائی گئی ہیں۔ ان میں بڑھئی جو اپنے آپ کو پنڈت کہتے ہیں۔ اس کام میں بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ بلڈنگ فٹنگ کے کام بھی ہندو کارخانہ دار آگے بڑھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بیس کی مجموعی تعداد میں صرف پانچ فرمیں مسلمانوں کی دکھلائی گئی ہیں۔ خراد کے کام میں تقریباً برابر برابر ہیں۔

لیکن اس جائزہ کی ایک بڑی خرابی یہ تھی کہ اس میں فرموں کی کوئی تفریق نہیں کی گئی تھی۔ جانسن کا کارخانہ اور گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول بھی اس میں شامل کیا گیا تھا اور دو

تین کاریگروں کو اپنی چھوٹی سی دوکان پر بٹھا کر تالے تیار کرنے والے چابیاں بنانے والے مہر کھدائی کرنے والے، قلعی اور پالش کرنے والے، استاد ڈھلئے وغیرہ بھی شامل تھے۔
اس جائزہ کی رہنمائی میں میں نے مدار دروازہ، ہاتھرس روڈ، بین پوری، سرائے مان سنگھ سرائے پختہ کے فرموں کا مشاہدہ خود اپنی آنکھ سے جاکر کیا۔ یہ سب فرمیں زیادہ تر چھوٹی چھوٹی دوکانیں تھیں جہاں استاد کاریگر اپنے تین چار مددگاروں کے ساتھ بیٹھے کام کر رہے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ دوکان چھوڑ کر کہیں دور چلے گئے تھے، کچھ کا کام ختم ہوگیا تھا، کچھ نے ٹھیکیداروں یا گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول میں ملازم کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے ضرورت ایک دوسرے قسم کے جائزہ کی تھی جن میں کارکنوں کی مختلف حیثیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اعداد و شمار مہیا کئے جاتے۔

جائزہ کی اسی فائل میں ایک فہرست علیگڑھ کے اہم تالے کے کارخانوں کی بھی رکھی ہوئی تھی جس میں ۹۵ فرموں کے نام درج تھے۔ ان میں سے تیرہ تو وہی تھے جن کا ذکر اسٹور پرچیز اور ڈائرکٹر آف کنسٹرکشنز آرمی ہیڈ کوارٹرز کی پسندیدہ فرموں کی فہرست میں کیا جاچکا ہے اور ان کا شمار کاروبار کے پیمانہ کے لحاظ سے اول یا دوم درجہ کی فرموں میں کیا جاسکتا ہے۔ بقیہ یا تو دوسرے درجہ کی فرمیں تھیں یا ان کی حیثیت مشتبہ سی تھی۔ یا پھر وہ محض استاد کاریگر تھے جو بہت چھوٹے پیمانہ پر چند مددگاروں کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ غرض اس فہرست سے بھی میرا کام نہیں چل سکا۔ پھر اس فہرست میں چونکہ محض فرموں کے نام درج تھے اور دوسری کوئی تفصیلات نہیں تھیں، اس لئے محض اس فہرست کے مطالعہ سے اس بات کا بھی پتہ نہ لگایا جاسکتا تھا کہ کون سی فرم مسلمانوں کی ہے اور کون سی غیر مسلموں کی۔

میں چھوٹی صنعتوں کے بارے میں اپنے سوال نامہ کے مطابق معلومات اکٹھا کرنا چاہتا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ اس کے سوال (۲) کی روشنی میں مسلمانوں کی حیثیت کا جائزہ

لینا چاہتا تھا. لیکن اس قسم کی تحقیقات کے لئے جس قدر محنت اور وقت درکار تھا اس کو صرف کرنے کا مجھے موقع نہ تھا. اس لئے میں نے نامکمل تحقیقات پر ہی قناعت کی۔ اس سوال نامے کے عنوان "مزدور دستکار" کے بارے میں بہت سی باتیں مومن انصار بہادری کے حالات، کے تحت ملیں گی کیونکہ اس حیثیت سے اس برادری کے بہت سے لوگ اس کام میں لگے ہوئے ہیں. مزدور دستکاروں کے کام کی نوعیت اس صنعت میں مختلف قسم کی ہے. مثلاً تالے کی تیاری کے سلسلہ میں کئی مختلف قسم کے کاموں کی ضرورت ہے یعنی ڈھلائی کا کام، گھیر، کڑے اور چابی بنائی کے کام، تالے کے جوڑنے اور فٹ کرنے کا کام جس میں گھیر یعنی پتے کی ڈبیا بنانا، کھونٹی اور کڑے کا فٹ کرنا لیور اور کنجی کو ٹھیک کرکے چلانا سب شامل ہوتے ہیں، قلعی کا کام اور ربٹ کرکے تیار کرنے کا کام وغیرہ. تالے کے علاوہ دھات کے اور دوسرے سامان تیار کرانے میں بھی تقریباً یہی صورت ہے. البتہ مہر کی کھدائی کے کام کی ایک جداگانہ نوعیت ہے. شروع میں ڈھلائی اور آخر میں قلعی کی اکثر کاموں میں ضرورت پڑتی ہے اور ان سب کاموں میں کم وبیش استاد کاریگر کے ساتھ کچھ شاگرد یا غیر ماہر مزدور لگے رہتے ہیں. مثلاً ڈھلائی کے کام کو لیجئے. اس میں ایک دھونکنے والا مزدور چاہئے جسے میری تحقیقات کے زمانہ میں ۲؍ تا ۲؍ مزدوری مل رہی تھی اور ایک مٹی پیسنے والا لڑکا جسے ۵؍ سے ۲؍ تک مزدوری مل رہی تھی۔

اس زمانہ میں ڈھلیوں کی مانگ اور تمام کاریگروں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ یہ لوگ ۶۰؍ سے لے کر ۸۰؍ ماہوار تک کما رہے تھے. ایک ایک ٹھیکیدار (اور اس میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے) سات سو روپے سے لے کر ڈیڑھ ہزار روپے تک پیشگی رقم دے کر ڈھلیوں کو اپنا پابند بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان لوگوں کا کام بہت سخت ہوتا ہے۔ اس کام کو تقریباً تمام تر ہندو کوٹھی کرتے ہیں. مسلمان بمشکل دو تین فی صدی کرتے ہیں. یہ سب لوگ روپیہ خوب خرچ کرتے ہیں. بکرے کی سری کھاتے، شراب پیتے، جوا کھیلتے اور عیاشی کرتے ہیں۔

ان میں کچھ ایسے سمجھدار بھی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے شاید دس فی صدی جو روپیہ جمع کر رہے ہیں۔ اور مکان وغیرہ کی مرمت کر رہے ہیں ورنہ زیادہ تر ٹھیکیداروں سے پیشگی لیتے اور اسے بے دردی کے ساتھ اڑاتے ہیں۔ ان کی خام آمدنی اور لاگت کے مندرجہ ذیل نقشے سے ان کی خالص آمدنی کا اندازہ کیا جا سکے گا۔

آمدنی :-

ٹھیکیداروں کے لئے ۲½ اور ۲ تالوں کے لئے شرح = ۳۰/ فی من
ٹھیکیدار اس میں سے ذیلی ٹھیکیداروں یا ڈھلیتوں کو شرح ۲۰/ فی من کی دیتا ہے۔
ملواں تالوں کے ٹھیکہ میں ۲½ کے تالے کم ڈھالے جائیں گے اور ۲ کے زیادہ۔ فرض کیجئے ۱۵ سیر بڑے اور ۵ سیر چھوٹے تالے یعنی روزانہ بیس سیر تالے ایک ڈھلیا تیار کر لیتا ہے تو اس صورت میں ٹھیکہ فی من کی شرح سے ۱۵/ روپے ٹھیکیدار کو اور ۱۰/ ڈھلیتے کو مل سکیں گے۔

لاگت :-

۱- کوئلہ روزانہ ۱۲ سیر ۱۱/ فی من   ۳/
۲- بہروزہ ڈیڑھ پاؤ روزانہ ۵/ فی سیر   ۵/
۳- ارنڈی کا تیل ۳ چھٹانک   ۵/
۴- ریتہ، پیلی کھار روز کے استعمال کی   ۲/
۵- ولائتی کھریا کی مٹی ۲ گریاں   ۲/
۶- سانچے، دھوکنی چمٹا، پگھلانے کا برتن وغیرہ
۷- مزدور دھوکنے کے لئے ایک لڑکا۔   ۱۴/
۸- مٹی چھاننے کے لئے لڑکا   ۵/

میزان   ۱۱/ یا یوں کہئے ۱۱/

یعنی ڈھلیتے کو خالص آمدنی ۱۱/ روپیہ یعنی ماہانہ ...

ڈھلیوں کے ریٹ اس زمانہ میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ جس چیز کو پہلے وہ ۵ر فی درجن ڈھالتے تھے اب آسے ۱۲ر فی درجن ڈھال رہے تھے۔ ۱ اور ۱/۲ ۱ تالوں کی ڈھلائی ۱۰ر درجن تھی۔ ۲ کی ۵ر درجن اور ۱/۲ ۲ کی ۶ر درجن۔

تالا جوڑنے والے کی مزدوری۔ معمولی کام کرنے والے ۸ر ۱۲ر، بڑھیا کام کرنے والے ۱۲ر ۱/۲ ۱ ، جنگ کا کام کرنے والے ۲ر للعہ۔ تنخواہ دار ۵۰ ر ۶۰ ر ماہوار کما رہے تھے۔ تالا جوڑنے والوں میں ساٹھ فی صدی مسلمان کام کرنے والے ہیں۔ پیتل کا کام خصوصیت کے ساتھ مسلمان کرتے ہیں۔ اس میں یہ نوے فی صدی ہیں۔ ہندوؤں میں بڑھئی قوم کے لوگ زیادہ ہیں۔ لوہے کا کام ہندو زیادہ کرتے ہیں مسلمان شاید صرف ۱۵ فی صدی ہیں۔ مسلمان کاریگر سینما زیادہ دیکھتے ہیں۔ ۲۵ فی صدی جوا بھی کھیلتے ہیں اور شراب بھی دس فی صدی پیتے ہوں گے۔

بڑھئی ہندو ہیں جو اپنے آپ کو پنڈت کہتے ہیں اور وہ لوہے کے کام کرتے ہیں۔ ان کی حالت بہت اچھی ہے۔ بمشکل دس فی صدی سینما جاتے ہوں گے۔ جوا وغیرہ بہت کم کھیلتے ہیں۔ بُری عادتیں بہت کم ہیں۔ ان کے مکان پختہ اور دو منزلہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی اولاد میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں میں تعلیم کی اشاعت زیادہ ہے۔ ان کا لباس بہتر ہو گیا ہے۔ ان کے اندر عزت نفس بڑھ گئی ہے۔ آریہ سماج نے بھی ان کی زندگی میں اصلاح کرنے میں حصہ لیا ہے۔ حکومت کی طرف سے چھوٹے کاریگروں کی جو حوصلہ افزائی مختلف طریقوں سے کی جا رہی ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان کے آدمی گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول میں ہیں جو اپنی برادری کے لوگوں کو فائدہ پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ ان میں سے بہت سے لوگ گرد و نواح کے دیہات میں بھی آباد ہیں اور اپنے گھر پر کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہندوؤں میں گاؤں سے جو لوگ تالے بنا کر لاتے ہیں ان میں گڈریے، کھٹیک اور دوسری ذاتوں کے ہندو بھی شامل ہیں۔ دیہات کے کام کرنے والوں سے تالے خریدنے کے لئے علیگڑھ میٹل ورکنگ اسکول کی طرف سے تحصیلوں میں سب ہنڈرس کھولے جاتے تھے جس سے ہندو کاریگروں

کی تعداد کے اس لائن میں بڑھنے کا امکان پایا جاتا تھا۔

چابیاں بنانے والوں میں سب مسلمان ہیں۔ ہندو ایک بھی نہیں ہے۔ مزدوروں کی اوسط آمدنی روزانہ ۱۲ر اور بڑھیا کام کرنے والوں کی عہر ۶ر روزانہ ہو جاتی تھی۔ ان میں سے فی صدی پچاس کے قریب جوا کھیلتے ہیں۔ زیادہ عمر کے علاوہ باقی سب سینما دیکھتے ہیں۔ شراب بھی ۲۵ فی صدی پیتے ہیں۔ اس کام میں مومن انصار زیادہ ہیں۔ پٹھان کم ہیں اور بھشتی بھی ہیں۔

تالا جوڑنے والوں میں مسلمانوں میں سب قوم کے لوگ ہیں۔ انصار زیادہ ہیں۔ انصاری دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک جلاہے دوسرے بھٹیارے۔ پچاس فی صدی انصار ہیں۔ باقی شیخ پٹھان بھشتی ہیں۔

جنگ کے کام (کھلونے وغیرہ) بنانے والوں میں بھی مسلمان زیادہ ہیں۔ ۶ر سے لے کر ۸ر تک مزدوری مل جاتی ہے۔ ان کی عادتیں بھی دوسرے مسلمان کام کرنے والوں جیسی ہیں۔ جنگ کے کام میں عورتیں بھی بہت لگی ہوئی ہیں۔ یہ گھر کے اندر بیٹھ کر کام کرتی ہیں۔ لیکن مسلمان دستکاروں کی آمد و خرچ اور گھر کی زندگی میں کوئی توازن نہیں ہے۔ ان کی عورتیں سلیقہ مند نہیں ہیں۔ ان میں تعلیم نہیں ہے۔ ان کی اولاد کی تربیت خراب ہے اور ان کے اندر ترقی کی کوئی علامات نظر نہیں آتیں۔

کارخانہ دار مزدور کاریگروں سے تین طرح پر کام لیتے ہیں:۔

(۱) کم سے کم ایک مہینہ کی پیشگی دے کر اپنے کارخانہ میں بٹھا کر ان سے کام لیتے ہیں۔

(۲) روپیہ پیشگی دیتے ہیں (ایڈوانس کے طور پر) آرڈر دیتے ہیں اور بعد میں مال لیتے ہیں۔ کچا مال بالکل اپنے پاس سے نہیں دیتے۔ کاریگر اپنے طور پر اپنے گھر پر کام کرتا ہے۔

(۳) دیہات میں کام کرنے والوں کو سب کچا مال اپنے پاس سے دیتے ہیں۔ روپیہ بھی پیشگی اجرت کے طور پر بلکہ اس سے زیادہ دیتے ہیں اور پھر ان سے مال منگاتے ہیں۔

(نوٹ) علی گڑھ میں اجرت بحساب وقت پر کام لینے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ صرف تالے کے جانچ کرنے والے لکھنے پڑھنے والے اور گھومنے پھرنے والے لوگ تنخواہ دار ملازم رکھے جاتے ہیں

گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول میں اس قسم کے کام کرنے والوں کی تنخواہ کی شرح حسب ذیل تھی:-

- قلی ماہوار اجرت = ۱۲ ماہوار اور للعہ گرانی الاؤنس
- جانچ کرنے والا (انگزامنر) = ۳ ماہوار اور للعہ گرانی الاؤنس
- ٹیکنیکل اسسٹنٹ = ۵ ماہوار
- محاسب ماہوار اجرت = ۲ تا ۱۱ ماہوار
- سپروائزر آف اسٹورز اینڈ اکاؤنٹس = ۸ ر

گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول ہی میں اس کے سپرنٹنڈنٹ کی زیر نگرانی ایک دست کاروں کی بھرتی کا دفتر قائم تھا جس میں بھرتی کے لئے حسب ذیل ماہوار تنخواہوں کی شرح کا اعلان کیا جا رہا تھا۔

فٹر = للعہ لوہار = ۳ خرادی = للعہ کلرک = ۲ راج = ۲ مزدور یعنی کنکریٹ کا کام کرنے والا = ۲ ٹانکا لگانے والا = للعہ درزی = للعہ ڈرائیور = ۵ اسکول ماسٹر = ۳ بوٹ بنانے والے = ۲ الکٹریشین للعہ اسٹیم اور آئل انجن ڈرائیور = ۲

"مزدور دستکار" کے بعد سوال نامہ ۲ کے سوال (۲) میں دوسرا عنوان "دوکاندار دستکار (الف) آزاد (ب) پابند یا باقی دار کا ہے۔ اس طبقہ کے لوگوں کا رجحان یا تو شکمی ٹھیکیدار یا مزدور دستکار بننے کی طرف رہتا ہے۔ مؤخر الذکر صورت میں ان کے بارے میں تمام وہی باتیں کہی جا سکتی ہیں جو مزدور کاریگر کے بارے میں اوپر کہی گئی ہیں اور اول الذکر صورت میں ان کو "دوکاندار غیر کاریگر" کے عنوان کے تحت لایا جا سکتا ہے۔ میری تحقیقات کے زمانہ میں "دوکاندار غیر کاریگر" چھوٹے تاجر یا ساہوکار کے عنوان کے تحت بہت سے لوگ رکھے جا سکتے تھے۔ سرکاری ٹھیکوں سے نفع کمانے کے لالچ میں بڑے ٹھیکداروں کے نیچے بہت سے شکمی ٹھیکیدار پیدا ہو گئے تھے بڑے ٹھیکے داروں کو جو آرڈر ملتے تھے ان کے ایک حصے کو اپنی براہ راست نگرانی میں کاریگروں سے تیار کراتے تھے اور دوسرے حصہ کو ان شکمی ٹھیکیداروں کے درمیان تقسیم کر دیتے تھے اور ان سے

مقررہ وقت کے اندر مقررہ کوالٹی کا مال مہیا کرنے ورنہ ہرجانہ ادا کرنے کا معاہدہ لکھاتے اور ان سے اس بات کی ضمانت لیتے تھے جنگ سے پہلے بھی علیگڑھ کے تالوں کی مانگ نے غیر کاریگر دوکانداروں کے ایک طبقہ کو پیدا کر دیا تھا اُن میں سخت باہمی مقابلہ جاری رہتا تھا اور بہت کم لوگ کامیاب ہو جاتے تھے۔ ان میں سے اکثر اس چکی کے اندر جس کے اوپر کا پاٹ بڑے ٹھیکیدار اور نیچے کا پاٹ مزدور اور کچا مال فراہم کرنے والا دکاندار ہوتا تھا پس پسا جاتے تھے۔ جنگ سے پہلے اس گروہ میں زیادہ تر چھوٹی حیثیت کے بنیوں اور اس طبقہ کو جس نے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا اپنا پیشہ بنایا ہے شامل کئے جاسکتے تھے۔ اسی گروہ میں بعض وہ چلتے پرزے بھی شامل تھے جو جلد متمول بن جانے کے لالچ میں بے ایمانی کے ساتھ کام کرتے تھے اور علیگڑھ کی صنعت کے لئے بدنامی کا باعث تھے۔ لیکن جنگ کے زمانہ میں ان ایجنٹوں اور بنیوں کے علاوہ کچھ دوسرے اور ایسے لوگوں نے بھی اس سلسلہ میں قسمت آزمائی شروع کر رکھی تھی جن کو اس صنعت کا بالکل کوئی تجربہ نہیں تھا اور غالبًا ایسے لوگوں کو بہت کم کامیابی نصیب ہو رہی تھی۔ اس طبقہ کے تقریبًا تمام لوگ روپیہ لگاتے ہیں یعنی کاریگروں کو پیشگی رقم دے کر اور ان کو ان کے گھر پر بٹھا کر ان سے کام لیتے ہیں ان کا اپنا ذاتی کوئی کارخانہ نہیں ہوتا اور عمومًا ان کے فرم کی کوئی مستقل حیثیت بھی نہیں ہوتی۔ ان کے فرم کے وجود کا ثبوت ان کے خط لکھنے کے چھپے ہوئے کاغذ ہوتے ہیں جن پر نہایت شاندار طریقہ سے ان کے فرم کا نام اور پتہ درج ہوتا ہے۔

اس کے بعد باقاعدہ کارخانہ داروں کا عنوان آتا ہے۔ جس کی دو مزید تقسیمیں ہیں یعنی ایک ایسے کارخانہ دار جو اس فن سے واقف ہیں اور جن کا یہ صنعت آبائی پیشہ ہے ان کے لئے "استاد کارخانہ دار" کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے اور دوسرے وہ جو محض ساہوکار اور آجر اور منتظم کی حیثیت سے کارخانہ کھولتے ہیں اور ان کے لئے "ساہوکار کارخانہ دار" کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے۔ ان لوگوں کی چونکہ مستقل حیثیت ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے بارے میں نامور اور چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ پہلے "استاد کارخانہ داروں" کو لیجئے۔

۱۔ عبد العلیم اینڈ سنز۔ گرانٹ ٹرنک روڈ بنا دیوی۔ وہ سو تین سو آدمی کام کرنے والے

اور مشین کا کام۔ نہایت کامیاب فرم ہے۔ جنگ کے زمانہ میں سرکاری ٹھیکوں کے سلسلہ میں اس فرم کی عزت و شہرت اور بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ سرکاری کام کے سلسلہ میں استاد کاریگروں کے زمرے میں دور دور تک اس کا کوئی حریف اور مدمقابل نہیں تھا۔

۲۔ ایس۔ ایس۔ ڈی۔ برادرز۔ شمس الدین ولد رحیم الدین محلہ قر... اپر کوٹ ساٹھ ستر آدمی کام کرتے ہیں مشین کا کام بھی ہے۔

۳۔ بشیر اور مصطفےٰ۔ کٹشرہ۔ پنچ اور پریس سے کام کرتے ہیں۔ تجوریوں کے قبضے، لٹو وغیرہ سپلائی کرتے ہیں۔ بیس پچیس آدمی کام کرنے والے

۴۔ امام الدین ٹنٹن پاڑہ۔

۵۔ بابو لال کشن لال قطب کی سرائے۔ بیس آدمی کام کرتے ہیں۔ زیادہ تر دیہات میں کام بانٹ دیتے ہیں۔

۶۔ ہردیو ٹپیٹ لاک فیکٹری۔ سودا ماپوری۔ ۵۰ آدمی ہر وقت کام کرتے ہیں لیکن مشین سے کام زیادہ ہوتا ہے۔

۷۔ سکھدیو B.T PAUAL نورنگ آباد۔ تیس چالیس آدمی پہلے سو آدمی تھے۔ ان کی ڈھلائی وغیرہ کے کام کی فیکٹری کانپور میں بھی ہوگئی ہے جس کی وجہ سے یہاں کا کام کچھ کم ہوگیا ہے۔

۸۔ کے۔ ی۔ روبی۔ نورنگ آباد۔ مالک ملوک چند شرما۔ ستر اسی آدمی۔

۹۔ کے۔ آر۔ شنی۔ مہی لال کی سرائے۔ مالک بابو رام چند۔ ان کے گھر پر تو بیس پچیس آدمی کام کرتے ہیں لیکن ویسے کام بہت بڑا ہے۔ بانٹ دیتے ہیں۔

۱۰۔ درگا پرشاد سفید محل بابری منڈی مالک درگا پرشاد۔ بابو تارا چند کے لڑکے ہیں جو امام الدین کے یہاں مستری تھے۔ اب پچاس سے سو آدمی تک کام کرتے ہیں۔

اب ساہوکار کارخانہ داروں کو لیجئے:۔

۱۔ موہن لال صاحب بیرسٹر کے بیٹے سریندر کمار کا کارخانہ۔ ڈی۔ اے۔ وی ہائی اسکول

کے پاس۔ بہت بڑا کام ہے۔ فوج کے سپلائر ہیں۔ علیگڑھ میں یہ اور عبدالعلیم اینڈ سنز ہی دو فوج کے بڑے سپلائر تھے۔

۲۔ امپریل میٹل ورکس حکیم کی سرائے۔ مالک نوبت رام۔ شروع میں ایجنٹ تھے۔

۳۔ ٹیکا رام اینڈ سنز (ویش) مدار دروازہ۔ ڈوبے کا پڑاؤ۔ ساہوکار کی حیثیت سے ترقی کی۔ اب کئی فیکٹریوں کے مالک ہیں۔

۴۔ ہوتی لال کھرنی کی سرائے۔ ان کی فیکٹری کھرنی کی سرائے سے پانچ چھ فرلانگ پر پلا گاؤں میں ہے۔ بٹن، بکلیں، بروچ وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ یہ جانسن کے یہاں پہلے کنٹریکٹر تھے۔ اب وہاں سے ہٹنے کے بعد بڑے پیمانہ پر کام شروع کیا ہے۔ قریب دو سو تین سو آدمی کام کرتے ہیں۔

۵۔ یو۔پی۔ ٹریڈنگ کمپنی۔ بابو کیشب دیو اور پریم دت مصرا۔ کام ایجنسی سے شروع کیا تھا۔ پچاس آدمی کام کرتے ہیں۔

۶۔ ڈائمنڈ جبلی ورکس۔ درگا پرشاد بھارگوا۔ سو آدمی کام کرتے ہیں۔

۷۔ پنڈت ہیرا لال جھا۔ نورنگ آباد۔ گورنمنٹ پوسٹل ورکشاپ میں کنٹریکٹر تھے۔ ایک ایک لاکھ روپیہ کی سپلائی کیا کرتے تھے۔ ان کے یہاں پانچ پانچ سو آدمیوں نے کام کیا ہے۔ اب گورنمنٹ کی لڑائی کی وجہ سے گھر کا کام کم کر دیا ہے۔

۸۔ گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول۔ یہ بھی نہایت بڑے پیمانہ پر تالے کی سپلائی کے کام کو اس وقت چلا رہا ہے۔ اس کے کام نے جتنی ترقی کی ہے ایسی علیگڑھ کے کسی کمپنی والے نے آج تک نہیں کی۔ اس کا انتظام للتا پرشاد صاحب تواری سپرنٹنڈنٹ میٹل ورکنگ اسکول کے ہاتھ میں ہے۔ اس اسکیم کی شروعات پنڈت پرشوتم پاٹھک جی نے کی ہے جو پہلے تالوں کے جانچ کرنے والے تھے۔ اب ترقی دے کر ان کو ٹیکنیکل اسسٹنٹ کر دیا گیا ہے۔ کام ۱۵ جولائی ۱۹۴۲ء سے شروع کیا گیا تھا۔ ۸ جولائی کو پاٹھک جی کا تقرر ہوا تھا اور ایک ہفتہ میں انہوں نے کام چلا دیا تھا۔

سوال نامے کے سوال (۲) میں اس کے بعد کا عنوان "تھوک فروش تاجر اور ساہوکار" کا ہے۔ علیگڑھ میں ایسے تھوک فروش ساہوکار نہیں تھے جو بڑے پیمانہ پر باہر فروخت کرنے کے لئے مال کو تیار کراتے یا خریدتے ہوں اور اس کی فروخت کا کوئی باقاعدہ انتظام کرتے ہوں یہاں اس قسم کا بڑے پیمانہ کا کام صرف بڑے ٹھیکیدار کرتے ہیں جو زیادہ تر گورنمنٹ اور ریاستوں سے آرڈر حاصل کرتے اور ان کی تعمیل کرتے رہتے ہیں۔ بقیہ لوگ کم وبیش چھوٹے پیمانہ پر اپنے مال کو باہر بھیجنے اور اس کی نکاسی کا انتظام کرتے ہیں۔ البتہ یہاں کچھ ایسے تھوک فروش ساہوکار ضرور ہیں جو کچے مال کے بڑے سپلائر ہیں اور یہاں کے اکثر کاریگر اور کارخانہ دار اپنا سامان بنانے کے لئے ان سے کچا مال (لوہا پیتل وغیرہ) نقد اور ادھار خریدتے رہتے ہیں۔ ادھار عموماً ایسا ہوتا ہے جیسا بنک کے ذریعہ آج کل لیا جاتا ہے۔ ان کے نام ذیل میں درج ہیں:-

۱۔ کیول رام۔ پڑاؤ ڈوبے لوہے پیتل کے بڑے تاجر

۲۔ گنگا پرشاد۔ گنگا گنج پڑاؤ ڈوبے لوہے پیتل کے بڑے تاجر

۳۔ چرنجی لال۔ مانک چوک لوہے پیتل کے بڑے تاجر

۴۔ منشی لال دولت رام۔ کنوری گنج چھپٹی لوہے پیتل کے بڑے تاجر

۵۔ گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول۔

گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول کو ایک معنی میں بڑی حد تک صحیح نمائندہ اس عنوان کا سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ کچا مال کاریگروں اور کارخانہ داروں کو مہیا کرتا اور مصنوعہ مال ان سے لے کر باہر فروخت کرنے کے لئے اسٹور کھولتا ہے۔ لیکن دوسرے معنی میں اس کی حیثیت ایک خرید کرنے والے سرکاری ایجنٹ کی سی ہے۔ بہرحال گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول کے پاس کچے مال کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا جسے وہ کنٹرول کی قیمتوں پر اپنے کاریگروں کو ایڈوانس کرتا تھا۔ اس میں حسب ذیل چیزیں شامل تھیں۔

۱۔ پیتل کے ٹوٹے پھوٹے برتن جو مرزاپور سے منگائے جاتے تھے۔ ۲۔ لوہے کی کترن

"⅛ و "¼ و "3/16 اور چادریں (یعنی بڑی کترنیں) ٹاٹا نگر سے ۳۔ گیلوانائزڈ آئرن وائر نمبر ۱۰ و نمبر ۸
پیتل کا مارٹ ۱۲ نمبر ۱۶ نمبر ۱۹ سنگ بھوم سے۔ ۴۔ ایم۔ ایس۔ راؤنڈس ⅝" و ⅜" و ¼" ٹاٹا نگر سے۔
۵۔ جستہ (زنک) ریواڑی سے ۶۔ نوشادر بمبئی سے ۷۔ کوئلہ جھاریا یا رانی گنج سے۔

یہ تمام مال سرکاری قیمتوں پر فروخت کیا جاتا تھا۔ اور سب [illegible] کے لئے سرکاری قیمتیں پہلے سے مقرر کردی گئی تھیں اس پر مال خرید لیا جاتا تھا۔

اوپر کے بیان میں ٹھیکیداروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کو یہاں خاص اہمیت حاصل ہے جب سے گورنمنٹ کا اسٹورز پرچیز ڈپارٹمنٹ قائم ہوا ہے۔ سرکاری ضرورت کا بیشتر سامان انہی ٹھیکیداروں کی معرفت خرید اجانے لگا ہے۔

ٹھیکیدار دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بڑے اور شکمی۔ بڑے ٹھیکیدار کو اگر ۲۵ فی صدی کی بچت ہوتی ہے تو چھوٹے ٹھیکیدار کو اس میں سے ۱۲½ فی صدی تک مل جاتا ہے۔ اور جب چھوٹے ٹھیکیدار یا کارخانہ دار براہ راست آرڈر لے آتے ہیں تو پھر سب منافع ان ہی کو مل جاتا ہے۔

آدھے ٹھیکیدار مسلمان ہیں آدھے ہندو ہیں۔ ہندوؤں میں ویش اور پنڈت وغیرہ برادری کے ٹھیکیدار ہیں۔ مسلمانوں میں زیادہ تر لوہار، پٹھان اور شیخ برادری کے لوگ ہیں۔ مومن انصاریوں میں مشکل سے ایک دو ہوگا۔ یہ سب حنفی ٹھیکیدار ہیں۔ بساطیوں میں بھی ایک دو ہیں مثلاً فضل حق قصائی قریشیوں میں بھی دو ایک ہیں۔

ہندوؤں میں تو جنگ کے زمانہ میں بعض ٹھیکیداروں نے کئی کئی لاکھ پیدا کرلئے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی دو ایک نے کئے ہیں۔ عام طور پر مسلمان ٹھیکیداروں میں کوئی بری عادتیں نہیں ہیں کچھ لوگ جو بوجہ جنگ زیادہ کمانے لگے ہیں۔ ان کی طرز معاشرت ضرور اسراف کی طرف مائل ہوگئی ہے اور ان میں لغو عادتیں بھی کافی سے زیادہ پیدا ہوگئی ہیں طوائفوں میں بھی جانے لگے ہیں چنانچہ ان میں سے ایک کا نام صنواب ۴۲ء سے مشہور ہوگیا ہے۔ جنھوں نے کہا جاتا ہو کہ نوٹوں اور سکوں کا ہار ایک طوائف کے گلے میں ڈالا تھا۔ ورنہ عام طور سے طرز معا[illegible] عقد[illegible] کی جانب سے عموماً شرع

اور صوم صلوٰۃ کے پابند ہیں۔

(۷ا) علیگڑھ کے ممتاز مسلمان تالے والے | علیگڑھ کے تالے اور دھات کی صنعت کا جائزہ ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب ہے کہ ایک فہرست علیگڑھ کے ممتاز مسلمان تالے والوں کی پیش کردی جائے ان کی حیثیت کے بارے میں جو کچھ درج کیا گیا ہے اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان معلومات کے لئے میں تمام تر عبدالعلیم صاحب مالک عبدالعلیم اینڈ سنز کا ممنون احسان ہوں۔

۱۔ نظام الدین اینڈ سنز۔ مانک چوک حیثیت پچیس تیس ہزار۔

۲۔ حافظ محمد اسمعیل اینڈ سنز۔ عوریا باغ حیثیت ایک لاکھ روپے۔

۳۔ عبدالعلیم اینڈ سنز متصل سٹی مسلم اسکول حیثیت سات آٹھ لاکھ (یہ حیثیت عبدالعلیم صاحب نے خود نہیں بتلائی بلکہ باہر کے لوگوں کی بتلائی ہوئی ہے)۔

۴۔ حاجی عبدالرحیم بخش ٹیٹا والے سرائے بی بی۔ حیثیت بیس پچیس ہزار

۵۔ شیخ الہ دین اینڈ سنز مدار دروازہ حیثیت دس بارہ ہزار پرانا کارخانہ پینتیس چالیس سال کا

۶۔ محمد صدیق اینڈ سنز حیثیت دس پانچ ہزار

۷۔ رحیم الدین متصل قرش۔ کنوری گنج۔ حیثیت دو لاکھ کی۔ انمبٹی لاکھ ورکس۔ انھوں نے کلکتہ اور بمبئی میں دوکانیں قائم کرائی ہیں۔ ان کے یہاں پچاس برس سے کاروبار جاری ہے۔

۸۔ حافظ رفیع الدین اینڈ سنز بالائے قلعہ حیثیت بیس ہزار | لیکن یہ دونوں ہمت والے لوگ ہیں۔ لاکھ

۹۔ محمد نسیم صاحب بسالہ امپیریل لاک ورکس بالائے قلعہ حیثیت دس پندرہ ہزار | تک کا کاروبار کرسکتے ہیں۔

۱۰۔ محمد بشیر عبدالصمد صاحب باہری منڈی حیثیت پچاس ساٹھ ہزار بمبئی میں ان کی دوکان ہے۔ جس نے خاصی ترقی کی ہے۔

۱۱۔ حافظ اللہ بخش اینڈ سنز رنگریز باہری منڈی حیثیت پچاس ساٹھ ہزار لین دین کا کام بھی کرتے ہیں۔

۱۲۔ شمس الدین پسر رحیم الدین۔ ایس۔ ایس۔ بڑی برادرز متصل مسجد چھتاری محلہ بنی اسرائیل۔ حیثیت بیس پچیس ہزار۔

۱۳۔ حاجی حیدر بخش حاجی ننھے میاں محلہ بنی اسرائیل۔ حیثیت بیس پچیس ہزار۔ پرانا کام ہے۔ انھوں نے صفیں جانماز اور دری بطور ہدیہ مکہ بھیجی تھیں۔

۱۴۔ شائننگ لاک ورکس مالک عبد الشکور محلہ ٹنٹن پاڑہ حیثیت چالیس ہزار روپے۔

۱۵۔ امام الدین وزیر الدین محلہ ٹنٹن پاڑہ حیثیت بیس پچیس ہزار

۱۶۔ ننھے خاں اینڈ سنز سیٹی بنانے والے ٹنٹن پاڑہ حیثیت دس پندرہ ہزار

۱۷۔ محمد اسمٰعیل سیٹی بنانے والے ٹنٹن پارہ حیثیت ہزار دو ہزار لیکن بڑے تیز آدمی ہیں۔ دو دو سو ماہوار تک کما لیتے ہیں۔

۱۸۔ محمد اسحٰق سیٹی بنانے والے گھنٹیا دربار اسٹریٹ ڈیڑھ دو ہزار

۱۹۔ عبد اللہ خاں نصیر اللہ خاں میٹل کا کام محلہ آتش بازاں حیثیت تین چار ہزار

۲۰۔ عبد الغنی عبد العزیز میٹل کا کام محلہ آتش بازاں حیثیت تین چار ہزار

۲۱۔ وحیدیہ لاک فیکٹری تالے کا کام اور نیا کام میٹل کا بھی کرتے ہیں۔ محلہ چراغچی حیثیت پچیس تیس ہزار۔ بڑے تیز آدمی ہیں۔ ذاتی کوشش سے ترقی کی ہے۔

۲۲۔ احمد علی صمد علی تالے کا کام اور نیا کام میٹل کا بھی کرتے ہیں۔ بابری منڈی بیس پچیس ہزار ذاتی کوشش سے ترقی کی ہے۔

۲۳۔ نبی بخش کرم الٰہی۔ اس کا کاروبار ختم ہو گیا ہے۔ لیکن یہ علیگڑھ کا سب سے بڑا کارخانہ جہان سن کے مقابلہ کا تھا۔ پانسو آدمی کام کرتے تھے۔ ستر اسی ہزار روپے روزانہ کیش خزانہ میں رہتا تھا۔ ان کا کارخانہ کالا محل کہلاتا تھا۔ ان کے مرنے کے بعد کاروبار ختم ہو گیا۔ ان کا ایک لڑکا محمد بشیر عبد الصمد کے نام کی فرم میں شریک ہے۔ ان کے تین لڑکے اور ہیں وہ معمولی طریقے پر کام کر رہے ہیں۔ سب پیسہ ان کے جانشینوں کے [illegible]۔

۲۴۔ تالے کے ایک اور بڑے موجد جن کا کاروبار اب ختم ہوگیا ہے۔ منشی عبدالوحید تھے۔ ان کے لڑکے عبدالوحید صاحب ہیں۔ ان کے پاس تالے کا کاروبار اب نہیں ہے یہ عبدالعلیم اینڈ سنز میں کام کرتے ہیں۔

۲۵۔ نور محمد بالائے قلعہ۔ ان کے فرم کا کمرشل الیکٹرک ورکس ہے۔ بہت بڑا کاروبار الیکٹرو پلیٹنگ کا ہے۔ بجلی کا بہت سی قسموں کا سامان بنتا ہے جسے یہ باہر فروخت کرتے ہیں۔ علیگڑھ میں بجلی کا سامان فراہم کرنے والوں میں یہ سب سے بڑی فرم ہے۔ آج کل میٹل کا کام بھی کرتے ہیں اور لین دین کا کام بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول کے پاس ایک بڑا مکان بنوایا ہے۔ حیثیت پچاس ہزار ہے۔

۲۶۔ علی محمد جے گنج۔ الیکٹرو پلیٹنگ کا کام ہے۔ حیثیت پانچ سات ہزار۔

۲۷۔ جان محمد نیم خاں دہلی دروازہ الیکٹرو پلیٹنگ کا کام حیثیت پچیس تیس ہزار

۲۸۔ مصطفےٰ اینڈ سنز دہلی دروازہ تالے کا کام کرنے والے حیثیت چالیس پچاس ہزار۔

۲۹۔ ایس فضل الدین اینڈ سنز عوریا باغ۔ گورنمنٹ کنٹریکٹر تالے آئرن اسکیل کے۔ بندوق کی مرمت کا کام بھی ہوتا ہے۔ پانی کے پائپ کا کام، بلڈنگ فٹنگ کا سامان، چپراسیں بنتی ہیں۔ الیکٹرو پلیٹنگ کا کام بھی ہے۔ آگ بجھانے کے پمپ بھی بن رہے ہیں۔ ان کا لڑکا پوسٹل سیل کے کام میں ٹھیکیدار ہے جس کا نام محمد رشید ہے۔ ان کی حیثیت پندرہ بیس ہزار ہے۔ بیچ میں ان کو نقصان ہوگیا تھا۔ بہت تیز آدمی ہیں۔

۳۰۔ محمد بخش سلیم الدین عوریا باغ تالے کا کام ستر اسی ہزار کی حیثیت ہے۔ اچھی فرم ہے۔ بڑی ساکھ ہے۔ باہر بھی اور یہاں بھی اور کاریگروں پر بڑا اثر ہے۔

۳۱۔ حافظ نظام الدین عوریا باغ پوسٹل سیل میں گورنمنٹ کنٹریکٹر ہیں۔ حیثیت دو تین ہزار پہلے بڑی حیثیت تھی اب سرمایہ بگڑ گیا ہے۔

۳۲۔ محمد صدیق دہلی دروازہ پوسٹل سیل میں گورنمنٹ کنٹریکٹر حیثیت دو تین ہزار۔ والد کو خاں صاحب کا خطاب ملا تھا۔ لیکن اولاد کی حالت اتنی اچھی نہیں ہے۔

۳۳۔ عبد الحق محمد صدیق دہلی دروازہ۔ پرسنل سیل ہیں گورنمنٹ کنٹریکٹر ان دونوں بھائیوں کی حیثیت دو تین ہزار
(نوٹ) کسی زمانہ میں دہلی دروازہ میں آٹھ دس چوٹی کے کارخانے تھے سب ختم ہو گئے۔

۳۴۔ کلب مینوفیکچرنگ کمپنی۔ بالائے قلعہ میٹل کے گورنمنٹ کنٹریکٹر ہیں حیثیت تیس چالیس ہزار الیکٹرو پلیٹنگ کا کام بھی ہے سب سے پہلے علیگڑھ میں بیرل (Barrel) کے ذریعہ الیکٹرو پلیٹنگ انھوں نے ہی شروع کیا۔

۳۵۔ حاجی منیر الدین حاجی نذیر الدین محلہ دوبے کا پڑاؤ لوہے کا کام کرنے والے حیثیت ستر اسی ہزار ان کی علیگڑھ میں اور باہر بڑی ساکھ ہے۔ یہ لوہے کی مختلف چیزیں بنا کر بھی بیچتے ہیں۔ مثلاً تالوں کے گھیر تالے کے کڑے، گھوڑے کے نعل وغیرہ۔ ان کے یہاں تالے بھی بنتے ہیں تالے کے میٹریل کو بہت بڑے پیمانہ پر سپلائی کرتے ہیں سب سے خوبی اور عزت کی بات یہ ہے کہ تمام صرافہ کی چاندی ان کے یہاں آکر کٹتی ہے۔ اس سے ان کی ساکھ کا پتہ چلتا ہے۔ صوم وصلواۃ کے پابند ہیں۔ ذاتی پیسے سے دوکان کے اوپر مسجد بنائی ہے۔ چاندی کی کٹائی کے تمام پیسے مسجد میں لگاتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے محنت کرتے ہیں اور اس کمائی کو مسجد کی تعمیر میں لگاتے ہیں۔

۳۶۔ عبد الحکیم اینڈ سنز محلہ چھ پیٹی متصل قرش۔ الیکٹرو پلیٹنگ کا کام۔ حیثیت دو تین ہزار۔ نور محمد اور یہ ایک ہی خاندان سے ہیں اور ان کے والد تمام شہر میں الیکٹرو پلیٹنگ کے کام میں استاد مانے جاتے ہیں۔ تیزاب کی رنگائی اور سونے چاندی کے ملمع کا کام خاندانی ہے انہی کے یہاں سے یہ کام پھیلا ہے زیورات اور سامان پر انہی کے یہاں سے سونے چاندی کا ملمع شروع ہوا ہے۔ یہ لوگ ابتداءً دہلی دروازہ کے رہنے والے تھے۔ ۳۷۔ محمد اسمٰعیل سرائے سلطانی تالے کا کارخانہ حیثیت تین چار ہزار۔ ۳۸۔ ولی محمد سرائے سلطانی۔ چابی کا کام بہت بڑا تھا اب کچھ میٹل کا کام شروع کر دیا ہے۔ حیثیت آٹھ دس ہزار۔ ۳۹۔ زاہد حسین ٹنٹن پارہ۔ براس ٹپ بناتے ہیں۔ ان کی مدراس میں تالے کی دوکان تھی۔ جنگ کے ہنگامے کی وجہ سے بند کر کے چلے آئے مدراس میں ان کا بہت روپیہ رہ گیا۔ موجودہ حیثیت چار پانچ ہزار۔ ان کے مورث اعلیٰ اچھے سیدوں میں تھے۔

۴۰۔ عبد الرحمٰن عبد السلام بالائے قلعہ تالے کا کام بمبئی میں تالے کی دوکان ہے۔ ان کے لڑکے نے کئی دفعہ کا روبار بگاڑا سنبھالا ہے۔ اب حالت اچھی ہو گئی ہے۔ بیس پچیس ہزار کی حیثیت کے آدمی ہیں۔

(۴۱) رشید احمد انصاری۔ محلہ چراغ چیاں۔ تالے کا کام آٹھ دس ہزار کی حیثیت ہے۔

۴۲۔ عبدالغفور انصاری محلہ چراغ چیاں بیس ہزار کی حیثیت ہوگی۔
(نوٹ) انصاریوں میں اور بہت سے آدمیوں کے اچھے اچھے کام تھے لیکن اب ختم ہوگئے ہیں
۴۳۔ ایس نظام الدین اینڈ سنز ماموں بھانجہ تالے کا کام حیثیت چالیس پچاس ہزار۔
۴۴۔ عبدالمجید عبدالحفیظ کالا محل تالے کا کام حیثیت بارہ ہزار
۴۵۔ نظیر احمد ننھے خاں سرائے بی بی۔ تالے کا کام اور میٹل کا کام بھی حیثیت آٹھ دس ہزار روپے
ان کے علاوہ اور بہت سے تالے کے کام کرنے والے لوگ ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت اتنی کم ہے کہ کارخانہ داروں کی جگہ ان کا شمار کارگیروں میں کرنا زیادہ موزوں ہے۔

(نوٹ) اوپر جو حیثیت درج کی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے پاس ذاتی سرمایہ اتنا موجود ہے جائداد کی صورت میں، ساز و سامان کی صورت میں یا نقد لیکن اس ذاتی سرمایہ کے ذریعہ وہ کاروبار اس سے بہت زیادہ روپے کا بھی کرسکتے ہیں اور بہت کم کا بھی۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جن کا ذاتی سرمایہ صرف ہزار دو ہزار ہے لیکن بازار میں ان کی ساکھ اچھی ہے۔ روپیہ کا ہیر پھیر کرنا خوب جانتے ہیں اور انھیں ماہوار دو دو سو کی آمدنی یعنی سو دو سو فی صدی منافع ہوجاتا ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کے کاروبار میں زیادہ پائداری اور ثبات نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلہ میں جن لوگوں کی حیثیت زیادہ ہے ان کی آمدنی زیادہ مستقل اور پائدار ہوسکتی ہے اگرچہ ان کے منافع کی شرح اتنی زیادہ نہیں ہوگی۔

(viii) گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول علیگڑھ — جیسا اوپر بیان کیا جاچکا ہے ۱۹۲۶ء میں علیگڑھ میں گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول قائم کیا گیا تھا اس میں بجلی کی قوت محرکہ سے مشینیں چلائی جاتی ہیں اور طلبہ کو حسب ذیل کام سکھلائے جاتے ہیں تالا بنانا اور مہر کھودنا۔ پریس میٹل یعنی ڈائی اور پنچ کا کام۔ اب اس میں مشین کے ذریعہ خراد کا کام بھی کیا جانے لگا ہے۔ ٹھٹیرے کا کام، قلعی اور الیکٹرو پلیٹنگ کا کام نمونہ سازی عمارت اور فرنیچر کی فٹنگ، ڈھلائی گرم بھٹی کا کام، جنرل فٹنگ، ڈرائنگ اور ڈزائن بنانا۔

میں اس بات کی کوئی باقاعدہ تحقیقات نہیں کرسکا کہ اس مدرسے سے متعلق سرکاری ملازمتوں اور طالب علموں کی جماعت میں مسلمانوں کا تناسب فی صدی کیا تھا لیکن بظاہر یہ تقریباً بمنزلہ صفر کے معلوم ہوتا تھا۔

[سرکار کے پورے وسائل کی طاقت اور کچے مال کا اجارہ اُسے ملا ہوا تھا] [کیونکہ نجی صناعوں کے مقابلہ میں] [میٹل ورکنگ اسکول کی طرف سے تالہ بنانے کے کام کے شروع کئے جانے کو علیگڑھ کے نجی صناع بہت اندیشہ اور فکر کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے] مسلمان صناعوں کو خصوصیت کے ساتھ شکایت تھی کیونکہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی طرف سے بالکل نئے لوگوں اور طبقوں کی ہمت افزائی اور مربیانہ سرپرستی کی جارہی تھی جس سے تالے اور دھات کی صنعت کا پرانا توازن بگڑ گیا تھا۔ جنگ کے بعد ان نئے لوگوں کی دھات اور تالے کی صنعت میں کس طرح کھپت ہو سکے گی اور اس کی وجہ سے کن پرانے صناعوں کو اپنا آبائی پیشہ چھوڑ کر پریشان اور سرگرداں پھرنا پڑے گا یہ سوالات سخت خطرناک امکانات کا پتہ دے رہے تھے۔

ادارۂ تعلیم و ترقی کی کتابیں

۱۔ قاعدہ ۴ر — ۲۔ دس سبق ۴ر

۱۔ نماز ۴ر
۲۔ حکایتیں اول ۴ر
۳۔ 〃 دوم ۴ر
۴۔ حبیب خدا ۴ر
۵۔ نظمیں ۴ر
۶۔ میونسپلٹی ۴ر
۷۔ صدیق اکبر ۴ر
۸۔ خط کتابت ۴ر
۹۔ ضلع کا انتظام ۴ر
۱۰۔ قومی گیت ۴ر
۱۱۔ غزلیں ۴ر
۱۲۔ ہمارا ہندوستان ۴ر
۱۳۔ امامی بھی پڑھنے لگے ۴ر
۱۴۔ عمر فاروق ۴ر
۱۵۔ ڈسٹرکٹ بورڈ ۴ر
۱۶۔ شہید کربلا ۴ر
۱۷۔ ہماری دنیا ۴ر
۱۸۔ ایشیا ۴ر
۱۹۔ یورپ ۴ر
۲۰۔ قصہ فسانۂ عجائب ۴ر
۲۱۔ مثنوی میر حسن ۴ر
۲۲۔ گل بکاؤلی ۴ر
۲۳۔ چار درویش اول ۴ر
۲۴۔ 〃 〃 دوم ۴ر
۲۵۔ 〃 〃 سوم ۴ر
۲۶۔ چار درویش چہارم ۴ر
۲۷۔ قصہ حاتم طائی اول ۴ر
۲۸۔ 〃 〃 〃 دوم ۴ر
۲۹۔ 〃 〃 〃 سوم ۴ر
۳۰۔ 〃 منصور موہنا ۴ر
۳۱۔ 〃 فردوس بریں ۴ر
۳۲۔ لیلیٰ مجنوں ۴ر
۳۳۔ شکنتلا ۴ر
۳۴۔ تانگے والا ۴ر
۳۵۔ بھشتی ۴ر
۳۶۔ صوبے کی حکومت ۴ر
۳۷۔ حکومت ہند ۴ر
۳۸۔ جمہوریت ۴ر
۳۹۔ دوہے ۴ر
۴۰۔ دلچسپ شعر ۴ر
۴۱۔ مرثیے ۴ر
۴۲۔ مسدس حالی ۴ر
۴۳۔ حالی کی نظمیں ۴ر
۴۴۔ گنتی ۴ر
۴۵۔ بڑی گنتی ۴ر
۴۶۔ پہاڑے پیمانے ۴ر
۴۷۔ اجرت کا حساب ۴ر
۴۸۔ تنخواہ کا حساب ۴ر
۴۹۔ جانورنامے ۴ر
۵۰۔ ترنرِ کام ۴ر
۵۱۔ حالات قرآن مجید ۴ر
۵۲۔ تعلیمات 〃 (عقائد) ۴ر
۵۳۔ 〃 〃 (عبادات) ۴ر
۵۴۔ 〃 〃 (اخلاق) ۴ر
۵۵۔ 〃 〃 معاملات ۴ر
۵۶۔ قصص قرآن مجید حصہ ۱ ۴ر
۵۷۔ 〃 〃 〃 ۲ ۴ر
۵۸۔ کعبہ شریف ۴ر
۵۹۔ حدیث شریف ۴ر
۶۰۔ عثمان غنی ۴ر
۶۱۔ علی مرتضیٰ ۴ر
۶۲۔ صحابہ کرام حصہ ۱ ۴ر
۶۳۔ 〃 〃 حصہ ۲ ۴ر
۶۴۔ 〃 〃 حصہ ۳ ۴ر
۶۵۔ 〃 〃 حصہ ۴ ۴ر
۶۶۔ 〃 〃 حصہ ۵ ۴ر
۶۷۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ۴ر
۶۸۔ حضرت غوث پاک ۴ر
۶۹۔ اجمیری خواجہ ۴ر
۷۰۔ نظام الدین اولیا ۴ر
۷۱۔ گوتم بدھ ۴ر
۷۲۔ کرشن کنھیا ۴ر
۷۳۔ رام کہانی حصہ ۱ ۴ر
۷۴۔ 〃 〃 حصہ ۲ ۴ر
۷۵۔ افریقہ ۴ر
۷۶۔ امریکہ ۴ر
۷۷۔ جنوبی امریکہ ۴ر
۷۸۔ سرزمین ہند ۴ر
۷۹۔ صوبے ۴ر
۸۰۔ دیسی ریاستیں ۴ر
۸۱۔ داستان امیر حمزہ حصہ ۱ ۴ر
۸۲۔ 〃 〃 حصہ ۲ ۴ر
۸۳۔ 〃 〃 حصہ ۳ ۴ر
۸۴۔ 〃 〃 حصہ ۴ ۴ر
۸۵۔ 〃 〃 حصہ ۵ ۴ر
۸۶۔ کہاوتیں ۴ر
۸۷۔ پہیلیاں ۴ر
۸۸۔ گرو نانک ۴ر
۸۹۔ مثنوی میر حسن ۴ر
۹۰۔ گلستان ۴ر
۹۱۔ احمد خاں دکاندار ۴ر
۹۲۔ عبدالرحمٰن راج ۴ر
۹۳۔ نصیب خاں حجام ۴ر
۹۴۔ خدا خدمتگار ۴ر
۹۵۔ پیارے خاں درزی ۴ر
۹۶۔ حفیظ خاں خانساماں ۴ر
۹۷۔ بجو بڑھئی ۴ر
۹۸۔ سمدھو حلوائی ۴ر
۹۹۔ میرا ننھا ۴ر
۱۰۰۔ ہندوستان پانچ ہزار برس پہلے ۴ر

مکتبہ جامعہ دہلی

تاریخ الامت (مکمل)

ازالحاج مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری پروفیسر تاریخ اسلام۔ سیرت پاک سے لے کر خلافت عثمانیہ تک سات جلدوں میں ۔ آٹھویں جلد جو اسی سلسلے کی کڑی ہو۔ قرآن اور اسلامی تاریخ کے فلسفے پر حاوی ہو ۔ قیمت مکمل سٹ ۱۵ روپے ۸ر

پردۂ غفلت (ڈراما) ڈاکٹر سید عابد حسین	عمر	نقش آخر (ڈراما) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی	عمر
انتخاب میر۔ مولوی نورالرحمٰن	۱۲ر	باغبانی پروجکٹ (اسکولوں کے لئے)	۱۲ر
سیاسیات کی پہلی کتاب	۸ر	ہندوستانی کی پہلی کتاب	۸ر
بادشاہ (پرنس کا ترجمہ)	۸ر	عہد نبوی میں نظام مملکت	۸ر

ننھی مرغابی	۵ر	تانبیل خاں	۵ر	سمندر کا عجائب خانہ	عمر
روٹی کس نے پکائی	۹ر	چیتو ستو	۵ر	عقائد اسلام	۴ر
جادو کا گھر	۸ر	لال مرغی	۶ر	ارکان اسلام	۶ر
لومڑی کا گھر	۸ر	دو بھائی	۸ر	ہمارے نبی	۶ر
بی مینڈکی اور کوا	۷ر	عقاب	۸ر	ہمارے رسول	۱۰ر
بندر اور نائی	۹ر	ایورسٹ کی داستان	۵ر	سرکار کا دربار	عمر
ہیو چیو	۸ر	تاریخ ہند کی کہانیاں ۱	۷ر	سرکار دو عالم	عمر
پان کھا کر طبلہ بجائے	۸ر	" " " ۲	۸ر	رسول پاک	عمر
چل میرے مٹکے ٹمک ٹم	۸ر	ترکوں کی کہانیاں	عمر	خلفائے اربعہ	عمر
پھر مٹکیوں کیا خاک؟	۸ر	دنیا کے بچے	۱۰ر	دس جنتی	۱۰ر
پکڑ دم کے ڈکو	۸ر	دنیا کے بسنے والے	۱۰ر	نبیوں کے قصے	۱۰ر
تارا دھرمی تارا	۸ر	مقناطیس کی کہانی	۸ر	محاسن اسلام	عمر
بچوں کی کہانیاں	۵ر	بجلی کی کہانی	۸ر	قومی نظمیں	۸ر
جگنو کی بتی	۵ر	بجلی اور مقناطیس کی کہانی	۸ر	بچوں کا کھلونا	۱۲ر

محنت ڈراما	۸ر	شریر لڑکا (ڈراما)	۷ر

دہلی

ہمارا مکمل پتہ :

جامعہ

زیر ادارت:۔ پروفیسر محمد عاقل ایم۔اے

جلد ۴۱ - نمبر ۳	بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۵۵ء	سالانہ چندہ ۵؍ فی پرچہ ۸؍

فہرست مضامین

پروفیسر مجیب صاحب بی اے آکسن [illegible]

وقف کی دینی حیثیت

دولت مند مسلمانوں نے جو اوقاف مختلف اغراض مثلاً مدرسوں، مسجدوں، خانقاہوں یا امام باڑوں پر کئے ہیں ان کی دینی حیثیت کیا ہے؟

یہ سوال کئی مخلص اصحاب نے مجھ سے کیا۔ اس لئے میں نے اس مسئلے کی تحقیق اور چھان بین کی۔ میں نے دیکھا کہ عام طور پر ائمۂ حدیث و فقہ کے نزدیک وقف کی شرعی حیثیت مسلم چلی آرہی ہے۔ ان کے بیانات سے وقف کی جو حقیقت میں سمجھ سکا، وہ مختصر لفظوں میں یہ ہے:-

۱۔ کسی مال یا جائداد کو مالک اپنی ملکیت سے نکال کر ایک خاص غرض کے لئے روک دے کہ اس کی آمدنی یا پیداوار اسی مخصوص غرض میں صرف کی جائے۔

۲۔ بہت سے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اس میں ابد تک کی شرط لگانی ضروری ہے۔ یعنی وقف ہمیشہ کے لئے ہونا چاہیے ورنہ صحیح نہ ہوگا۔

۳۔ وقف کرنے والے کا فرض ہے کہ وہ کسی کو اس کا متولی بنا دے، اور اس سلسلۂ ولایت کا ہمیشہ کے لئے سامان کر جائے۔

۴۔ موقوفہ مال کی آمدنی یا موقوفہ جائداد کی پیداوار ابد الآباد تک واقف کی معینہ غرض کے سوا بشرطیکہ وہ دین کے خلاف ثابت نہ ہو کسی دوسرے کام میں صرف نہ ہوسکے گی۔

۵۔ اَلْوَقْفُ لَا یُمْلَکُ وَلَا یُبَاعُ وَلَا یُوْھَبُ وَلَا یُوْرَثُ:۔ یعنی وقف نہ کسی کی ملکیت ہوتا ہے، نہ بیچا جاتا ہے، نہ ہبہ کیا جاتا ہے اور نہ اس میں وراثت جاری ہوتی ہے۔

یہ وقف میرے نزدیک قرآن اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔

قرآن کے خلاف اس وجہ سے ہے کہ اس میں جتنی صورتیں مال کے انتقال یعنی ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے ہاتھ میں جانے کی بیان کی گئی ہیں، مثلاً خرید و فروخت، وصیت،

علاثت ، صدقہ وزکوٰۃ ، ہبہ وخیرات وغیرہ ان میں کہیں اشارۃً یاکنایۃً ایسے وقف کا ذکر نہیں ہے جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو۔

بعض فقہانے اس کو وصیت میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ وصیت اور وقف میں دو نمایاں فرق ہیں ۔

۱۔ وقف میں فقہار کے بیان کے مطابق وقف کرنے میں مال واقف کی ملکیت سے خارج ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے وصیت میں موصی کے مرنے کے بعد وصیت کا مال دوسرے کے ہاتھ میں جاتا ہے

۲۔ وقف میں مال واقف کی ملکیت سے نکل کر کسی کی ملک نہیں ہوتا بخلاف اس کے وصیت میں موصی کے مرنے کے بعد موصلے لہٗ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ اور اپنی خواہش کے مطابق اس کو صرف کرتا ہے۔

ایسی کوئی وصیت قرآن سے نہیں ثابت کی جاسکتی جس پر موصی کے مرنے کے بعد کسی کی ملکیت نہ رہے۔

اور وقف عقل کے خلاف حسب ذیل وجوہ سے ہے :۔

۱۔ مال و جائداد فطرتاً مملوک ہیں ۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی کی ملکیت میں نہ ہوں۔ یہی دشواری تھی جس کی وجہ سے بعض فقہا کو یہ کہنا پڑا کہ مال موقوفہ کا مالک اللہ ہوتا ہے، اگر یہ صورت ہے تو پھر تصرف بھی اللہ ہی کا ہوگا ، اور امام وقت جو حکومت الٰہی کا نائب ہوتا ہے اپنی صوابدید کے مطابق اس کو صرف کرے گا نہ کہ مردہ کی خواہش کے مطابق۔

۲۔ وقف کرتے ہی جب مال واقف کی ملکیت سے نکل گیا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اب اس پر اس کا تصرف باقی نہیں رہا ۔ یہ یک وقت اجتماع نقیضین ہے کہ وہ مال کا مالک بھی نہیں ہے لیکن وہ صرف ہو رہا ہے ۔ اسی کی خواہش اور ارادے کے مطابق۔

۳۔ مال یا جائداد سے جو آمدنی یا پیداوار ہوتی ہے وہ زندوں کی محنت سے ہوتی ہے

اس لئے اس کے اوپر زندوں ہی کو متصرف بھی ہونا چاہئے ۔ مردہ کی خواہش کا اس کے اوپر مسلط رہنا کسی صورت سے جائز نہیں قرار پا سکتا ۔ کیونکہ اس سے اکثر حالات میں نقصان ہوتا ہے ۔ وقف کرنے والے کو کیا خبر کہ کل زمانے کی ضروریات کا تقاضا کیا ہوگا یہ تو زندہ ہی سمجھ سکتے ہیں ۔

چنانچہ ایک مضحکہ خیز معاملہ خود میرے شہر میں درپیش ہے وہاں ایک وقف تعزیہ اور امام باڑہ کے اخراجات کے لئے ہے ۔ جو لوگ اس کے متولی ہیں وہ اب اہل حدیث ہوگئے ہیں جو ان امور کو شرک سمجھتے ہیں ۔ مگر واقف کے شرائط کے مطابق ان کو یہ سب مشرکانہ مراسم ادا کرنے پڑتے ہیں ۔ وہ ہر چند چاہتے ہیں کہ ہم اس امام باڑہ کو مدرسہ بنالیں اور وقف کی آمدنی کو تعلیم پر صرف کریں لیکن نہیں کر سکتے ۔ اگر مقدمہ بھی دائر کریں کہ یہ امور شرع شریف کے خلاف ہیں ۔ اس لئے ہم کو فقہا کے فتووں کے مطابق اجازت دی جائے کہ اس آمدنی کو ہم دوسری جائز مد میں صرف کریں تو واقف کی ذریت جو شیعہ ہے اس کو عین مذہب کے مطابق ثابت کردے گی

علاوہ بریں یہ سلسلۂ وقف اگر جائز قرار دیا جائے اور اسی طرح جاری رہے تو دولتمند معلوم نہیں کس قدر جائدادیں وقف کر ڈالیں گے جس سے آیندہ نسلوں پر دنیا تنگ ہو جائے گی ۔ آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اوقاف کا شمار کیا جائے تو ان کی آمدنی سالانہ کروروں روپے تک پہنچتی ہے ، جس کا بڑا حصہ بے کار مصارف میں ضائع جاتا ہے ۔

بعض سادہ دل بزرگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اوقاف ملت کا سرمایہ ہیں جن سے بڑے بڑے قومی کام چل سکتے ہیں ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ملت کا سرمایہ نہیں بلکہ مردوں کا سرمایہ ہیں جو ان کے مخصوص اغراض سے وابستہ ہیں ۔ ان میں سے کچھ تو مفید لیکن زیادہ تر غیر مفید کاموں میں صرف ہو رہے ہیں ۔

۱ - وقف کر دینے سے مال جب واقف کی ملکیت سے خارج ہو گیا [illegible]

کا حق کہاں رہا۔ اگر اس نے اس وقت کسی کو متولی بنایا تھا جب وہ اس کا مالک تھا تو اس کی ملکیت ختم ہوتے ہی متولی کی ولایت بھی ختم ہوگئی الغرض عقلاً وقف میں اس قدر قباحت ہے کہ وہ جائز ہوہی نہیں سکتا۔

میرا خیال ہے کہ اس وقت جبکہ اسلامی خلافت استبدادی حکومت میں تبدیل ہوگئی اور سرمایہ داری مسلمانوں پر مسلط ہوگئی۔ دولت مندوں نے مال سے جہاں دنیاوی آسائشیں حاصل کیں وہاں یہ بھی چاہا کہ اس سے ایک مستقل جائداد آخرت کے لئے بھی بنا لیں جس کا ثواب ابد تک ملتا رہے، اور اس لئے یہ وقف کا طریقہ اختیار کیا۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کی نگاہ قانونی امور میں بہت باریک بیں تھی، وقف کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اور امام ابو یوسف بھی جو بغداد کے قاضی القضاۃ تھے۔ اس امر میں اپنے استاد کے تابع تھے۔ مگر بعد میں ان کی رائے بدل گئی۔ امام سرخسی لکھتے ہیں :-

وکان ابو یوسف یقول اولاً بقول ابی حنیفۃ۔ ولکنّہٗ لما حج مع الرشید فرأی وقوف الصحابۃ بالمدینۃ ونواحیھا رجع فافتیٰ بلزوم الوقف۔

امام ابو یوسف پہلے ابو حنیفہ کے قول پر تھے لیکن جب انھوں نے ہارون الرشید کے ساتھ حج کیا اور مدینہ اور اس کے اطراف میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے اوقاف دیکھے تو ان کے قول سے رجوع کر لیا اور وقف کے جواز کے فتوے دینے لگے

(کتاب المبسوط جلد ۱۲ صفحہ ۲۸)

امام سرخسی کے بیان کے مطابق امام ابو حنیفہ کے نزدیک "وقف" یا "حبس" کا مفہوم صرف یہ تھا کہ وقف کرنے والا مال کو اپنی ملکیت میں روک لے اور اس کے منافع کو صدقہ کر دے۔ یقیناً اس صورت کے جواز میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس کی مثال عاریت کی ہے جو دینے والے کی ملکیت میں رہتی ہے، لیکن نفع اٹھانے کا حق وہ دوسرے کو دے دیتا ہے، اس صورت میں ظاہر ہے کہ واقف کے مرنے کے بعد وقف ورثہ میں تقسیم ہوگا کیونکہ وہ مورث کی

وقف کے جواز پر فقہا کا استدلال قرآن سے مطلقاً نہیں ہے، بلکہ صرف اس روایت سے ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں ایک اچھا نخلستان ملا تھا جس کا نام ثمغ تھا۔ انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں اس کو صدقہ کرنا چاہتا ہوں جس طرح حکم ہو عمل کروں، سرور عالم نے فرمایا کہ

ان شئت حبست اصلها وتصدقت بها۔ اگر تمھاری خواہش ہے تو اصل مال کو روک لو اور اس کی پیداوار کو صدقہ کردو۔

ائمہ ستہ حدیث کے متفق علیہ الفاظ روایت کے یہی ہیں۔ ان سے واضح طور پر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضور کا فرمان یہ تھا کہ نخلستان کو اپنی ہی ملکیت میں روکے رکھو اور اس کے پھل کو صدقہ کرو۔ کیونکہ اس وقت حبس یا وقف کا لفظ ان اصلاحی معنوں میں نہیں بولا جاتا تھا جن میں بعد کے فقہا نے ان کو استعمال کیا ہے۔ غالباً ابوحنیفہ کا یہ خیال کہ مال موقوفہ واقف ہی کی ملک میں رہتا ہے، اسی بنا پر تھا۔

بعد میں اس روایت پر اضافے ہوئے اور اس کے الفاظ میں تبدیلیاں کی گئیں۔ یہاں تک رفتہ رفتہ یہ اس وقف کا ثبوت بنالی گئی جو فقہا نے تجویز کیا تھا، حالانکہ ایسی روائتیں بھی ہیں جو اس کے خلاف ہیں۔

امام طحاوی نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ سورہ نساء میں فرائض کو وراثت نازل ہوجانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حبس کی ممانعت فرمادی، جو میں نے خود سُنا۔ نیز ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب مصنف میں حضرت علی کا قول نقل کیا ہے کہ وراثت سے کوئی چیز روکی نہیں جاسکتی بجز اسلحہ اور سواری کے۔ یعنی جنگ کے ہتھیار یا سواریاں جو جہاد کے لئے دیدی جائیں ان کے سوا اور کسی شے کا کسی مخصوص غرض کے لئے روکنا جائز نہیں ہے۔ وہ ورثہ میں تقسیم ہوگی۔

حضرت ابن عباس کی روایت کا کوئی جواب نہیں مل سکا، لیکن حضرت علی کے قول سے

متعلق بعض فقیہوں نے کہا ہے کہ وہ غیر معتبر ہے اس لئے کہ ان کا عمل اس کے خلاف تھا۔ کیونکہ مصر میں انھوں نے اپنا ایک گھر اپنی اولاد کے لئے خود وقف کیا۔ مگر مصر میں حضرت علی کب گئے، وہاں کون سا مکان بنایا یا خرید کیا، اور وہ کون سی اُن کی اولاد وہاں تھی جس کے لئے اس کو وقف کیا؟

ان میں سے ایک بات کا بھی ثبوت تاریخ سے نہیں ملتا۔

اسلم جیراجپوری

غالب اور اس کے نقاد

بیسویں صدی میں غالب کی مقبولیت خاصی حیرت انگیز ہے۔ یہ دور عوام کا دور ہے عوام پسندی اور امارت سے اُسے نفرت ہے۔ غالب بہت بڑا تند جبیں اور خواص پرست تھا۔ آج نظم اور اس میں ایک پیغام اور اس پیغام کے سماجی پہلو کی تلاش ہے۔ غالب، پیغام اور اس کے سماجی پہلو دونوں سے ماورا ہیں۔ آج کل زبان میں سادگی اور خیال میں آئینے کی سی صفائی پسند کی جاتی ہے۔ غالب کا خیال تو باوجود بلند ہونے کے کہیں کہیں آئینے کی طرح شفاف ہے، مگر غالب کی زبان میں سادگی صرف آخر میں ملتی ہے۔ اس زمانے میں اپنے باغ اور اپنی بہاریں عزیز ہیں غالب ساری عمر ہندوستان کے بجائے ایران و توران پر نظریں جمائے رہے، وہ اپنی فارسی کے مقابلے میں اردو کو ہمیشہ حقیر سمجھا کئے۔ غالب کی شاعری میں کسی خاص نظریہ حیات کی ترجمانی نہیں۔ لطیف کے الفاظ میں "انھوں نے ایک منتشر زاویۂ نگاہ کے سلسلے میں ایک منتشر زندگی بسر کی"۔ پھر کیا بات ہے کہ ان کی مقبولیت بجائے کم ہونے کے بڑھتی جاتی ہے۔

کوئی دن جاتا ہے کہ اس مقبولیت کا تازہ ثبوت نہ ملتا ہو، دیوان غالب کے اچھے سے اچھے ایڈیشن نکل چکے۔ ان پر کئی تنقیدیں بھی شائع ہو چکیں، جنگ اور گرانی کے باوجود انتخاب غالب اور مرقع چغتائی دو دو روپے بکتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ تھوڑے تھوڑے فرق سے حال میں غالب پر تین اچھی کتابوں کا تیسرا ایڈیشن نکلا ہے دیکھنا یہ ہے کہ ان سے ہمیں غالب کے متعلق کیا نئی بات معلوم ہوتی ہے۔

مکاتیب غالب جب پہلی بار ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئے تو ان سے غالب کی زندگی کے ایک ایسے باب پر روشنی پڑتی تھی جو اس وقت تک تاریکی میں تھا۔ جو لوگ شاعر کو

صرف فرشتہ یا ہیرو بنا کر دیکھ سکتے ہیں یا جو دلی، درویش صوفی یا لیڈر ہی کے قایل ہیں، انھیں ان خطوط سے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ غالب نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں سے نئے نئے جتن سے روپیے مانگتے تھے، اور اس میں ذرا بھی نہ شرماتے تھے اس لئے بیشتر خطوں میں روپے کا تقاضا یا اس کی رسید یا روپیہ مانگنے کی نئی تمہید ہے ان میں ادبیت زیادہ نہیں، مگر غالب کی شخصیت پر ان خطوں سے بڑی روشنی پڑتی ہے عرشی نے ایک مفصل مقدمے میں غالب کے رام پور کے دربار سے تعلقات، ان کی اصلاحیں ان کی انشا، املا اور خطوں کی چھپائی کے متعلق تمام ضروری معلومات یک جا کر دی ہیں جس کی وجہ سے کتاب غالب کے طالب علموں کے لئے بہت مفید ہوگئی ہے۔ نئے ایڈیشن میں صاحب زادہ بیتاب کے نام دو خط بہت اہم ہیں۔ یہ خط کیا ہیں، بیتاب کے کلام پر اصلاحیں ہیں، جن سے غالب کی استادی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ محض اچھے شاعر ہی نہیں اچھے استاد اور معلم بھی تھے۔ عرشی نے اپنے دیباچہ میں ناظم کے کلام پر جن اصلاحوں کا حوالہ دیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کولرج کی طرح ان شاعروں میں تھے جو بہت اچھا تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ غالب کے املا اور متعلقات انشا کی تفصیل سے غالب ایک ترقی پسند، آزاد رائے، اور نکتہ سنج مصنف کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ ناظم کی ایک مشہور غزل کا مصرعہ تھا ؎ "غافل نہیں ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط" "غافل نہیں" کے بجائے "احمق نہیں" کرکے غالب نے نئے مصرعہ کی روانی اور خوبی دونوں میں اضافہ کر دیا افسوس ہے کہ کسی نے ابھی تک اس پر توجہ نہ کی کہ ناظم کے یہاں غالب کا رنگ کس قدر جلوہ گر ہے۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔

مہر کی کتاب "غالب" بڑی فاضلانہ کتاب ہے اس میں پیدائش سے لے کر وفات تک غالب کے حالات، ان کی تصانیف نظم و نثر سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس کے پہلے ایڈیشن میں "یادگار" پر جو اعتراضات تھے وہ دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دئے گئے تھے۔

"یادگار" میں غالب کے حالات بہت زیادہ تفصیل سے نہیں دیئے گئے۔ حالیؔ کا مقصد حاصل غالب کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کرنا تھا۔ دوسرے حالی کی "پاک بیں" طبیعت کو رہ رہ کر یہ خیال ستاتا تھا کہ غالب کی زندگی میں قوم کے لئے کوئی افادی پہلو نہیں ہے، در اصل افادی پہلو کا حالی ذرا محدود تصور رکھتے تھے۔ غالب کی زندگی سے وہ فائدہ نہیں پہنچ سکتا جو راہِ نجات یا بہشتی زیور سے پہنچ سکتا ہے۔ لیکن غالب کی زندگی ان دونوں کتابوں سے زیادہ دلچسپ ہے، اس لئے حالی نے حالات پر زور کم دیا، کلام کی تنقید، اس کے تعارف اس کی ترجمانی پر زیادہ زور دیا۔ حالی سے بعض تاریخوں کے تعین اور بعض واقعات کے بیان میں بھی غلطی ہوئی۔ مگر بحیثیت مجموعی اس سے یادگار کی بنیادی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، مہرؔ کی کتاب میں وہ اضافے بہت اہم جو مولانا ابوالکلام آزاد نے کئے ہیں، ان میں پہلی بار غالب کی قید کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے یہاں حالیؔ کو پردہ پوش مجرم ٹھہرایا ہے غالب کی قید محض مجسٹریٹ کی نامہربانی اور کوتوال کی دشمنی کا نتیجہ نہ تھی، غالب کے یہاں باقاعدہ جوا ہوتا تھا، اور فتوحات کا ایک حصہ غالب کو ملتا تھا۔ غالب نے کبھی اپنی رندی پر اور شاہدبازی پر پردہ نہیں ڈالا، انھیں سزا نہیں ذلت ناگوار تھی۔ غالب کے متعلق اتنی حقیقت پسندی سے حالی کام نہیں لے سکتے تھے یہ صرف بیسویں صدی کی عقلیت کی روشنی میں ممکن تھا۔

مہرؔ نے غالب کے حالات کے علاوہ اخلاق و عادات، تصانیف اور کلام، طریق اصلاح اور شاگردوں کے متعلق بھی تین باب لکھے ہیں، اخلاق و عادات کے بیان میں وہ غیر شعوری طور پر غالب کے اپنے بیانات سے بہت زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں، حالانکہ غالبؔ نے جہاں اپنے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ وہ واقعہ نہیں خواہش ہے، حقیقت نہیں، آرزو ہے اگر مکاتیب غالب کا اچھی طرح مطالعہ کیا جائے تو مہرؔ کے بہت سے بیانات کے ماننے میں قدرتی طور پر تامل ہوگا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ غالب کو احسان لینا گوارا نہ تھا، یا غالب بھی صاف دل، راست گفتار تھے یا مخالف سے ہمیشہ عفو و درگذر کرتے تھے، وہ ہر ایک سے نہیں مانگتے تھے لیکن مانگتے

میں خود تامل نہ ہوتا تھا ۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بولتے تھے۔ مگر اُن کا یہ لکھنا کہ پنشن کے باب میں والی رامپور کی کوششوں کو ذرا دخل نہ تھا یا عبدالصمد کو فرضی قرار دینا سمجھ میں نہیں آتا ۔ وہ جتنے اچھے دوست تھے اتنے ہی سخت دشمن تھے ۔ قتیل اور صاحب برہان کے خلاف اگر ان کا لہجہ اتنا تیز نہ ہوتا تو شاید ان کی مخالفت اس قدر شدید نہ ہوتی ۔

مہر کے مقابلے میں اکرام غالب کے حضور میں زیادہ گستاخ ہیں ۔ غالب نامہ کا تیسرا ایڈیشن جواب دو حصّوں میں شائع ہوا ہے ، بعض وجوہ سے مہر و عرش دونوں کی کتابوں سے زیادہ اہم ہے ۔ پہلا حصّہ ، آثار غالب کے نام سے شائع ہوا ہے ، دوسرا جس میں غالب کے فارسی و اردو کلام کا تاریخی ترتیب سے انتخاب کیا گیا ہے ، ارمغان غالب ہے ، مہر و عرش کے یہاں غالب کے حالاتِ زندگی کی تحقیق ہے ۔ اکرام نے آثار غالب میں ایک حصّہ تذکرے کے لئے اور دوسرا تبصرے کے لئے وقف کیا ہے ، تذکرے میں اکرام نے مہر و عرش کی کتابوں سے بہت مدد لی ہے ۔ نیز مہیش پرشاد نے خطوطِ غالب کا جو ایڈیشن مرتب کیا ہے ، اس کو بھی ذہن میں رکھا ہے اور غالب کے مقدمے کی جو روداد رسالہ اردو میں شائع ہوئی تھی اس سے بھی فائدہ اُٹھایا ہے ۔ وہ ایک مسلسل واضح اور روشن تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہیں جس میں نہ حالی کے بیان کی سی تشنگی ہے نہ مہر کی سی عقیدت مندی اور نہ اسد علی انوری کی سی بے لگامی ۔ اگرچہ غالب کے بچپن اور جوانی کی تصویر اب بھی دھندلی سی ہے ۔ ڈاکٹر جانسن کی طرح غالب کے بڑھاپے کے زمانے کی بھی ہمیں مکمل معلومات ملتی ہیں مگر نقادوں کے جوانی اور بچپن کے واقعات کا زیادہ علم نہیں ۔ جانسن اپنے بچپن اور جوانی سے شرماتا تھا ۔ غالب نے اس کا ذکر تو کیا ہے ، مگر تفصیل نہیں لکھی ، اس کے علم کے بعد غالب کی شخصیت کا ارتقا پوری طرح سمجھ میں آسکے گا ۔ اکرام نے ایک عقدے کو بڑی خوبی سے حل کیا ہے ۔ اور وہ غالب اور بہادر شاہ کے تعلقات ہیں ۔ غالب نے ایک مرحبہ ملکہ

واپسی پر یہ واقعہ سنایا تھا کہ آج ہمیں بڑی داد ملی۔ بادشاہ نے فرمایا کہ مرزا تم پڑھتے خوب ہو اس سے بعض اوقات ظفر کی سخن فہمی پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بہادر شاہ کا دل شروع سے غالب کی طرف سے صاف نہ تھا۔ وہ ذوق کا شاگرد، مربی اور قدردان تھا، غالب ذوق کے حریف تھے اور بہادر شاہ کے دل میں ولی عہدی کے وقت سے غالب کی طرف سے گرہ تھی۔

آثار غالب کے دوسرے حصے میں پہلے غالب کے تذکرہ نگاری پر بحث کی گئی ہے اور حالی بجنوری اور لطیف کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد غالب کے ادبی ارتقا کی منزل متعین کرنے کی کوشش ہے۔ اکرام نے لطیف کی طرح غالب کے کلام کے چار دور قائم نہیں کیے بلکہ پانچ کیے ہیں۔ نہ انھوں نے حالی اور بجنوری کی طرح غالب کی جدت پسندی تشبیہات و استعارات، ظرافت اور پہلو دار اشعار کا ذکر کافی سمجھا ہے۔ انھوں نے ان کی نفسیاتی ژرف بینی، لفظی صناعی، ظرافت پر بھی زور دیا ہے۔ اس طرح یہ دوسرا حصہ بہت دلچسپ اور مفید ہو گیا ہے۔ تیسرے حصے میں تبصرۂ عمومی کے نام سے بہت سے عنوان بڑھائے گئے ہیں۔ ان میں سے غالب کی مقبولیت کے اسباب، نیچرل شاعری، غالب کی عشقیہ شاعری، غالب کا فلسفہ، مذہب، مشاہیر اردو شعرا سے غالب کا موازنہ اور مغلیہ تہذیب و تمدن کی ترجمانی قابل ذکر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج بھی یادگار غالب کے دوسرے حصے کی اہمیت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا گیا "یادگار" غالب کی سوانح عمری کے لحاظ سے زیادہ اہم نہیں حالی شخص پر زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتے تھے، ان کا قومی اور سماجی نقطۂ نظر انھیں بہت جلد اچھے کاموں تک لے آتا تھا۔ یادگار میں حالی نے غالب کے کلام کی شرح کر کے ایک غیر معمولی خدمت انجام دی ہے۔ "یادگار" غالب کا انتخاب بھی ہے، غالب کا تذکرہ بھی اور غالب پر تنقید بھی۔ حالی کے بعد اکرام نے کوشش کی ہے کہ آثار غالب اور ارمغان غالب میں

یہ سب چیزیں جمع کر دیں۔ کچھ لوگوں کو ان کی مغربیت مغربی مصنفین کا حوالہ، اور مغربی طریقۂ فکر پسند نہیں۔ بعض ان کی زبان میں کوئی خاص بات نہیں پاتے خاص بات سے غالباً ان لوگوں کی مراد کوئی خاص چاشنی ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ انھوں نے غالب کے کلام، ان کے حالاتِ زندگی، ان کے ماخذ، ان کے معاصرین، ان کے زمانے کی تاریخ، سب کا نہایت غور سے مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے غالب کو کسی خاص عینک سے نہیں دیکھا بلکہ ایک غیر شخصی نقطۂ نظر قائم رکھا ہے۔ وہ بظاہر ایک سانس میں دو باتیں کہہ جاتے ہیں۔ یہ تصویر کے دونوں رُخ دیکھنے کی کوشش ہے، ان میں قوت فیصلہ کی کمی نہیں، اور ان کی رائیں اگرچہ سب قابلِ قبول نہیں، مگر اکثر سنجیدہ اور وزنی ہوتی ہیں، وہ بعض اہم مقامات سے بہت جلد گذر جاتے ہیں ناظم کے یہاں غالب کا اثر انھیں نظر نہیں آتا، مومن کے خاص رنگ کو وہ پہچان نہیں سکتے، اور صرف چیستاں گو مومن کو جانتے ہیں۔ وہ غالب کو ناسخ کا پیرو کہے جاتے جاتے ہیں۔ مگر آثار غالب ہیں، نظر کی وسعت اور گہرائی دونوں کا اتنا ثبوت ملتا ہے کہ کتاب کی خوبی میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

غالب کی مقبولیت کے اسباب پر ہمیشہ بحث کی گئی ہے اور کی جاتی رہے گی حالی نے غالب کی جامعیت پر زور دیا ہے۔ اکرام نے تنوع پر۔ بجنوری کہتے ہیں کہ ان کے ساز سے ہر نغمہ نکلتا ہے، بات ایک ہی ہے۔ کہنے کے انداز مختلف ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ غالب قدیم شعراء میں سب سے زیادہ جدت پسند ہیں، وہ قدامت پرستی سے بیزار ہیں دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنے کے بجائے خود راستہ نکالتے ہیں اور اس پر چلنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ در اصل ایک اچھے ساتھی ہیں، اور اچھا ساتھی بزرگ نہیں ہوتا۔ وہ سب سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ ہماری شاعری کی بساط میں دل والے بہت سے تھے۔ غالب آسے ایک نیا ذہن دیتے ہیں، وہ زندگی کرنے کا پورا پورا حوصلہ رکھتے ہیں۔ گناہوں کے حساب [illegible] حسرت دل کا شمار یاد آتا ہے، وادی پُر خار

میں آبلہ پا طلب کرتے ہیں۔ کوئی بھی بات کہنے پر تکلیف دیتا ہے تو دار پر کھنچے جانے کا لطف یاد کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے جام کو تہہ تک پی جانے کا عزم کرتے ہیں۔ ان کے یہاں جو بلوسی ہے وہ اسی حوصلے کا لازمی نتیجہ اور اسی وجہ سے (Human) یا فطری ہے۔ غالب کے مزاج کی سب سے نمایاں خصوصیت کیا ہے؟ حالی کے نزدیک ظرافت، فیض احمد فیض کے نزدیک اداسی، کسی کے نزدیک رجائیت، کسی کے نزدیک قنوطیت، میرا خیال یہ ہے کہ ان کی سب سے نمایاں خصوصیت آدمیت ہے، میں انسانیت کہتا، مگر اب لوگ انسانیت کو ملکوتیت کے مترادف سمجھنے لگے ہیں۔ یہ آدمیت گناہ آدم کو بھی اتنا حسین سمجھتی ہے کہ بہشت بھی اس کے مقابلے میں بے کیف نظر آتی ہے۔ یہ اشعار دیکھئے، ان میں محض شستگی طنز نہیں، کیسی مزیدار طنز ہے۔

درآں پاک مے خانۂ بے خروش — چہ گنجائش شورش نائے نوش

سیہ مستیٔ ابر باراں کجا — خزاں چوں نہ باشد بہاراں کجا

چہ منت دہد ناشناسا نگار — چہ لذت دہد وصل بے انتظار

نظر بازی و ذوق دیدار کو — بفردوس روزن بدیوار کو

غالب میں بڑی جرأت ہے۔ وہ ہر دل کا چور بیان کر سکتے ہیں۔ ان کے یہاں بڑی چمک دمک ہے، وہ ذہن میں روشنی سی کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی عقابی نگاہ سے دلوں میں ایک خلش پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ خلش اور بے چینی ذہنی زندگی کی قدرتی علامت ہے۔ ان کی ظرافت سے یہ خلش گوارا ہو جاتی ہے۔ مگر کبھی بالکل جاتی نہیں۔ ان کی ظرافت چلبلا نہیں، وہ سمتی وسعتی درنج و راحت کو ہموار کرتی ہے۔ اس سے زندگی کے نشیب و فراز تو کم نہیں ہوتے

پچھلے صفحہ کا نوٹ

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب — اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آوے

حق گویم و نادان بزبانم دہد آزار — یارب چہ شد آن لذت [illegible]

گنوان سے گذرنا آسان ہو جاتا ہے۔ واعظ پر شاعروں نے کتنے دیوان سیاہ کئے ہیں اور طنز کے تیر برسائے ہیں۔ غالب ایک شعر میں یہ سب باتیں کہتے ہوئے گذر جاتے ہیں ؎

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

اکرام نے غالب کی عشقیہ شاعری پر بڑے دلچسپ انداز سے تبصرہ کیا ہے۔ غالب کا عشق ظاہر ہے۔ اس دنیا کا عشق تھا، اور اس کے اثر سے ان کے کلام میں ایک نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی اور حسن کی مصوری بھی ملتی ہے۔ مگر اکرام کی یہ رائے صحیح نہیں کہ غالب کے یہاں چونکہ محبت کا وہ بلند ترین تصور نہیں جو اقبال یا رومی میں ہے، بلکہ وہ "عورت" کے حلقے سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ان کے یہاں وہ درد اور کسک ناپید ہے جو رومی یا اقبال کی خصوصیت ہے۔ بات یہ ہے کہ خالص عاشقانہ شاعری کے لحاظ سے غالب کی شاعری میں میرؔ کی وہ گرمی جو ہڈیوں تک کو پگھلا دے، مومن کی وہ گہری اور حسین جذباتیت، حسرت کی وہ سپردگی اور جوش کی وہ بھبکتی ہوئی مگر تندرست ہوس انگیزی نہیں جو ان کے عاشقانہ کلام کی جان ہے اور اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ غالب اپنے آپ کو کبھی (Lose) نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی غیر معمولی رفعت اُسے روکتی تھی۔ عشق اس کا کبھی کبھی کا دل بہلاوا ہے میرؔ کی طرح اس کی جان کا روگ یا اقبال کی طرح جوش حیات نہیں ہے، اور ہمیں جو ہے اس پر قانع ہونا چاہیے"۔

اکرام نے غالب کے خطوط پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، عام طور پر لوگ خطوط کی دلچسپی، ان کی جدتیں اور القاب و آداب کی موزونیت پر زور دیتے تھے۔ اکرام نے اس میں بھی انشار پردازی کی جو خصوصیات دیکھی اور دکھائی ہیں، وہ واقعی وہاں ہیں۔ نثر پہلے پر تکلف ہوتی تھی، پھر خطیبانہ ہونے لگی، دونوں میں سہارا تھا، ایک صنائع کا دوسرے میں جذباتیت کے سیلاب کا، غالب کے خطوط یوں بھی زندہ ہیں کہ ان میں نثر کا اپنا حسن ہے، ان میں خیال واضح ہے، کم سے کم الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، الفاظ

کا انتخاب اچھا ہے، اور بھوڑے بھیسی کا بیان بھی ذرا سے اشارے سے حسین بن جاتا ہے۔ ان خطوں کی دلچسپی کا راز ان کی ادبیت میں ہے۔ اکرام نے اس راز کو سمجھ لیا ہے۔

اکرام نے غالب کا موازنہ میر، سودا، مومن خسرو فیض سے کیا ہے۔ یہاں اختلاف رائے کی قدم قدم پر گنجائش ہے۔ مگر اس سے شاید ہی کوئی انکار کرے کہ میر، مومن، سودا اور اقبال سب سے جامع غالب کا کلام ہے۔ اور سب سے زیادہ زندگی کے ہر دور میں ساتھ دے سکتا ہے۔ پھر یہ بھی صحیح ہے کہ غالب مغل تہذیب و تمدن کے بہت اچھے ترجمان ہیں، ان میں مغلوں کی نفاست، ہمواری، رواداری، ارضیت سب ملتی ہیں، وہ ایک تہذیبی سرمایہ ہیں۔ ان کی شخصیت میں محض عقلیت یا عارفانہ نظر، یا رکھ رکھاؤ اہم ہیں، تندرہنا، اور زندگی میں ایک تیز روشنی دینا اہم ہے۔ پنشن کے قصے بذات خود کتنے غیر دلچسپ ہیں۔ مگر غالب کی شخصیت کے پرتو سے وہ بھی دلچسپ بن جاتے ہیں۔

اس شخصیت کی سب سے اچھی یادگار ان کا کلام ہے۔ ارمغان غالب میں اکرام نے اُن کے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔ بظاہر انتخاب غالبؔ کے بعد جو خود غالب نے کیا، اس کی ضرورت نہ تھی۔ مگر انتخاب میں صرف غزلوں اور قصیدوں کا انتخاب ہے ارمغان میں تمام اصناف آئے ہیں۔ انتخاب میں کوئی تاریخی ترتیب نہیں ہے، یہاں بھی جو ترتیب ملتی ہے وہ کافی غور و خوض کا نتیجہ ہے۔ اکرام نے اس چیز پر بہت زور دیا ہے کہ ۱۸۴۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک غالب کا اردو کلام بہت کم ہے۔ اور وہ زیادہ تر فارسی میں لکھتے ہیں۔ اس تاریخی ترتیب کے بعد یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ غالب کے کلام میں شروع سے انسانی فطرت کا ایک ایسا شعور اور باوجود بیدل کی تقلید کے فن کا ایک ایسا احساس ملتا ہے جو نہایت غیر معمولی ہے۔ ان کے پہلے دور میں بھی اچھے صاف رواں اشعار کی تعداد کافی ہے، اور دوسرے دور میں جب وہ بیدل کی ظاہری تقلید سے آزاد ہو چکے تھے اور جوانی کے تجربوں نے انھیں عرفی اور نظیری سے قریب کر دیا تھا، اچھے اشعار کا تناسب بہت

کافی ہے۔ یہ ایک دلچسپ انکشاف ہے کہ غالب اردو کے تین چوتھائی اچھے اشعار ۱۸۲۴ء کے لگ بھگ کہہ چکے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جب انھیں اپنی شاعرانہ قدرت کا پورے طور پر علم ہوا تو وہ اردو کی محدود فضا پر قانع نہ رہ سکے اور وسیع تر فضائیں تسخیر کرنے کی انھیں فکر ہوئی۔ بالکل ایسی ہی مثال اقبال کی ہے جو یوں تو اردو فارسی میں لکھتے رہے مگر ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۶ء تک زیادہ تر فارسی کی طرف متوجہ رہے، تا آنکہ حالات انھیں پھر اردو کی طرف لائے۔ انتخاب غالب اگرچہ غالب کا کیا ہوا ہے اور غالب کا اچھا انتخاب ہے۔ مگر کوئی بھی غلطی سے اسے غالب کا بہترین انتخاب نہ کہے، خود عرشی نے ایسے بہت سے اچھے اشعار درج کئے ہیں جو اس انتخاب میں غالب نے شامل نہیں کئے عرشی کا خیال یہ ہے کہ غالب کا معیار اس وقت سہل ممتنع تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لحاظ سے یہ انتخاب خصوصیت رکھتا ہے۔ مگر غالب کی خصوصیت محض سہل ممتنع ہی نہیں ہے۔ غالب جس چیز سے غالب ہوئے وہ ان کا انوکھا اور منفرد خیال اور اس خیال کے لئے ایک نئی استعاروں سے سجی ہوئی اور تشبیہوں سے مالا مال، خیال انگیز اور خیال آفریں زبان ہے۔ یہ مڈلٹن مرے کے الفاظ میں زبان کی فتح اور اسٹائل کی معراج ہے۔ ارمغان غالب میں اس کی جا بجا مثالیں ملتی ہیں۔ اردو کلام عام طور پر سب کے سامنے ہے، ان کی فارسی مثنوی چراغ دہر کے چند شعر دیکھئے۔

نازنینان بنارس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

ادائے یک گلستان جلوہ سرشار ٭ خرامے صد قیامت فتنہ دربار بلالی دو عالم گلستان رنگ ٭ ز تاب رخ چراغان لب گنگ ز رنگیں جلوہ ہا غارت گر ہوش ٭ بہار بستر و نوروز آغوش بہ مستی موج را فرمودہ آرام ٭ ز لغزش آب را بخشیدہ اندام

غالب کی تشبیہات کو نظر انداز کر دیا جائے تو غالب غالب نہ رہ سکیں گے۔ ارمغان غالب میں یہ تشبیہات بھی ہیں اور غالب کی دوسری خصوصیات بھی ملتی ہیں۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

آل احمد سرور

زمین والوں کا تمدّن

مریخ میں ایک جلسہ ہونے والا تھا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی کو جلسہ کرانے کا خیال آیا، اس نے دوسروں سے اس بارے میں گفتگو کی، وہ راضی ہو گئے۔ جلسے کا اعلان کیا گیا اور مقررہ وقت پر لوگ جمع ہوئے۔ جی نہیں، مریخ میں یہ طومار نہیں ہوتا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں، اب تو زمین والوں کی سمجھ میں بھی کچھ کچھ آنے لگا ہے کہ دیکھنا ممکن ہے بغیر اس کے کہ آنکھیں ہوں، حرکت کرنا ممکن ہے بغیر اس کے کہ مقام بدلے اور سمجھنا ممکن ہے بغیر اس کے کہ دماغ زحمت اُٹھائے۔ اور ہاں زمین والے اب بھی جان گئے ہیں کہ زندگی کے لئے زمانے کی قید لازمی نہیں۔ وقت گذرتا ہے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ نہ گذرے۔ تو یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ مریخ میں جلسہ کب ہوا اور کہاں ہوا۔ اس میں لوگوں نے اپنا مطلب کیسے بیان کیا، اور سننے والوں نے ان کی باتیں کیسے سنیں اور کیسے سمجھیں، مگر میں آپ کا میں یقین دلاتا ہوں کہ جلسہ بہت اہم تھا، اور چونکہ اس کا مقام کوئی ہال یا پارک نہ تھا بلکہ پورا سیارہ۔ اس میں بے شمار لوگ شریک تھے، اور کیوں نہ ہوتے، ان کے یہاں ایک نوجوان جسے تحقیق کرنے کا بڑا شوق تھا، زمین کی سیر اور زمین والوں کی زندگی کا مشاہدہ کر کے آیا تھا، اور انھیں بتانے والا تھا کہ ایک سیارہ جو مریخ کے مقابلے میں روشنی اور حرارت کے سرچشمے سے زیادہ قریب ہے، کیسے لوگوں سے آباد ہے، اور ان کی زندگی کس ڈھنگ کی ہے۔ اس نوجوان نے محسوس کیا کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہیں اور اس کی باتیں سننے اور سمجھنے کے لئے تیار ہیں تو اس نے کہا۔

حضرات میں آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ میری طرف متوجہ ہوئے اور میرے شوق کی داد دی۔ لیکن مجھے بالکل یقین نہیں کہ میں اپنا مطلب بیان کر سکوں گا۔ اور زمین زندگی کو

میں دیکھ کر آیا ہوں، اس کا نقشہ آپ کے سامنے پیش کرسکوں گا، میں ایک سیارہ کا چکر لگا کر آیا ہوں۔ جو کائنات کا سب سے بڑا قید خانہ اور سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ ہم روشنی کے بنے ہوئے لوگ ایک حالت پر نہیں رہتے ہیں۔ ہم میں سے ہرایک اپنے اندر دوسری شخصیت کو پاتا رہتا ہے، اور ایک لمحہ ایسا آتا ہے۔ جب ہم میں سے ہرایک کائنات کی روشنی میں گم ہوجاتا ہے، لیکن ہم روشنی کی طرح آزاد ہیں، ہر جگہ ہوتے نہیں تو ہر جگہ پہنچ سکتے ہیں، ہم کائنات کے دل سے دور ہیں تب بھی اس کی دھڑکن محسوس کرتے ہیں، ہماری زندگی کا ایک پختہ نظام اور اٹل قانون ہے۔ ہمارے یہاں ہربات یقینی ہوتی ہے، اور جسے ہم جانتے ہیں کہ یقینی ہے اس سے ہم انکار نہیں کرتے۔ زمین والے، جو انسان کہلاتے ہیں، ان تمام نعمتوں سے محروم ہیں۔ ان میں سے ہرایک کو، جو پیدا ہوتا ہے، سب کچھ نئے سرے سے سیکھنا ہوتا ہے، اسی وجہ سے علم بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے اور ان چند لوگوں میں سے ہرایک کا علم ایک الگ رنگ اور الگ تاثیر رکھتا ہے۔ ان میں جو سب سے بڑے عالم ہوتے ہیں وہ فلسفی کہلاتے ہیں، اور یہی اس پر بحث کرتے رہتے ہیں کہ علم کیا ہے اور کیسے حاصل ہوتا ہے آپ کو اس پر ہنسی آئے گی، مگر انسانوں کے لئے یہ کوئی ہنسی کی بات نہیں ہے۔ وہ دیکھ نہیں سکتے جب تک کہ ان کے آنکھیں نہ ہوں، سن نہیں سکتے، جب تک کہ کان نہ ہوں، ان کا سارا علم پانچ حواس پر منحصر ہے، جن کا درست ہونا یا نہ ہونا اتفاقی بات ہے، اس لئے کہ ان میں اندھے اور بہرے اور احمق بھی ہوتے ہیں انسانوں نے بہت دنوں تک غور کرنے کے بعد یہ معلوم کیا ہے کہ وہ اپنے حواس پر پورا اعتبار نہیں کرسکتے۔ اور یہی حواس انھیں علم کے بہتر ذریعے دریافت نہیں کرنے دیتے۔ اسی وجہ سے میں نے کہا ہے کہ زمین کائنات کا سب سے بڑا قید خانہ ہے۔ یہاں زندگی پر جسم کی، اور جسم پر وزن پر قید لگی ہوئی ہے، یہاں کوئی خواہش بغیر وسیلے کے پوری نہیں ہوتی، یہاں کا عمل ناقص وسیلوں کا پابند یہاں کا شعور ہی گرفتار اور یہاں علم کی سرکشی سے بیزار رہتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ زمین کائنات

سیاست بڑا کارخانہ بھی ہے، یہاں کوئی چیز ایک حالت پر نہیں رہتی - ہر وقت گھٹتی یا بڑھتی، بنتی
یا بگڑتی رہتی ہے - یہاں دن کے اُجالے کے بعد رات کا اندھیرا ہوتا ہے، گرمی کے بعد سردی اور
سردی کے بعد پھر گرمی ہوتی ہے، اور زمین والوں نے یہ دیکھ کر کہ دن اور رات اور موسموں
کی تبدیلی ایک خاص قاعدے کے مطابق ہوتی ہے - اسے وقت کا پیمانہ بنا لیا ہے - وہ اگر
وقت کو دن اور مہینے اور سال میں تقسیم کر لیتے تو شاید سب دیوانے ہو جاتے - ہم کو
تعجب ہوتا ہے کہ وقت کو محدود اور محسوس کرنے کے بعد زندہ رہنا کیسے گوارا کرتے ہیں - ہم
جانتے ہیں کہ وقت ہماری ایک کیفیت ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک دھارا ہے جس میں کل
کائنات بہتی ہے اور ڈوبی رہتی ہے - ہر کارخانہ چیزیں بنانے کے لئے ہوتا ہے مگر زمین
پر حالت یہ ہے کہ جب تک ایک چیز کو نہ بگاڑئے دوسری بنتی نہیں - اس کا سبب یہ بتاتے ہیں
کہ وہاں سامان کی کمی ہے - وہاں قدرت نے تو ہر چیز مہیا کر دی ہے، مگر جاندار مخلوق کے
لئے عام قاعدہ رکھا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو کھا کر اپنا پیٹ پالیں - اس طرح ہر جان کے
ہزار دشمن ہوتے ہیں اور زندہ وہی رہ سکتا ہے جو اتفاق یا تدبیر سے اپنے آپ کو
دشمنوں سے بچا سکے - انسان بھی اس قاعدے کے پابند ہیں - انھیں بتایا گیا ہے کہ ساری
مخلوق میں ان کا مرتبہ سب سے بلند ہے - مگر ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی گئی ہے
جتنا ہی اعلیٰ ان کا مرتبہ ہے اتنی ہی زیادہ ان کی ذمہ داریاں اور دشواریاں ہیں دوسری
مخلوق کو صرف جان کا خطرہ رہتا ہے - ان کے لئے ایمان کا خطرہ ہے - دوسری مخلوق کے
لئے کافی ہے کہ وہ قدرت کے پیدا کئے ہوئے دشمنوں سے بچی رہے - انسان کا زندہ رہنا
اس کو زندہ رکھنے کے لئے کافی نہیں - اسے جہالت تباہ کر سکتی ہے - اس لئے اسے علم
چاہئے - وہ اپنی حقیقت اور مرتبے کو بڑی جلدی بھول جاتا ہے - اس لئے ضروری ہے کہ
اس کی طبیعت تہذیب کے ایک خاص سانچے میں ڈھالی جائے، لیکن تہذیب کے قاعدے
قانون بھی زنجیریں بن سکتے ہیں - اس لئے ضروری ہے کہ عقل کی ریتی انھیں کاٹتی رہے -

گویا ہر پیمانہ پر، ہر طریقے سے اور زندگی کے ہر شعبہ میں مٹنے اور بننے کا سلسلہ ہر دم جاری رہتا ہے۔ انسان اسے محسوس کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی کی بنیاد یقین پر ہی ہو سکتی ہے، اور وہ یقین کی بنیاد پر اپنی زندگی تعمیر کرتے رہتے ہیں۔ وہ یقینی باتوں کو اپنا مذہب کہتے ہیں، اور مذہب ان میں جو قوت پیدا کرتا ہے اس کے بل پر وہ زندگی کے قاعدے قانون بناتے ہیں، رسمیں قائم کرتے ہیں اور عادتیں ڈالتے ہیں۔ یہ کام بہت مشکل ہوتا ہے اس لئے کہ ہر انسان کی طبیعت یا خیالات یا مذاق دوسروں سے مختلف ہوتا ہے، اور یہ اختلاف قائم نہ رہے تو انسان کی شخصیت ماری جاتی ہے، جیئے کا کوسل دیکھئے تو پھر وہ کھلتی نہیں، معلوم ہوتا ہے قدرت کا منشا یہ تھا کہ ہر انسان اپنی دنیا الگ بنائے مگر انسان نے یہ دیکھا کہ اس کا کام مل جل کر رہنے اور اتحاد عمل سے ہی چل سکتا ہے، اس نے خود غرضی کے میلانات کو قابو میں کیا، اور ایسی عادتیں ڈالیں کہ اس کے لئے اکیلا رہنا ناممکن ہو گیا۔ اس طرح انسانی زندگی کا دار مدار مذہب، قانون، رسم و عادات پر ہے، اور ان چاروں رنگوں سے زندگی کی جو تصویر بنائی جاتی ہے اسے تہذیب کہتے ہیں۔ مگر یہ تصویر ایک مرتبہ بنا کر ہمیشہ کے لئے محفوظ نہیں کر دی جاتی۔ قدرت کا ایک حکم ہے کہ انسان کچھ نہ کچھ پیدا کرتا رہے۔ انسان اپنی تہذیبی دولت کو بڑھاتا نہ رہے، فکر اور نئے عمل کے لئے نئے میدان تلاش کرتا نہ رہے، تو مذہب، قانون، رسم اور عادت بیٹھ کے سب پتھرا جاتے ہیں وہ جذبات، اور خواہشیں جن کی کامیابی کو وہ زندگی کا نچوڑ سمجھتا ہے، آہستہ آہستہ اس کے لئے اخلاقی زنجیریں بن جاتی ہیں، اور وہ ان سے اس طرح پیچھا چھڑاتا ہے جیسے کوئی قیدی قید خانے سے نکل کر بھاگے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں قید خانے سے نکل بھاگنے کی طاقت نہ رہے۔ تب وہ نئی تہذیب بنانے کے کام کا نہیں رہتا، دوسروں کا غلام بن جاتا ہے اور یہ غلامی اسے بھلی بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ میں نے انسانی تہذیبوں کو کارگذاری کے طور پر جانچا تو میں نے دیکھا کہ انسان برابر ترقی کرتا رہا ہے۔ جن باتوں

کو وہ پہلے بنیادی حقیقتیں مانتا تھا، وہ قبائلی رسموں اور روایتوں سے کچھ زیادہ نہ تھیں
رفتہ رفتہ وہ اس قابل ہوگیا کہ انسانیت کے ایک ہمہ گیر مذہب کا خیال اس کے دل
میں سما سکے۔ اس کا دماغ پہلے عقل کی صورت سے وحشت کرتا علم کے نام سے ڈرتا تھا
لیکن پھر وہ دونوں سے مانوس ہوگیا اور اب انسان سمجھنے لگے ہیں کہ ان کے دماغوں کے
باہر عقل اور علم کا کوئی وجود ہی نہیں۔ علم نے انسانی زندگی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے
انسان جو پہلے دوسرے جانوروں کی طرح مجبور تھا، اب اپنے بنائے ہوئے آلات کے
ذریعے بڑے بڑے فاصلے بہت جلد طے کر لیتا ہے، اس کے لئے خشکی اور تری کوئی رکاوٹ
نہیں، اور وہ ہوا میں اُڑنے والے جہاز بھی بنا لیتا ہے، زمین کی دولت اب اس طرح
اس کے قابو میں آگئی ہے کہ وہ چاہے تو عام انسانی زندگی کے معیار کو بہت بلند کر سکتا
ہے۔ اور تجربے سے اتحاد عمل کی ایسی تدبیریں اور ترکیبیں معلوم کر لی ہیں کہ اگر وہ چاہے
تو ہزاروں برس تک اس محنت کی کمائی پر گذر کر سکتا ہے جو اس نے اب تک صرف کی ہے
شرط یہ ہے کہ وہ ایسا چاہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ انسان کو اپنی خواہشوں پر کوئی اختیار
نہیں۔ اور اس کی طبیعت اس کے علم اور اس کی عقل کے باوجود اتنی من چلی ہے کہ ہزار
بنے بنائے کام بگاڑ دیتی ہے۔ انسان زبان سے کہتے ہیں اور دل سے مانتے ہیں کہ آدمی
کو آدمی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہئے۔ مگر ضد اور غصہ میں وہ ایک دوسرے پر
ایسی زیادتیاں کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں رحم اور محبت کا مادہ ہی نہیں، ان کی
عقل انھیں بتاتی ہے کہ زندگی کا ایک دستور ہونا چاہئے، لیکن یہ دستور بن جائے تو ان
کی طبیعت کو اس کے عیب نکالنے اور اس کی خلاف ورزی کرنے میں مزا آنے لگتا ہے اور
ان کی عقل انھیں راہ راست پر لانے کے بجائے اور حیرانی میں ڈال دیتی ہے، انسانوں نے
جتنے بڑے کام کئے ہیں وہ اس یقین کی بدولت کئے ہیں کہ ان میں اس کی قدرت ہے لیکن
انھیں زیادہ تسکین اس سے ہوتی ہے کہ وہ مایوسی کی کیفیت اپنے اوپر طاری کر لیں اور

کہیں کہ ہم تقدیر سے مجبور ہیں۔ انسان کی طبیعت من چلی، اس کا دل بے پروا، اس کا ارادہ آمادہ نہ ہوتا تو اس کی کارگزاری بہت ہی حقیر ہوتی۔ مگر اس نے جو کچھ کیا ہے۔ اس سے بہت زیادہ کرسکتا، اگر اس کی طبیعت علم اور عقل کو اپنا رہنما بنا سکتی، اگر اس کا دل صبر اور استقلال کو اپنی تربیت کا ذریعہ بناتا، اگر اس کا ارادہ پرند کی طرح پھدک کر درخت سے درخت اور پھول سے پھول پر نہ جاتا بلکہ اپنی منزل کو اپنی نظر میں رکھتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی بہت مصیبتوں کا ذمے دار خود انسان ہے۔ لیکن اسے حواس کے قید خانے میں گرفتار کیوں کیا گیا، اگر قدرت کا منشا یہ تھا کہ وہ ترقی کرے اور صحیح راستے سے نہ بھٹکے۔ برائی اور بھلائی کرکے اپنی شخصیت کو ظاہر کرنے کا جذبہ کیوں رکھا گیا، جب قدرت کا مقصد یہ تھا کہ انسان اپنے اصول یا تصور میں گم ہو جایا کرے۔ انسان کی زندگی ایک امتحان کی منزل ہے جس سے وہ گزر نہیں پاتا، ایک مسلسل آزمائش جس میں وہ پورا اترتا ہے تب بھی اُسے نجات نہیں ملتی، جب تک کہ اس کے اور اس کی دنیا کے درمیان موت کا پردہ نہ پڑ جائے۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ انسان اتنا خون اور پسینہ بہا چکا ہے کہ وہ حواس کی قید سے آزاد ہونے کا حق دار بن گیا ہے اور میری درخواست ہے کہ اب آپ سب مل کر تقدیر کے خالق سے التجا کریں کہ وہ زمین والوں کی تقدیر کو بدل دے۔

ذہین بیوی

(ایک مکالمہ)

رشید صاحب۔ صاحبو! آج کے موضوع گفتگو پر مجھے اندیشہ ہے۔ آپ نے آزادی اور دلجمعی سے غور نہ کیا ہوگا۔ غور کرنے کے لئے ذہن کی یکسوئی کی ضرورت ہے۔ اور یکسوئی کیسے میسر آسکتی ہے۔ جب آج کی گفتگو کا انجام رہ رہ کر ہمارے اور آپ کے سامنے آتا ہو۔

جہاں تک بیوی کا سوال ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ ہر بیوی خواہ وہ عام طور پر کیسی ہی ہو۔ شوہر کے حق میں ہمیشہ ذہین ہوتی ہے۔ شوہر کو بیوی کی ذہانت سے اتنا سابقہ نہیں پڑتا۔ جتنا اس کی ذہنیت سے۔ اور یہ بیوی کی ذہنیت ہی ہوتی ہے جو شوہر کے لئے اسے ذہین بنا دیتی ہے۔

میرے نزدیک میری اور آپ کی یہ دشواری اس طور پر دور ہو سکتی ہے۔ کہ ہم سب صدق دل سے اس امر کا جلد سے جلد اعلان کر دیں۔ کہ ہماری گفتگو قطعاً غیر جانبدارانہ ہوگی۔ اور ہمارا روئے سخن نہ اپنی نیک بیویوں کی طرف ہے اور نہ کسی اور کی۔ ہمارا روئے سخن صرف میکروفون کی طرف ہے۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ بیویاں خواہ وہ ذہین ہوں۔ یا نہیں۔ اس امر کی تصدیق کریں گی۔ کہ کوئی شوہر خواہ وہ کتنا ہی مظلوم یا غبی کیوں نہ ہو۔ میکروفون پر بیوی کو مخاطب نہ کریگا۔

دوسری بات جو میرے ذہن میں آتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ کس بناء پر ذہین بیوی کو مستقل عذاب قرار دیا جائے۔ مجھے موضوع گفتگو میں ایک جھول نظر آتا ہے۔ کہ

اس موضوع کا انتخاب کرنے والا بیوی کے کاروبار سے ناواقف معلوم ہوتا ہے
عورت کے ساتھ مستقل کا لفظ لانا ہی عورت سے ناواقفیت کی دلیل ہے مستقلاً
نہ کوئی عورت ذہین ہوتی ہے۔ اور نہ عذاب۔ بات صرف اتنی ہے۔ کہ جس طرح اطباء
نے اشیاء کا مزاج دریافت کیا ہے۔ کہ کون سی چیز کس درجہ میں گرم خشک یا تر
ہوتی ہے۔ اسی طرح ذہین بیوی بھی مختلف درجوں میں سرد خشک گرم تر ہوتی
ہے۔ اور اسی اعتبار سے ذہین بیویاں مستقلاً یا عارضی طور پر عذاب بنتی رہتی ہوں
یا نہیں۔ ان کے نمازمند شوہر مسلسل داخل حسنات ہوتے رہتے ہیں۔

غفور صاحب ۔ سید صاحب! گستاخی معاف۔ جس وقت آپ داخل حسنات ہو رہے ہوں۔ میرا دخل درمعقولات دینا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا لیکن ایک بات یاد رکھئے۔ کہ آپ ذہین بیوی کے عذاب کو جو رنگ دے رہے ہیں۔ وہ آپ کی ذہانت کی دلیل ہو سکتی ہے۔ آپ کے عافیت بخیر ہونے کی بشارت نہیں دیجا سکتی۔

رشید صاحب غفور صاحب! میں تو اپنی عافیت کی طرف سے مطمئن ہوں۔ آپ بھی ذہین بیوی کی طرف سے مطمئن ہیں کہ نہیں۔

غفور صاحب آپ نے اطمینان کی بھی ایک ہی کہی۔ بھلا ذہانت اور طمانیت کا ساتھ کہاں اس کے طفیل تو جنت سے نکالے گئے۔ وہ دن اور آج کا دن سکون تک نصیب نہ ہوا۔ پھر بھلا جس سے اپنے ذہن کا بار نہ سنبھلتا ہو۔ اس پر بیوی بھی اپنی ذہانت کا بار لاد دے۔ تو کہاں ٹھکانا ہے۔ بہشت کے بدلے دے کر دنیا میں جگہ رہ گئی تھی۔ یہاں سے نکلے تو شاید دونوں جہاں سے ہی جائیں گے یہ مانا کہ شوہر ایک زمانے سے بیوی کی ناز برداری ہی نہیں۔ بار برداری کا کام بھی کرتے چلے آئے ہیں۔ خواہ بچے ہوں یا چلتے اور کوٹ ہوں یا دستانے۔

لیکن ذہانت کا یہ بار گراں تو سنبھالتے بھی نہ سنبھلیگا۔

رشید صاحب غفور صاحب! اب تک تو دوزخ سے ڈرایا گیا ہوں، اب آپ نے بہشت سے ڈرانا شروع کر دیا۔ لیکن آپ ذہین بیوی کو جس طرح پیش کر رہے ہیں۔ اس سے مجھے کچھ آس بندھتی ہے۔ کہ اگر ہم آپ دونوں ذہین بیوی کے آشوب کو سمجھ جائیں۔ تو ہم کو یقیناً جنت نصیب ہوگی۔ اختر صاحب! آپ کا کیا خیال ہے؟ یعنی ہمارے جنت نصیب ہونے کے بارے میں نہیں۔ بلکہ غفور صاحب کی ذہین بیوی کے بارے میں۔

اختر صاحب معاف فرمائے گا۔ مصیبت تو یہی ہے کہ ہر شخص کو اپنی ذہانت کا یقین ہی نہیں۔ بلکہ اس پر ناز بھی ہے۔ اور اس سے عشق بھی ہے۔ یہ جو آپ اپنے ذہن اور اپنی ذہانت کو مزے لے لے کر کوس رہے ہیں۔ یہ دراصل محبت بھری ھپکیاں ہیں۔ آپ کی مثال اس ماں کی سی ہے۔ جو اپنے بچے کو اپنی محبوب ترین شے اور دنیا کی خوبصورت ترین چیز سمجھتے ہوئے بھی صبح سے شام تک اس کے شریر اور نالائق اور پاجی اور شیطان اور نہ جانے کیا کیا کچھ ہونے کا اعلان کرتی رہتی ہے۔ اور اپنی مظلومی کے اظہار میں سارے جہاں کو سر پر اٹھا لیتی ہے مگر دراصل وہ اپنی مظلومی کا اظہار نہیں کرتی۔ اپنے لاڈ اور پیار کا اظہار کرتی ہے اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس امر کی اشاعت کرتی ہے۔ کہ اگر دنیا میں کوئی ماں ہے۔ تو وہ ہے۔ اور کوئی بچہ ہے۔ تو اس کا بچہ۔

غفور صاحب اختر صاحب! گستاخی معاف۔ مجھے تو آپ پر گھریلو ذہنیت کا بڑا گہرا سایہ پڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ماں کی تشبیہہ اچھی ہے۔ مگر ماں کی ذہانت کی دلیل نہیں۔

رشید صاحب لیکن حسرت جب تک بیوی کی ذہانت کا مسئلہ طے نہ ہو جائے

مان کی محبت یا ہمسایہ کے حقوق کا سوال اٹھانا کچھ غیر متعلق سا معلوم ہوتا ہے۔

اختر صاحب تو پھر میں اپنے دوست کو اس مال دار شخص کے مشابہ قرار دوں گا۔ جو اپنی دولت کا پرستار ہوتے ہوئے اس سے بیزاری کا اعلان کرتا ہے۔ وہ دولت کو ایک مصیبت اور عذاب بتاتا ہے۔ اور ہر وقت یہ ظاہر کرنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ کہ وہ ایک ایسا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ جس کو دوسرے یعنی وہ جو مال دار نہیں ہیں کسی طرح سنبھال ہی نہیں سکتے۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ اس کو اپنی دولت حد سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ اور اس کے تحفظ کے لئے وہ ضروری سمجھتا ہے۔ کہ دوسروں کو اس سے محروم رہنے ہی میں اپنی عافیت نظر آئے۔ اسی لئے وہ دولت کی برائیوں سے ساری دنیا کے کان پاٹ دیتا ہے۔

غفور صاحب اختر صاحب! اب آپ تبلیغ پر اتر آئے۔ مجھے تو اس میں بھی گھریلو رنگ نظر آرہا ہے۔ یاد ش بخیر ایک ذہین بیوی نے اپنے شوہر سے کیا خوب کہا تھا۔ کہ تمھاری ذہنیت کا تو یہ حال ہو گیا ہے۔ کہ اگر میں سیاہ کو سفید بتانے لگوں۔ تو تم میری بات ضرور کاٹ کر رہو گے۔ آپ تو ایک کانٹوں کے تاج کو پھول مالا بنانے کی فکر میں ہیں۔

رشید صاحب "کانٹوں سے بھی نباہ کئے جارہا ہوں میں"

اختر صاحب چلئے اسے بھی جانے دیجئے۔ میں کہنا صرف یہ چاہتا ہوں۔ کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے ذہن پر فریفتہ ہوتا ہے۔ اور ذہانت کو اپنی ملکیت خاص خیال کرتا ہے۔ یہی سبب ہے۔ کہ ہم ذہین بیوی کے تصور سے گھبراتے ہیں۔ مگر میری رائے میں تو یہ فرار پسندی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ذہین بیوی

کو ایک عذاب سمجھنا اپنی زندگی کی ایک تلخ اور ناخوشگوار حقیقت سے فرار کا ذریعہ ہے۔ اور بس۔

غفور صاحب لیجئے اختر صاحب! آخر آپ بھی آئے نا زندگی کی تلخ اور ناخوشگوار حقیقتوں کی طرف۔ غنیمت ہے۔ آپ نے کسی حقیقت کی تلخی کا اعتراف تو کیا۔

رشید صاحب یعنی وہ جو کہا ہے ع شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے ذہن میں

اختر صاحب جی ہاں کیوں نہیں ہوتا دراصل یہ ہے۔ کہ گھر کے باہر مردوں کی دنیا میں ہمیں اپنے سے زیادہ ذہین لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس سے ہماری خود پسندی کو ٹھیس لگتی ہے۔ اور ہمارا جھوٹا جذبہ خود پسندی۔ یا برتری مجروح ہو جاتا ہے۔ ہم بھلا یہ کیوں چاہنے لگے۔ کہ کوئی دوسرا ہماری ذہنی فضیلت کے مقابلہ میں اپنی ذہانت کا علم بلند کرے۔ اور ہمیں نیچا دکھائے چنانچہ اس شکست کا انتقام لینے کے لئے ہم گھر کا رخ کرتے ہیں۔ ذہین بیوی کو ایک عذاب قرار دینے سے یقیناً ہمارا مطلب اس کے سواء اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنی ذہانت کے پندار کو کسی نہ کسی طور پر برقرار رکھنے کی بدحواسانہ کوشش کرتے ہیں۔

رشید صاحب سنو سنو، شرم شرم!

غفور صاحب لیجئے اختر صاحب! ایک خانگی محاذ تو تھا ہی۔ آپ نے تو دلائل اور براہین کا نیا محاذ قایم کر دیا۔ مگر مجھے ڈر ہے۔ یہ بھی کہیں دوسری میجینو لائن ثابت نہ ہو۔ یہ ٹوٹی تو پھر ساحل آپ تک کہیں اور رکنے کی جگہ نہ ملے گی۔ ایک ذہین بیوی کی طرح آپ نے میرے الفاظ کا وہ مفہوم لے لیا۔ جس کا نتیجہ خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ میرے خیال میں ذہانت کوئی ایسی چیز نہیں جیسے کان

کے لئے کوئی نئی طرز کا آویزہ۔ مگر مصیبت یہ ہے۔ کہ اکثر ذہین عورتیں اس کا مقصد ایک آویزے یا ایک نئے بلاؤز سے زیادہ نہیں سمجھتیں۔

رشید صاحب جزاک اللہ

غفور صاحب عورت ایک خوشنما پھول ہے۔ لیکن بقول ایک صاحب علا۔ کانٹے سے ہی جانا کہ پھول ہے۔ ادبیہ کا نٹا ہے حقیقت میں ذہانت کا کانٹا۔ ذہین عورتوں نے نسوانیت کے پھول کو تو بھلا دیا اور سمجھیں کہ پھول بنا ہی کانٹے کے لئے تھا۔ میری نزدیک ذہانت کوئی چندن ہار کی قسم کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسا وصف ہے جس کی بناء پر انسان زمین کے ذروں کو چھوڑ کر ستاروں سے الجھتا ہے، پھولوں کی طرف سے آنکھیں بند کرکے کانٹوں کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے، حیات اور کائنات کے ان بھیدوں کو ٹٹولتا ہے۔ جو آج تک کسی کے ہاتھ نہ آسکے۔ ایک مادام کیوری کی طرح معمل میں دن رات ایک کر دیتا ہے، تب کہیں جاکر انسانی بے علمی کی شب تاریک کو ایک نئی روشنی سے جگمگاتا ہے۔ کہیں یہی وصف ہائپیشیا مصر کی مشہور فلسفی عورت کی طرح سکندریہ کے چوک میں منبر پر چڑھ کر ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ کی تعبیر کرتا ہے اور پھر جاہل علماء اور عوام کے ہاتھوں سنگسار ہو کر شہید علم کا رتبہ حاصل کرتا ہے۔

رشید صاحب اللہ آبرو رکھے اور تندرست

غفور صاحب اگر میں نے ذہانت کی غلط تعریف نہیں کی تو شاید آپ مجھ سے اتفاق کریں گے۔ کہ یہ ایک جنون ہے۔ ایک آزار ہے۔ ایک بوجھ ہے۔ ایک ذمہ داری ہے۔ جو شخص اس وصف کو اپناتا ہے۔ وہ خود کو ایک

جنون میں مبتلا کرتا ہے۔ اور اس سے تو آپ انکار نہ کریں گے کہ بادشاہوں کی طرح کسی اقلیم میں بھی ایک مجنوں سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ اور ایسے دیوانوں کی یقیناً عورتوں کے طبقہ میں کسی پشت کی ہے۔ اگر ایک تا دائم کیوری ہوئیں بھی۔ تو وہ ان مستثنیات میں سے ہیں، جو کلیہ کو ثابت کرتی ہیں۔

اب ذہن کی ان سب ذمہ داریوں۔ اس کی نوک اور چبھن کے ساتھ ساتھ انسان آخر انسان ہے۔ (خواہشوں، امیدوں اور ارمانوں کا ایک پتلا۔ اور یوں شاید) اسے حق بھی پہنچتا ہے۔ کہ وہ زندگی کی کم از کم ایک شعبے میں تو ذہن کے بوجھ سے آزاد ہو کر خالص انسانی مسرتوں کا لطف اٹھائے۔ اور جب یہ ہے۔ تو آپ ہی بتائیے کہ ذہین بیوی اس کے لئے عذاب نہیں ہوگی تو کیا ہوگی؟

رشید صاحب اس سے تو شاید یہ مطلب نکلتا ہے۔ کہ آپ مرد کی جنسی فوقیت کے قائل نہیں۔ اور عورت کو آرایش خلوت اور سرمایۂ عیش و نشاط سے زیادہ حیثیت نہیں دینا چاہتے۔ اس لئے میں آپ کا برا نہیں چاہتا۔ اپنے آپ کو بشارت دینا چاہتا ہوں۔

غفور صاحب جی نہیں۔ یہ بات نہیں۔ میں تو خانگی مملکت کی حدود میں داخل ہوتے ہی جنسی مساوات کا قایل ہو گیا۔ لیکن ہم نے تو یہ دیکھا۔ کہ دنیا بھر کے اصول قوانین جہاں گھر کی چوکھٹ کے اندر پہنچے۔ سب کے سب گھر یلو تصورات کی زد میں آگئے۔ مردوں نے ایک زمانے تک اپنی فوقیت کا جھنڈا قائم رکھا اس سے پسپا ہوئے۔ تو بچاروں نے اپنا محاذ جدا قایم کیا۔ فطرت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ کہ دونوں کے حلقہ ہائے عمل جدا گانہ ہوں۔ دونوں کے محاذ علیحدہ ہوں

مگر گھریلو مملکت کی فاسٹ قوتوں، ان کے بڑھے ہوئے حوصلوں کے مقابلہ میں اب اس محاذ کی بھی کوئی حقیقت معلوم نہیں ہوتی ۔ نہ معلوم کب ہالینڈ کے سمندری بند کی طرح ٹوٹ کر بہ جائے ۔ خدا نخواستہ میرا مطلب یہ نہیں کہ ایک محاذ بالکل ناقص العقل ۔ اور دوسرا عقل کے اٹم بموں سے مسلح ہو۔ آج کل کیا جنگی محاذ اور کیا گھریلو دونوں پر عقل ہی کی ستم آرائی ہے ۔ لیکن ڈر ہے ۔ کہ گھریلو محاذ کہیں عقل اور ذہانت کا ایسا ٹائیم بم نہ تیار کر دے ۔ جو دونوں محاذوں کو زمین کے برابر کر دے ۔ تو میرا مطلب یہ ہے ۔ کہ شوہر کو بیوی کی علمی ۔ ادبی ۔ کلچرل اور فلسفیانہ موشگافیوں کی ضرورت نہیں، بلکہ اسکی ہمدردی اور دلسوزی کی ضرورت ہے ۔ اور ظاہر ہے ۔ کہ ہمدردی اور دلسوزی کو خالص ذہانت سے کچھ ایسا زیادہ واسطہ نہیں ۔

رشید صاحب سبحان اللہ! مکرر ارشاد ہو!

اختر صاحب مگر بندہ نواز! سوال تو یہی ہے ۔ کہ آپ زندگی میں یہ دست شفقت اور یہ سہارا کیوں چاہتے ہیں ۔ عورت کیوں اپنی مٹی کے دیوتا کے ٹوٹے ہوئے پاؤں جوڑنے کی کوشش کرے ۔ اور جب وہ اپنی عظیم ذمہ داریوں کے بوجھ سے دبا ہوا گھر واپس آئے ۔ تو اس کے چرنوں کا امرت دھو دھو کر پیئے ۔ آخر کیوں اس کے جنون اور نشہ کا آثار اس کی ذہانت کے زہر کا تریاق بنے ۔ کیوں نہ وہ ایک دیوی بن کر اس دیوتا کے برابر بیٹھے ۔ اور اس سے کہے ۔ کہ میرے دیوتا! تمہارے یہ پاؤں مٹی کے بنے ہوئے ہیں ۔ میرے آقا! ان پر کم از کم (Nickel Plating) تو کرا لو ۔

غفور صاحب اچھا یونہی سہی ۔ لیکن اگر دیوی دیوتا کو نکل پلیٹنگ کا مشورہ دے سکتی ہے ۔ تو دیوتا بھی دیوی سے ایک نئے قلب اور صیقل شدہ قالب کا

مطالبہ کرسکتا ہے۔

رشید صاحب غفور صاحب! کوئی اور بات ہوتی تو میں آپ کی صلح اختر صاحبہ سے کرادیتا۔ لیکن جب ذہین بیوی درمیان میں ہو تو آپ دونوں کے بیچ میں پڑنا میری بڑی نالائقی ہوگی۔ اور آپ دونوں کی بیویوں کی حق تلفی! میں تو کچھ اب سمجھتا ہوں کہ زیر بحث مضمون ہی غلط ہے۔ اس لئے ہم تینوں برخود غلط۔

بذات خود میں بیوی اور خدا کے مسئلہ پر سرے سے سوچنے ہی کا قائل نہیں ہوں۔ دونوں کو صرف تسلیم کرتا ہوں۔

(آل انڈیا ریڈیو دہلی)

سپاہی کا گیت

(کوپ رولو زادہ محمد فواد)

ذیل میں کوپ رولو زادہ محمد فواد (Köprülüzade Mehmet Fuat) کی ایک نظم کا ترجمہ براہ راست ترکی زبان سے پیش کیا جاتا ہے۔ کوپ رولو زادہ محمد فواد جیسا کہ انکے نام کی نسبت سے ظاہر ہوتا ہے، ترکی کے مشہور خاندان کوپ رولو کے رکن ہیں۔ یہ جدید ترکی کے ایک نامور ادیب اور شاعر ہو ستنبول یونیورسٹی میں ترکی زبان اور ادب کے پروفیسر ہیں۔ ان کے قلم سے ترکی ادب اور تاریخ پر کئی تصنیفیں نکل چکی ہیں، منجملہ ان کے دو نہایت مشہور ہوئی ہیں اول (Türk Edebiyatı Tarihi) (ترکی ادب کی تاریخ) اور دوم Türk Edebiyatında İlk Mutasavvıflar (ترکی ادب میں پہلے صوفیوں کا درجہ)

موجودہ نظم اول بار پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں شائع ہوئی اس میں ماضی اور حال دونوں کا نہایت پر اثر طریقے پر ذکر کیا گیا ہے۔ (ریاض الحسن از روما)

(۱)

دریائے ڈینوب کے کنارے سرو کی قطاروں میں سے۔
بادِ صبا گذرتی ہے اور خاموشی سے روتی ہے
گلاب کے چمن میں (بلبل کے بجائے آج) اُلّو بولتا ہے ......
یہ ویرانے ماضی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

(۲)

......جہاں لوگ نماز ادا کرتے تھے وہاں (آج) گھاس اُگی ہے اور ایک پتھر بھی (نشان کا) باقی نہیں رہا

چشموں سے (اب) خون کے آنسو بہتے ہیں۔
وہاں ایک خوب صورت معشوق تھا، جس کی چتونوں سے پریشانی ٹپکتی تھی۔
اور اس کے سفید ماتھے پر ایک سیاہ چادر پڑی ہوئی ہے۔
شکستہ میناروں سے (اب) اذان کی آواز نہیں سنائی دیتی۔
تمام چولھوں کی آگ بجھ گئی ہے اور دیگ الٹے پڑے ہیں
(لیکن) میری آواز کا جواب دینے والے صرف برفانی پہاڑ تھے۔

---

(۴)

چڑیاں بید کے درختوں پر
اپنی پرانی داستانیں دہراتی ہیں۔
اکثر راتوں کو دریائے ڈینوب ماتم کرتا ہے
کیونکہ اس کے سینے میں کتنے بے کفن شہید دفن ہیں۔

---

(۵)

باغوں میں فصل کے وقت انگور میں مٹھاس نہیں رہی۔
باغی غلام سے خراج دینا بند کر دیا ہے۔
اور سات بادشاہوں نے پھر سے تاج پہنا ہے۔
(گویا) شاہین کے نشیمن کو کووں نے گھیر لیا ہے

Shahin yuvasini Kargalar Salmish

لہ یہاں دو باتیں قابل لحاظ ہیں، اول ترکی لفظ (Karga) کو لیجئے۔ اس کے معنی کوے کے ہیں۔ اب کاگا، کرگا، کوا کی صوتی اور معنوی حالت پر غور کیجئے، کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا

(۶)

او پرانے شاعر آگے بڑھ! اور ہاتھ میں پھر رباب لے۔
اور اپنے نغموں سے دشمن کے دل میں ہیبت پیدا کر۔
اور کہہ دے کہ اس خاموش سیلاب کو حقارت سے نہ دیکھے۔
(کیونکہ) اس نے اکثر قوموں پر فتح پائی ہے۔

کہ بہت دور ماضی میں وسط ایشیا کی یہ زبان ویدوں کی زبان سے قریب تھی اس سلسلے میں دو چار الفاظ اور بھی مل سکتے ہیں مگر یہ میدان اب تک بالکل خالی رہا ہے اس لئے تحقیقات کی ضرورت ہے۔ دوسری چیز کا ذکر ایک ادبی لطیفے کے طور پر کروں گا۔ آخری مصرعے میں جو تشبیہ پیش کی گئی ہے۔ اسے بالکل اسی ترکیب کے ساتھ علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم باغی مرید (بال جبریل) میں استعمال کیاہے۔ پیروں کے متعلق کہتے ہیں "میراث میں آئی ہے انھیں مسند ارشاد۔ زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن" اس سے معلوم ہوتاہے کہ دونوں شاعروں کا دماغ ایک ہی راستے پر گیا۔ کیونکہ دونوں فارسی شاعری سے متاثر ہوئے ہیں۔

پھول

یہ پھول جب صبح کو خواب سے جاگے۔
تو کتنے شاداں اور پر رونق تھے۔
لیکن شام کو ان کی ساری آہ وزاری بے کار ہوگی۔
(کیونکہ) اُن کو ٹھنڈی رات کی آغوش میں سونا ہوگا۔
آسمان پر جو رنگا رنگی پھیل رہی ہے
اور جو سفید ارغوانی اور سنہری قوس قزح میں بدل رہی ہے۔
وہ انسانی زندگی کے لئے ایک مفید تجربے کا پتہ دیتی ہے۔
آہ! یہ سارا نظارا ایک ہی دن میں ختم ہوجاتا ہے!
صبح کو کلی نے آنکھ کھولی
اور جب آنکھ کھولی تو پیری کا عالم تھا۔
گویا زندگی اور موت کا فسانہ ایک کلی میں پنہاں تھا۔

Cuna y sepulcro en un botón hallaron

یہی حال انسانی زندگی کا ہے
یعنی انسان ایک دن میں پیدا ہوتا ہے اور مرجاتا ہے۔
خواہ وہ کتنا ہی زندہ رہا ہو مگر معلوم ہوتا ہے کہ چند گھنٹوں سے زائد نہیں جیا۔

پیدرو کالدیرون دے لا بارکا

Pedro Calderón de la Barca

ہسپانوی شاعر

ترجمہ ریاض الحسن ازمدما

سہارنپور کی برادریوں کا جائزہ

برادریوں کے جائزہ کا کام صرف شہر سہارنپور تک محدود رکھا گیا، اس کام کے لئے کچھ مسلم اور کچھ ہندو برادریوں کا انتخاب کیا گیا۔ شہری زندگی میں جن برادریوں کو اہمیت حاصل تھی، ان میں سے بیشتر اس جائزہ میں شامل کر لی گئی ہیں۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے کچھ برادریاں جائزہ میں شامل نہیں کی جاسکیں۔ شہر کی مسلم برادریوں میں جن کا جائزہ لیا گیا، وہ یہ تھیں:۔

(۱) مومن انصار (جلاہے تیلی) (۲) رانگڑ (راجپوت) (۳) گاڑے (۴) قریش قصائی (۵) بنجارے (۶) چوب فروشان (کلال) (۷) شیخ (نومسلم) (۸) کمبوہ (۹) شیخ زادے اور سید۔

سہارنپور شہر کی جن غیر مسلم برادریوں کا جائزہ لیا گیا اُن کے نام یہ ہیں

(۱) چمار (۲) سینی (۳) جین (۴) کھتری (۵) بوہرے (۶) اگروال

مسلم برادریوں کے بارے میں ایزد حسن صاحب ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول نے ایک تخمینہ دیا تھا جو بغیر اس بات کی ضمانت کئے ہوئے کہ یہ صحیح ہے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

مومن انصار (نور باف و روغن کر)	۱۴ تا ۲۰ ہزار
راجپوت اور پٹھان	۱۲ 〃 ۱۵ 〃
لوہار اور بڑھئی	۸ 〃 ۱۰ 〃
قریش (قصائی)	۴ 〃 ۶ 〃
شیخ زادے	۲ 〃 ۳ 〃

کمبوہ
سید
شیخ نومسلم
بنجارے
نائی
دھوبی ایک ہزار
فقیر
سبزی فروش (کونجڑے)
درزی
چوب فروشاں کلال
پنجابی (بساطی)

مومن انصار کی برادری شہر سہارنپور میں روغن گروں اور نوربافوں کی برادریوں کے سربرآوردہ افراد کے اندر چونکہ عام جذبہ ایک دوسرے کو باہم متحد سمجھنے کی طرف پایا گیا، اس لئے ہم نے بھی ان کا مطالعہ متحدہ صورت ہی میں کرنا مناسب سمجھا۔ یہ چیز کس حد تک الکشن کی سیاسی مصلحت پر مبنی تھی اور کس حد تک اصل حقیقت پر اس کی تحقیقات کا ہم کو موقع نہیں مل سکا۔ لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ ان دونوں برادریوں کے افراد کے درمیان سہارنپور میں شادی بیاہ نہیں ہوتا، اور ان کی چودھرایت کے نظام بھی علیحدہ علیحدہ ہیں۔

اس برادری کے بیدار اور تعلیم یافتہ افراد اپنے تئیں عرب نسل کا بتلاتے ہیں اور اپنا سلسلہ نسب ایوب انصاری سے ملاتے ہیں۔ پچھلے دنوں اس برادری کے

لوگوں اور دوسرے شیخ انصاریوں میں خاصا گرم بحث و مباحثہ جاری رہا، ایک کتاب مفتی شفیع صاحب دیوبندی نے "نہایت النسب" کے نام سے لکھی تھی جس میں اس بات سے انکار کیا گیا تھا کہ مومن انصار اور قریش کا تعلق عرب نسل سے ہے اس کے جواب میں مومن انصار کی طرف سے کئی کتابیں شائع ہوئیں جن میں خاص طور پر لائق ذکر تیغ براں " مصنفہ سہراب صاحب سہارنپوری، بازار نخاسہ اور تذکرۃ الانصار، مصنفہ محمد خورشید صاحب امرتسری ہیں اس کے علاوہ مومن گزٹ کانپور فتنہ جلاہا سلسلہ مقدمہ گورکھپور کو بھی مطالعہ کے لائق بیان کیا جاتا ہے۔ افسوس ہے مجھے اس لٹریچر کے مطالعہ کا موقع نہیں مل سکا۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ بحث و مباحثہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس لئے میں اس پر اپنی کوئی ذاتی رائے نہیں دے سکتا۔

اللہ رکھا اینڈ سنز ووڈ کارورز اور مینو فیکچرز کے مالک کے بیان کے مطابق جن کا تعلق مومن انصار کی برادری سے ہے، شہر سہارنپور کے مندرجہ ذیل محلوں میں مومن انصار کی برادری پھیلی ہوئی ہے۔ زیادہ تر بیا بانس شاہ جی، ٹوپیا سرائے، کھالہ پار، شر بتیا پیر، محلہ تھاندار، ہرن ماران، محلہ شاہ بہلول، محلہ یحییٰ شاہ، محلہ آتش بازان، محلہ منڈی شوپری، خان عالم پورہ، سب سے بڑی بستی اور متفرق طور پر شہر کے مختلف محلوں میں پھیلے ہوئے ہیں، محلہ ڈھولی کھال میں بھی سو دو سو آدمی ہوں گے۔ عربی مدرسہ کے پاس بھی رہتے ہیں۔

برادری کے لوگوں میں نہایت سختی کے ساتھ صرف آپس کے لوگوں میں شادی بیاہ ہوتا ہے۔ برادری کے باہر بالکل نہیں ہوتا، تھوڑا سا بھی فرق ہو جائے تو نہ لیتے ہیں نہ دیتے ہیں۔ بدچلنی کے سلسلے میں بھی برادری سے خارج کر دیا جاتا ہے روغن گروں اور نوربافوں میں بھی آپس میں شادی بیاہ کا لین دین نہیں ہے مرادآباد دیوبند اور بریلی میں تو ہے لیکن یہاں شہر اور دیہات میں نہیں ہے۔

برادری کی پنچایت ہے ۔ ان کے الگ الگ تھوک ہیں اور دھڑا بندی پائی جاتی ہے ۔ نوربافوں میں سب سے پہلے صرف ایک دھڑا تھا بعد میں تین دھڑے ہوئے ۔ اس کے بعد ایک دھڑے کا اور اضافہ ہوا ، ہر دھڑے کا ایک چودھری ہوتا ہے ، اور چودھرایت کو شادی بیاہ کے معاملے میں اور ہر معاملے میں بڑا دخل ہوتا تھا ، تینوں دھڑوں کے چودھری کبھی مل کر اور کبھی علیحدہ علیحدہ نظام کو سنبھالے رہتے تھے لیکن چوتھے دھڑے کے پیدا ہو جانے سے نظام میں ابتری کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ ان دھڑوں میں سے ایک کا نظام تو آپس کی نا اتفاقی نے بالکل توڑ دیا ہے باقی تین دھڑوں میں بھی تفریق ہو گئی ہے اور ان کی تنظیم اچھی نہیں رہی ہے ۔ چودھرایت کا اثر کم ہوتا جا رہا ہے پنچایت اور چودھری کے فیصلے کو اب زیادہ نہیں مانتے ، شرما شرمی ایک دوسرے کا لحاظ کر لیتے ہیں ۔ مومن انصار کی اس نا اتفاقی سے دوسری برادریوں کے لوگ خوب فائدہ اُٹھاتے ہیں ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعداد سب سے زیادہ ہونے کے باوجود یہ اپنی برادری کے نمائندے میونسپلٹی وغیرہ میں نہیں بھیج سکتے ، بلکہ دوسری برادری کے لوگوں کو منتخب کرتے ہیں ۔

ان چاروں دھڑوں میں بیٹی کا لین دین ہوتا ہے ، شادی غمی کے موقع پر صرف اپنے دھڑے کے لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے ۔ جب دھڑا ایک تھا تو کئی کئی ہزار آدمیوں کے کھانے کا انتظام کرنا پڑتا تھا ، اسی لئے شادی بیاہ میں خرچ زیادہ تھا اور سب کچھ لٹا بیٹھتے تھے ، لیکن اب اس سال تو کچھ نکاح ایسے ہوئے ہیں جن میں پانچ آدمیوں کو بھی نہیں بلایا جا سکا ، جب مکان جائداد یں نکل گئیں تو اب کچھ عقل آئی ہے ۔ یہ لوگ ابھی تک کپڑا ، پہننا نہیں جانتے ، امیروں کے گھر میں زیور ہے ۔ لیکن وہ بھی حیثیت سے زیادہ نہیں ۔ غریبوں کے یہاں نہیں ہے ، پیر پرستی ، فقیر پرستی پہلے تو بہت تھی لیکن اب دھوکہ کم کھاتے ہیں ۔ تعلیم بہت

کم ہے ۔ جبریہ تعلیم میں جرمانہ ادا کرتے ہیں لیکن بچے کو تعلیم نہیں دیتے ۔
جوئے اور تاڑی کی لت میں ہر گھر کا کوئی نہ کوئی ضرور مبتلا ہے ، کچھ سنبھل جاتے ہیں اور کچھ میں عمر بھر یہ عادت رہتی ہے ۔ سینما بھی بہت کثرت سے جانے لگے ہیں بھوکے رہ جائیں گے ، لیکن سینما ضرور جائیں گے ۔ جس کے گھر میں جیسی تعلیم و تہذیب ہے اسی پردہ چل رہا ہے ۔

لیکن ماسٹر ابرار حسین صاحب کا بیان اس سے کچھ مختلف ہے ، ان کے بیان کے مطابق بری عادتیں نہیں پائی جاتیں ۔ لیکن پھر بھی ترقی کی طرف قدم اٹھانا نہیں چاہتے مسجدیں ان سے بھری ہوئی ملتی ہیں ، زکوٰۃ ، مہمان نوازی ، شادی بیاہ اور رسومات قبیحہ میں پیش پیش رہتے ہیں ۔ پیدا مغز لوگ رسومات قبیحہ کو چھوڑ رہے ہیں اور دوسرے اس لئے کہ ان کے پاس پیسہ نہیں رہا ہے ۔ نقیر پرستی اور پیر دوستی ہے لیکن علم پرستی نہیں ہے ۔ تعلیم کی حالت یہ ہے کہ گریجویٹ کوئی نہیں ، انڈر گریجویٹ ایک اور میٹرک ایک اور دو درجن کے درمیان ہیں ، لڑکوں میں بھی تعلیم کا شوق نہیں ہے اور لڑکیوں میں بالکل نہیں ہے ، مذہبی تعلیم میں حافظ قرآن بہت سے ہیں ۔ مولوی کی سند کسی نے نہیں لی ہے ۔

برادری کی ایک انجمن بھی ہے لیکن اس کو خاطر خواہ فروغ نہیں ہے ، انجمن کا نام جمعیۃ الانصار ہے ۔ جس کا آل انڈیا اور صوبے کی انجمن سے الحاق ہے ۔

روغن گروں میں بھی چودھریت کا نظام پایا جاتا ہے اور ویسا ہی ہے جیسا نوربافوں میں ہے ۔ روغن گروں میں دو چودھری ہیں ، چودھری محمد اسمٰعیل صاحب اور چودھری شادی صاحب محلہ ٹوپیا سرائے ۔

انڈر لکھے صاحب کے بیان کے مطابق مومن انصار میں جن میں نوربافت اور روغن گر دونوں شامل ہیں ، کنگھی بنانے کا کام بہت کثرت سے ہوتا ہے ، قریب قریب

پورا کام اسی برادری کے ہاتھ میں ہے اور کوئی دوسری قوم اس کام کو نہیں کرتی، میوہ فروشی باغات کی حفاظت و ٹھیکے کے کام۔ ٹھیلہ کی ڈھلائی اور پلّہ کے کام تقریباً ۹۰ فی صد ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ راج کے کام میں یہ لوگ ۵۰ فی صد ہیں۔ سبزی کے کام میں بھی بہت ہیں۔ غلّہ کی تجارت میں ایک عبدالسلام صاحب ہیں۔ آج اُن کی حیثیت دس پندرہ لاکھ روپے کی ہے۔ کپڑے کی تجارت میں دیہات سے گاڑھا کھدر لاتے ہیں۔ درزی کے کام میں بھی بہت ہیں۔ تقریباً ۵۰ فی صد درزی اسی برادری کے ہوتے ہیں۔ فیکٹریوں اور ملوں میں بھی بہت ہیں۔ ریلوے کیرج شاپ میں بھی مومن انصار کے افراد ہیں۔ چاول کو سیلا کرنے کا کام دھان کو کوٹنے کا کام بھی سب یہی لوگ کرتے ہیں، بھینسوں کے کام میں یعنی دودھ بیچنے کے کام میں بھی ہیں اور کاشت کے کام میں بھی ہیں، قصائیوں کے پیشہ میں تو صرف چند ایک ہوں گے، باقی ہر پیشہ اور ہر کام میں گھسے ہوئے ہیں۔ خانگی ملازمت بھی کثرت سے کرتے ہیں۔ خوش حال لوگوں کا کوئی گھر ایسا نہیں ملے گا جہاں ان کی عورتیں اور مرد کام کرتے ہوئے نہ ملیں۔

ماسٹر ایزد حسن کے بیان کے مطابق مومن انصار حسب ذیل کام کرتے ہیں:۔
میوہ فروشی، پارچہ فروشی، چوب فروشی، بیضہ فروشی، سبزی فروشی، ملازمت، حمالی، مزدوری، معماری، نجاری (بڑھئی کا کام) کارخانہ دار۔ (نقشین کام اور چاول کے) پارچہ بافی، روغن گری، تجارت، چاول، کھلی، دال سونٹھ بھنگ، مسالہ جات، خیاط۔ (درزی) فیکٹری میں بھی ملازم ہیں، پولیس اور فوج میں خال خال ہوں گے۔

کاروبار اوسط درجے کا کرتے ہیں۔

میوہ فروشی میں یہ لوگ پچاس فی صدی ہیں۔ آڑھت، ٹھیکیداری خوبچہ کا کام کرتے ہیں۔ آڑھت ہیں پھل باہر بھی بھیجتے ہیں، اور نیلام بھی کرتے ہیں۔ اس کام میں خاص طور

پر بہادری کے حسب ذیل لوگ ممتاز ہیں:-

۱۔ کلے خاں صاحب ٹھیکیدار ریلوے اسٹیشن و بازار

۲۔ نور محمد صاحب سبزی منڈی

۳۔ عبداللطیف محمد حسن صاحبان

پارچہ فروشی میں دیسی بدیسی سب کپڑا بیچتے ہیں۔ بڑی دوکان کوئی نہیں ہے۔ گلگٹ گنج میں دویم درجہ کی پانچ چھ دوکانیں ہیں، ان میں حاجی محمد شفیع صاحب بزاز بازار گلگٹ گنج ممتاز ہیں:-

چوب فروشی میں بھی دویم درجے کا کاروبار ہے، ان میں لائق ذکر کام نور محمد صاحب محلہ شاہ بہلول اور زندہ حسن صاحب محلہ شاہ بہلول کے ہیں، بیعنہ فروشی میں ممتاز لوگ یہ ہیں

(۱) عبدالمجید عبدالوحید (۲) محمد یوسف (۳) عبدالرحمٰن

سبزی فروش اور میوہ فروش:- عبدالرحمٰن، عبدالغنی

ملازمت:- (۱) ماسٹر ایزحسن صاحب اسلامیہ ہائی اسکول سہارنپور

۲۔ بابو بشیر احمد صاحب روڈز اینڈ بلڈنگس کلرک

کارخانہ دار:- (۱) عبدالوحید صاحب نقشین چوب کا کام محلہ منڈی (۲) محمد عمر یا محمد ابراہیم (۳) اللہ رکھا اینڈ سنز

چاول کے کاروبار میں:- (۱) عبدالسلام صاحب (۲) چودھری شادی، (۳) چودھری اسمٰعیل محمد ٹوپیا سرائے (۴) ابراہیم صاحب بھجڑی والا، نیا بانس یا تاگ اور چاول دونوں کا کام۔

پرچون کے کام میں:- محمد شفیع صاحب بازار شہید گنج

مندرجہ بالا لوگوں میں عبدالسلام صاحب کے علاوہ باقی اور سب لوگ

پانچ ہزار سے پچاس ہزار تک کی حیثیت کے ہیں۔

عبدالسلام صاحب کی پندرہ بیس لاکھ کی حیثیت ہے، ڈیڑھ لاکھ وار بانڈ میں دے چکے ہیں اور ایک لاکھ اور دینے والے ہیں۔ سہارنپور میں آڑھت کی آٹھ دس بڑی فرمیں ہیں، ان میں ایک عبدالسلام صاحب کی ہے۔ مسلمانوں کی اور کوئی پکی آڑھت کی فرم نہیں ہے آڑھت کے کام میں عبدالسلام صاحب کا نمبر تیسرا ہے۔ پہلا نمبر ایک مارواڑی فرم سیٹھ مامن چند رادھاکشن کا ہے، جن کی حیثیت پچاس لاکھ کی ہے۔ اس کے بعد ایک دوسری مارواڑی فرم سیٹھ شادی رام ادمی رام کا نمبر ہے، ان کی چھ سات منڈی کا میں ہیں مجموعی حیثیت ۳۰ لاکھ کی ہوگی۔ تنہا سہارنپور کی دوکان کو دیکھا جائے تو پانچ لاکھ کی حیثیت ہوگی، اور اس لحاظ سے عبدالسلام صاحب کا نمبر دوسرا ہو جائے گا، عبدالسلام صاحب گڑ، شکر، چاول، گیہوں، چنا سب چیزیں باہر بھیجتے ہیں۔ سہارنپور کا چاول کی وجہ سے بڑی منڈیوں میں شمار ہوتا ہے۔ عبدالسلام صاحب کو خاص شہرت چاول کی تجارت کے سلسلے میں ہے۔ مال کی فراہمی میں عبدالسلام صاحب کو بہت زیادہ سہولت ہے۔ یہ اگر چاہیں تو ہندو دوکان داروں کی فراہمی تک بند کر سکتے ہیں، کیونکہ چاول کے صاف کرنے اور سیلا کرنے کا کام ان کی برادری والے کرتے ہیں۔ عبدالسلام صاحب کو روپیہ پیسہ لینے کی بنکوں سے ضرورت نہیں ہوتی۔ اپنے ہی روپئے سے ہمیشہ کاروبار کرتے ہیں، نقد روپے کے لحاظ سے مسلمانوں میں سادھو، کمہار اور عبدالسلام صاحب بہت بڑی حیثیت کے لوگ ہیں۔ سکنائی جائداد بہت بڑی اُن کے پاس ہے۔

ان کا کاروبار گجرات کاٹھیاواڑ سے زیادہ ہے۔ یوپی اور پنجاب کے ہندو وں میں تو تعصب پایا جاتا ہے۔ وہ تو ایسا کر سکتے ہیں کہ اگر ہندو ۱۴ر آڑھت لے رہا ہے اور مسلمان ۱۲ار یا ۱۳ار تو وہ ہندو ہی کو ترجیح دیں گے۔ لیکن گجرات، کاٹھیاواڑ کے ہندوؤں میں یہ تنگ نظری نہیں ہے۔ اس لئے گجرات وغیرہ کی طرف یادو شنا ہو کے آگے)

ہندوؤں سے بھی کاروبار ہے۔ یو۔پی اور پنجاب میں صرف مسلمانوں سے ہے۔

سہارنپور میں اس قسم کے کاروبار میں جو دوسرے مسلمان لگے ہوئے ہیں۔ ان سب کی کچی آڑھت ہے، یعنی مقامی کاروبار ہے۔ مال باہر نہیں بھیجتے، بلکہ کاشتکاروں کا مال مقامی خریداروں کے ہاتھ فروخت کرتے رہتے ہیں۔ عبدالسلام صاحب کا کاروبار سو سال سے چل رہا ہے۔ ابتدا میں کچی آڑھت کا کام تھا۔ زیادہ ترقی دادا کے زمانے سے ہے۔ اصل ترقی حافظ عبدالرحمٰن صاحب کے زمانے سے ہوئی۔ انھوں نے پکی آڑھت کا کام شروع کیا۔ اس کام میں اُن کے بیٹے عبدالسلام نے مدد دی اور انھوں نے اس کام کو بیس گنا کر دیا، عبدالسلام اور عبدالقیوم دو بھائی ہیں۔ عبدالقیوم اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ عبدالسلام صاحب بالکل نوجوان ہیں۔ انھوں نے سہارنپور کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں میٹرک تک تعلیم پائی ہے، کھیل کا بہت شوق تھا۔ یہ میونسپل کمشنر بھی ہیں۔ بازار شہید گنج میں ان کی دوکان ہے۔

سہارنپور میں ایک مرچنٹس چیمبر موجود ہے۔ جس کے غلّہ کا سٹہ کرنے والے لوگ ممبر ہوتے ہیں۔ عبدالسلام صاحب کو اس کا ممبر بنانے کی بہت کوشش کی گئی لیکن وہ اس کے ممبر نہیں بنے۔ سٹہ چاول کا نہیں ہوتا، اور آج کل باقی اور دوسری چیزوں کا بھی سٹہ بند کرا دیا گیا ہے۔

مومن انصار برادری کے لوگ عام طور پر مزدور پیشہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی مالی حالت اور جماعتی حیثیت بھی اچھی نہیں ہے۔ مزدور کی حیثیت سے یہ لوگ بہت محنتی اور بے عذر ہوتے ہیں۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، جوان سب کام میں لگے رہتے ہیں۔ کسی کام کے کرنے میں اُن کو عذر نہیں ہوتا۔ اس برادری کے ترقی نہ کرنے کا بڑا سبب تعلیم نہ ہونا ہے۔ اب دولت اور آمدنی میں ترقی ہو رہی ہے لیکن اس کو ٹھکانے سے خرچ کرنے کا طریقہ نہیں معلوم ہے۔ چمکنے اور نمایاں ہونے کا موقع

انھیں نہیں ہے۔ نہ ان کے پاس سرکاری ملازمتیں ہیں، نہ قانون داں ہیں نہ ان میں حکام رسی ہے، برادری میں کوئی وکیل نہیں ہے۔ لکیر کے فقیر ہیں نئی بات کوئی نہیں پیدا کرتے۔

برادری کے لوگ مقروض کسی کے نہیں ہیں، اور نہ کسی کے پابند ہیں۔

نوربافت برادری میں حسب ذیل لوگوں کو ممتاز کہا جاسکتا ہے ۔

(۱) عبدالرزاق صاحب ٹیلر ماسٹر (۲) عبدالرحمٰن عبدالغنی تاجران میوہ (۳) حافظ عبدالکریم عبدالرحیم بساط خانہ (۴) حاجی عبدالکریم ٹیلر ماسٹر خان عالم پورہ، (۶) محمد شفیع صاحب پرچون کی دکان بازار شہید گنج (۷) ماسٹر غلام محمد صاحب جراب فروش ہرن ماراں (۸) عبدالشکور صاحب جراب ساز (ہوزری) ہرن ماراں (۹) عبدالکریم محمد اسحاق صاحبان ہوزری ہرن ماران (۱۰) حاجی محمد اسمٰعیل حبیب احمد صاحب سوداگران پرچونی بازار لوہانی سرائے ان کی شاخ منصوری میں بھی ہے (۱۱) عبدالحفیظ عبدالرزاق صاحب پرچونی اور کپڑے کا کاروبار لوہانی سرائے۔

روغن گر برادری میں حسب ذیل لوگ ممتاز ہیں:-

(۱) عبدالسلام صاحب تاجر چاول و میونسپل کمشنر (۲) محمد ابراہیم صاحب بھجڑی والا باغات اور کھیتی باڑی باغبانی و کاشتکاری (۳) چودھری محمد اسمٰعیل صاحب چاول کا کاروبار (۴) چودھری شادی صاحب چاول کا کاروبار (۵) حافظ سلطان احمد صاحب تیل، کھل اور گھی کا کاروبار کچی آڑھت۔

نوٹ :- عبدالسلام صاحب کے علاوہ باقی مندرجہ بالا سب لوگوں کی حیثیت پانچ ہزار اور پچاس ہزار کے درمیان سمجھنا چاہیے۔

ادارۂ تعلیم و ترقی کی کتابیں